اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

ماہنامہ

الغوث

تجلیات سیرت

انوار سیرت

سیرت اور ٹیکنالوجی

سیرت اور نوجوان

سیرت اور معاشرہ

سیرت اور امن عالم

سیرت اور خواتین

سیرت اور روحانیت

ربیع الاول ۱۴۴۸ھ / اگست ۲۰۲۶ء

سیرت نمبر

مدیر اعلیٰ

مفتی سید شہباز اصدق غوثی

ناشر

خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

ماہنامہ

الغوث

جلد:۱، شمارہ:۸۔ ربیع الاول ۱۴۴۸ھ / اگست ۲۰۲۶

سیرت نمبر

کا خصوصی شمارہ

بظل فیض: عزیز الاولیاء حضرت مولانا سید شاہ شبیر اصدق غوثی شہودی رحمہ اللہ

بظل عاطفت: وارث مسند غوثیہ حضرت سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی چشتی قادری صاحب قبلہ

رفقائے ادارہ

حضرت علامہ سید محمد علیم الدین اصدق مصباحی صاحب (ساؤتھ افریقہ)

حضرت علامہ افتخار احمد قادری مدنی صاحب (مدینہ منورہ)

حضرت پروفیسر سید شہما نجیب گیلانی صاحب (انڈیا)

مجلس مشاورت

حافظ افسر علی نقشبندی (مبارکپور)

مولانا تبارک حسین امجدی (نیپال)

مولانا ڈاکٹر نبیل احمد غزالی (ترکی)

مفتی سبحان رضا امجدی (حیدر آباد)

گزارش: احباب سالانہ **500 روپے** کی ممبری فیس قبول فرما کر اس علمی مہم کا حصہ بنیں۔

ناشر: خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرف انتساب

سیرت طیبہ کا یہ گلدستۂ عقیدت و محبت اپنی مخدومہ، والدہ ماجدہ کی بارگاہ میں نذر ہے، جنہوں نے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد، ہماری کم سنی ہی میں نہایت صبر و استقامت کے ساتھ ہم بھائی بہنوں کی ایسی تربیت فرمائی کہ ہمیں والد گرامی کی شفقت، سرپرستی اور رہنمائی کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ آپ نے نامساعد حالات اور سخت آزمائشوں کے باوجود ہمیں علم دین کے زیور سے آراستہ فرمایا اور خدمت اسلام کی راہ پر گامزن کیا۔ آج دین متین کی جو معمولی سی خدمت بھی ہم سے انجام پا رہی ہے، وہ آپ ہی کے خلوص بے پایاں، شبانہ روز دعاؤں اور قربانیوں کی مرہون منت ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے سایۂ شفقت کو ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم و دائم رکھے اور اس گلدستۂ سیرت کو آپ کے لیے توشۂ آخرت، ذخیرۂ حسنات اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں ذریعۂ شفاعت بنائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا﴾

سید شہباز اصدق

اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

ماہنامہ

الغوث

ہدیہ قارئین

احباب ماہنامہ حاصل کرنے کے لیے درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں، یا ہمارے فیس بک پیج سے براہِ راست پی ڈی ایف (PDF) ڈاؤن لوڈ کریں۔

رابطہ نمبر:09097467826/09661300865

فیس بک: Al-Ghaus Monthly Magazine

Mufti Sayed Shahbaz Asdaque Official Blog

سے بھی PDF فائیل Download کی جاسکتی ہے۔

جزاکم اللہ خیرا جزا

نوٹ : اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے ادارہ اور ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

تزئین وترتیب

الحمد گرافکس

فہرست سیرت نمبر

نمبر شمار	مضامین	مقالہ نگار	صفحہ
	نعت مصطفی ﷺ		
1	واحسن منک لم ترقط عینی	سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ	9
2	بلغ العلی بکمالہ	حضرت شیخ سعدی شیرازی رضی اللہ عنہ	10
3	محمد آبروئے موماناں ہیں	حضرت احسن العلماء رحمہ اللہ	11
4	ملتا ہے تیرے در سے زمانے کو فیض عام	حضرت شیخ اعظم رحمہ اللہ	12
5	بڑھ کے ہر عید سے ہے عید ولادت تیری	حضرت تاجدار اہل سنت رحمہ اللہ	13
6	یہ جو مہر میں ہیں حرارتیں، وہ تیرا ظہور جلال ہے	حضرت سید محمد اشرف برکاتی مارہروی	14
	پیش لفظ		
7	نوائے دل	حضرت سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی	15
	تاثرات از علما و مشائخ		
8	کلمات خیر	علامہ سید علیم الدین اصدق مصباحی (ساؤتھ افریقہ)	22
9	کلمات خیر	علامہ افتخار احمد قادری (مدینہ منورہ)	24
10	منظوم تاثر	علامہ عبد المجید نوری صاحب (ساؤتھ افریقہ)	26
11	کلمات خیر	مفتی فیضان المصطفی قادری (امام اعظم ابو حنیفہ لکھنؤ)	27
12	کلمات خیر	علامہ محمد رمضان حیدر قادری فردوسی (جھارکھنڈ)	29
13	کلمات خیر	علامہ ارشد مصباحی (انگلینڈ)	33
14	کلمات خیر	علامہ طارق انور مصباحی (کلکتہ)	34
15	کلمات خیر	علامہ شاہ فیصل خان قادری (ساؤتھ افریقہ)	36
16	منظوم تاثر	مفتی محمد وقار احمد نوری (کرناٹک)	38
	انوارِ سیرت		
17	رسول اللہ ﷺ کی متابعت	مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رضی اللہ عنہ	40

18	ذات الٰہی کے مظہر کامل	قطب عالم سیدنا خواجہ قیام اصدق رضی اللہ عنہ	44
19	حضور پُر نور سید الاولین والآخرین	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری رضی اللہ عنہ	48
	تجلیات سیرت		
20	رسالت محمدی کا عقلی ثبوت	قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ	65
21	دنیا و آخرت میں حضور کی سیادت	تاج الشریعہ علامہ اختر رضا خاں قادری رحمۃ اللہ علیہ	77
22	پیغمبر خدا قانون داں بھی قانون ساز بھی	شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ	80
23	مولود میں ماتم	بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی رحمۃ اللہ علیہ	92
24	اختیارات مصطفیٰ ﷺ	حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری	97
25	معراج مصطفیٰ ﷺ	حضرت مفکر اسلام علامہ قمر الزماں خاں اعظمی	102
26	وصیت آدم، دعائے خلیل، بشارت عیسیٰ	حضرت شیخ الحدیث علامہ افتخار احمد قادری	108
	سیرت اور امن عالم		
27	پیغمبر امن کی سیرت: عالمی امن کا ابدی چارٹر	ادارہ	118
	سیرت اور روحانیت		
28	سیرت مصطفیٰ: ولادت سے وصال تک ایک نظر میں	مولانا محمد عارف رضا اشفاقی (ہریانہ)	161
29	سیرت نبوی اور مکارم اخلاق	مولانا عبد الرحمٰن مصباحی (گھوسی)	169
30	اخلاق کریمانہ: انسانیت کے لیے کامل نمونہ	مولانا غیاث الدین احمد عارف مصباحی (مہراج گنج)	172
31	تزکیۂ نفس اور تعلیمات نبوی	مفتی محمد انوار عالم مصباحی (الہ آباد)	203
	سیرت اور ٹیکنالوجی		
32	مصنوعی ذہانت اور سیرت رسول کی اخلاقی تعلیمات	ڈاکٹر مفتی خالد ایوب مصباحی شیرانی	209
33	ڈیجیٹل شہرت کا فتنہ اور سیرت نبوی ﷺ	مفتی محمد عباس ازہری مصباحی (بستی)	219
34	آن لائن پرائیویسی اور اسلامی اقدار	عالمہ عافیہ عمران	241
35	ڈیجیٹل دور میں مسلم لڑکیوں کی کردار سازی	عالمہ شاہین امجدی	244

سیرت اور معاشرہ

36	اکیسویں صدی میں سیرت نبوی ﷺ کی معنویت	مولانا ڈاکٹر محمد عرفان محی الدین قادری (حیدرآباد)	248
37	انسانی حقوق اور نبوی تعلیمات	مفتی محمد جنید مصباحی (کانپور)	262
38	سیرت النبی ﷺ اور رازداری کی اہمیت	مفتی غلام مصطفیٰ نعیمی (نینی تال)	268
39	ہجری مصطفیٰ ﷺ کا مذہبی وسیاسی پہلو	مفتی محمد فیضان سرور مصباحی (اورنگ آباد)	279
40	پیغمبر اسلام ﷺ بحیثیت ایک ماہر تجارت	مفتی فہیم احمد ثقلینی ازہری (بدایوں)	286
41	عدم برداشت کا بین الاقوامی رجحان اور تعلیمات نبوی	مولانا عقیل اشہر (بیگوسرائے)	303
42	ماحولیاتی تحفظ اور اسلامی تعلیمات	نبیل احمد غزالی (ترکی)	306
43	مصروفیت کے دور میں نبوی طرز زندگی	نبیل احمد غزالی (ترکی)	311
44	غربت کے خاتمے کا نبوی ماڈل	مفتی محمد مبارک حسین ازہری بریلوی (بریلی)	314
45	سیرت نبوی اور معروضی پیشہ ورانہ مہارت	ڈاکٹر محمد کاشف رضا خان (گیا)	323
46	رزق حلال کی اہمیت ارشادات نبوی کی روشنی میں	مولانا ارشد رضا مدنی (لکھنؤ)	329
47	حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں وقت کی قدر وقیمت	مولانا محمد صادق الاسلام علیمی (مغربی بنگال)	334

سیرت اور نوجوان

48	ابتدائی، ثانوی اور گریجویٹ طلبہ کے لیے سیرت نویسی کے مناہج: ایک نظریاتی مطالعہ	ڈاکٹر مولانا محمد جیلانی مصباحی	339
49	تعلیم وتربیت کا نبوی منہج اور جدید تعلیمی چیلنجز	مولانا محمد ناصر رضا امجدی (ناسک، مہاراشٹر)	367
50	نوجوانوں کے مسائل اور ان کا نبوی حل	حافظ افتخار احمد قادری برکاتی (پیلی بھیت)	373
51	دوستوں کے انتخاب میں سیرت نبوی ﷺ	حافظ افتخار احمد قادری برکاتی (پیلی بھیت)	382
52	خود اعتمادی سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں	حافظ افتخار احمد قادری برکاتی (پیلی بھیت)	395
53	دنیوی کامیابی کے نبوی اصول	مولانا سبحان رضا امجدی (حیدرآباد)	406

سیرت اور خاندان

54	والدین کی خدمت: قرآن وسنت کی روشنی میں	مولانا محمد فداء المصطفیٰ قدری (کیرلا)	416
55	زوجین کے باہمی حقوق: تعلیمات نبوی کی روشنی میں	مولانا غلام محی الدین وانی علیمی (اڈیشہ)	425
56	بچوں کی تربیت کا نبوی منہج	مولانا انیس الرحمٰن حنفی رضوی (مراد آباد)	432

سیرت اور خواتین

57	سیرت مصطفیٰ ﷺ اور ہماری مسلم بچیاں	مولانا محسن ضیائی (پونے)	441
58	دعوت و تبلیغ میں امہات المومنین کا کردار	بنت سید (ساؤتھ افریقہ)	449
59	حضور اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی	سیدہ غوثی (سہسرام)	458
60	تعدد ازدواج مصطفی ﷺ کی حکمتیں	مفتی سید شہباز اصدق	467
61	شرف نظر	ادارہ	485

وأَحسنُ منكَ لم ترَ قطُّ عيني
وَأجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النّسَاءُ

رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے ہرگز نہیں دیکھا اور آپ ﷺ سے زیادہ حسین کسی عورت نے جنا ہی نہیں۔

خلقتَ مبرأً منْ كلّ عيبٍ
كأنكَ قدْ خلقتَ كما تشاءُ

آپ ﷺ ہر عیب سے پاک وصاف پیدا کئے گئے گویا کہ آپ ﷺ اس طرح پیدا کیے گئے جیسا کہ آپ ﷺ نے چاہا۔

صحابی رسول سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ

نعت مصطفی ﷺ

نعت

بَلَغَ العُلٰی بِکَمَالِہٖ

کشفَ الدُجیٰ بجمالہٖ

آپ ﷺ اپنے کمال سے بلندیوں پہ پہنچے

آپ ﷺ کے حسنِ جمال سے (جہالت اور گمراہی کی) تاریکیاں دور ہو گئیں۔

حَسُنَتْ جَمِیعُ خِصَالِہٖ

صَلُّوا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

آپ کی سبھی عادات مبارکہ اور سنتیں بہت پیاری ہیں

آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر سلام ہو

حضرت شیخ سعدی شیرازی رضی اللہ عنہ

نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

احسن العلماء حضرت سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں قادری مارہروی رحمہ اللہ

محمد آبروئے مومناں ہیں
محمد بادشاہِ مرسلاں ہیں

محمد شرحِ آیاتِ الٰہی
کتابِ رطب و یابس کا بیاں ہیں

خدا کی عظمت و قدرت کے جلوے
رخِ پُر نور سے ان کے عیاں ہیں

خدا نے عرش پر جن کو بلایا
یہی تو وہ معزّز میہماں ہیں

ہے پیدائش انہیں کی اصلِ عالَم
یہی بیشک بِنائے این و آں ہیں

انہیں کے دم سے ہے ساری خدائی
یہی تو رونقِ بزمِ جہاں ہیں

جو سنگریزے حضوری میں ہیں حاضر
وہ رشکِ لعل و یاقوتِ جناں ہیں

محب ان کا چہیتا ہے خدا کا
یہ محبوبِ خدائے دوجہاں ہیں

حسن سن ! ہاتفِ غیبی پکارا!!!
بہ فضلِ رب وہ تجھ پر مہرباں ہیں

نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

نعت

شیخ اعظم حضرت علامہ سید شاہ اظہار اشرف اشرفی الجیلانی رحمہ اللہ

ملتا ہے تیرے در سے زمانے کو فیضِ عام
دنیا کے بادشہ بھی اسی در کے ہیں غلام

تیرا غلام وہ کہ جو شاہوں کو بھیک دے
نسبت نے دے دیا ہے بلندی کا وہ مقام

دیکھیں گے حشر میں تری وہ شان پر جمال
بے شک کرم بنائے گا امت کو شاد کام

وہ دل کہ جس پہ ہو گئے قربان کتنے دل
جس دل میں ہو گیا ہے ترے عشق کا قیام

وہ مے کہ جس نے بخشی ہے ایماں کو تازگی
صدقے میں اہل بیت کے مل جائے ایک جام

عشاق بارگاہِ نبی کے ہیں بے مثال
یادِ رسول میں جو گزارے ہیں صبح و شام

قربان جو ہوا ہے ترے نامِ پاک پر
ملتی ہے ایسی موت کو پھر زندگی دوام

سرکار کے طفیل سے روشن ہے کل جہاں
جلوہ رسولِ پاک کا ہے جلوۂ مدام

ہیں کتنے خوش نصیب ثنا خوانِ مصطفیٰ
آجائے کاش تیرا بھی "اظہار" ان میں نام

نعت

نعت مصطفی ﷺ

تاجدارِ اہلِ سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری بدایونی رحمہ اللہ

آنکھ والوں کو نظر آئے گی صورت ان کی
دیدۂ کور میں رہ جائے گی حسرت ان کی

کلمہ پڑھتے ہیں حجر وہ ہے نبوت ان کی
سجدہ کرتے ہیں شجر ایسی ہے عظمت ان کی

ان کے خادم ہیں ملک واہ رے شوکت ان کی
اوندھے منہ گر گئے بت چھا گئی ہیبت ان کی

جو ہے صدیق میں وہ سب ہے صداقت ان کی
اور فاروق نے پائی ہے عدالت ان کی

دیکھی عثمان میں دنیا نے سخاوت ان کی
ذات حیدر سے نمایاں ہے شجاعت ان کب

ان کی فرقت میں جو موتی مری آنکھوں سے گرے
کون دنیا میں لگا سکتا ہے قیمت ان کی

ہے یہ جلوت کہ ہیں اقصیٰ میں رسولوں کے امام
وہ ہیں اور رب ہے سرِ عرش ہے خلوت ان کی

ان کے صدقہ میں بنے ارض و سما کون و مکاں
وجہ تخلیق جہاں بن گئی خلقت ان کی

ہیں وہی ظلِّ خدا، شانِ خدا، نورِ خدا
یاد آتا ہے خدا دیکھ کے صورت ان کی

نفسی نفسی جہاں ہر ایک کے لب پر ہوگا
کام آئے گی وہاں صرف شفاعت ان کی

چاند سورج کی اطاعت پہ یہ حیرت کیا ہے
یہ بتاؤ نہیں کس شے پہ حکومت ان کی

اس کے صدقے میں ملیں دنیا کو دو دو عیدیں
بڑھ کے ہر عید سے ہے عیدِ ولادت ان کی

عرصۂ حشر میں لہرائے گا ان کا جھنڈا
لوگ دیکھیں گے قیامت میں وجاہت ان کی

سر سے تا ناف حسن، ناف سے تا پیر حسین
ان کے شہزادوں نے پائی ہے شباہت ان کی

شاہ بغداد ہمارے ہیں کفیل و والی
ہم کو دارین میں کافی ہے کفالت ان کی

کل بھی تھی آج بھی خواجہ کی حکومت ہے یہاں
اور تا حشر رہے گی یہ حکومت ان کی

کیوں نہ ہم قادری دولہا پہ ہوں قرباں سالم
جن کی صورت میں نظر آتی ہے صورت ان کی

نعت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم

شہزادۂ احسن العلماء حضرت سید محمد اشرف برکاتی مارہروی حفظہ اللہ

یہ جو مہر میں ہیں حرارتیں، وہ ترا ظہورِ جلال ہے
یہ جو کہکشاں میں ہے روشنی، وہ ترا غبارِ جمال ہے

وہاں فاصلوں کی زیادتی سے عنایتوں میں کمی نہیں
کوئی دور رہ کے اویسؓ ہے، کوئی پاس رہ کے بلالؓ ہے

رواں ندیاں، رمِ آہواں، زمیں آسماں، نہیں سب جہاں
تری رحمتوں کے طفیل ہیں کہ زوال جن کا محال ہے

ترا روضہ ہے مرے سامنے مگر اپنی شکل دکھاؤں کیا
یہ میں کس مقام پہ آگیا کہ نہ ہجر ہے نہ وصال ہے

جو عطا پہ روز خطا کرے، جو خطا پہ روز عطا کرے
ترے پاس میری مثال ہے، مرے پاس تیری مثال ہے

دلِ عاشقاں جو نڈھال ہیں، ذرا آپ ان کی سنبھال لیں
یہ کسی کے بوتے کی شے نہیں کہ یہ آپ ہی کا تومال ہے

وہ خدا کے نور کو دیکھ کر بھی زمین والوں میں آگئے
سرِ عرش جانا کمال تھا کہ وہاں سے آنا کمال ہے

ذرا سِدرہ والے سے پوچھنا کہ مقامِ مصطفوی ہے کیا
جہاں جبرئیل کے پر جلیں، وہ مقام ایسی مثال ہے

رہِ حق میں سردیا، جان دی مگر اپنا ہاتھ نہیں دیا
جو حسین ابن علی نے دی، کیا جہاں میں ایسی مثال ہے

مری آرزوئیں بڑھی ہوئیں کہ مدینے جاکے قیام ہو
مرے حوصلوں کا شمار کیا، تری رحمتوں سے سوال ہے

ترے در تلک بھی میں آگیا، ابھی زندہ ہوں کہ ہوں بے حیا
مگر اپنی جان کا کیا کروں، مری جان مجھ پہ وبال ہے

میں حدودِ طیبہ تک آگیا، ترے در تلک نہیں آؤنگا
ترے سامنے میرا احال ہے، مرے سامنے یہ سوال ہے

تری یاد دل میں محیط ہے، مجھے اور سمت پتہ نہیں
نہ تو شرق ہے، نہ تو غرب ہے، نہ جنوب ہے، نہ شمال ہے

میں تمہارے نام کی نسبتوں کے سہارے دنیا میں جی گیا
مگر اپنی شکل دکھاواب، مری عاقبت کا سوال ہے

ارے زار اشرفِؔ ناتواں، کہاں نعت، تیرا بیاں کہاں
ترا حق تھا تو نے اٹھالیا، یہ رضاؔ کے توشے کا مال ہے

نوائے دل

از: شیخ طریقت حضرت سید شاہ عارفین اصدق غوثی صاحب قبلہ

پہلی وحی کے نزول کے بعد رسول مکرم ﷺ نے کوہ صفا کی چوٹی سے خدائی پیغام کا اعلان فرمایا۔ پیغام حق کے ابلاغ کے لیے کوہ صفا کا انتخاب کوئی امر اتفاقی نہیں تھا، بلکہ اس لیے کیا گیا کہ مکی معاشرے میں کوہ صفا ایک ایسا مؤثر ذریعہ ابلاغ تھا جس کی صدا کو اہل مکہ برضا و رغبت سنتے، اور بغیر تأمل اس کے دامن میں کھنچے چلے آتے۔ اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے آغاز دعوت ہی میں اُس عہد کے سب سے مؤثر ذریعۂ ابلاغ کو اپنا کر، دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ یہ اس بات پر روشن دلیل ہے کہ دعوت حق کے ارسال و ترسیل کے ہر عہد کے مؤثر ترین طریقے کو اختیار کرنا دین اسلام کی نظر میں مطلوب و محمود ہے۔

آج ٹیکنالوجی کا عہد ہے۔ ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقی نے دنیا کو ایک گلوبل ویلیج میں تبدیل کر دیا ہے۔ تمام سہولیات اور عوامی تعلقات سے دور، گھر کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا انسان اکناف عالم میں رونما ہونے والے تمام حالات و واقعات کی خبر بھی رکھ سکتا ہے اور اپنا پیغام بھی دنیا کے کونے کونے میں پہنچا سکتا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ نے علم و تحقیق کے نئے نئے دریچے کھولے ہیں، فکر و فن کی نئی راہیں تلاش کی ہیں، اور ارسال و ترسیل و تبلیغ و ترویج کے میدانوں کو نیا بانکپن اور وسعت عطا کی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا کہ

جدید ذرائع ابلاغ کے نقصانات بھی ہیں جن سے انسانی معاشرہ محفوظ نہیں۔ یہ نقصانات علمی بھی ہیں، فکری بھی، انسانی بھی ہیں اور معاشرتی بھی، اخلاقی بھی ہیں اور روحانی بھی، دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ باطل عقائد و نظریات کے حامل انہی پلیٹ فارمز سے دین و مذہب اور ایمان و عقائد کے خلاف مواد نشر کر کے لوگوں کے عقائد و ایمان کو متزلزل کرنے میں سرگرم ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ انہی پلیٹ فارمز کو دین وملت، مذہب و مسلک کی صحیح رہنمائی اور احقاق حق و ابطال باطل کے لیے مثبت طور پر استعمال کیا جائے۔

اور بحمدہ تعالیٰ، سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اہل علم اس سمت اپنی خدمات کا چراغ روشن کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ ڈیجیٹل ماہنامہ الغوث اور اس کا یہ سیرت نمبر بھی اسی کوشش کی ایک مبارک کڑی ہے۔

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں

رسول اکرم ﷺ سارے عالم کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت تمام مخلوق خدا کو محیط ہے۔ آپ ﷺ کی رسالت عامہ کی تصدیق قرآن مجید کی یہ مبارک آیت کر رہی ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾(1)

اور اے محبوب ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہوئی صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی ملاحظہ کیجیے:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہ دی گئیں۔ (1) ایک ماہ کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی گئی۔ (2) تمام زمین میرے لیے مسجد اور پاک کی گئی کہ جہاں میرے اُمتی کو نماز کا وقت ہو نماز پڑھے۔ (3) میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئیں جو کہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھیں۔ (4) مجھے مرتبۂ شفاعت عطا کیا گیا

(5)انبیاءِ کرام علیہم السلام خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا گیا۔(2)

معلوم ہوا کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالم گیر ہے اس رسالت کے حصار میں عربی بھی ہیں اور عجم بھی، گورے بھی ہیں اور کالے بھی، اگلے بھی ہیں اور پچھلے بھی۔ حضور کی رسالت سب کو عام ہے۔ حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے رسول ہیں اور اگلے پچھلے سب حضور کے امتی ہیں، یہاں تک کہ ابو البشر حضرت آدم سے لے کر روح اللہ حضرت عیسی علیہ السلام تک تمام انبیا و مرسلین آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لوائے رسالت کے تلے جمع ہیں اور آپ امام الانبیاء وسید المرسلین کے جلیل القدر منصب پر فائز ہیں۔

ملکِ کونین میں انبیا تاجدار
تاجداروں کا آقا ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم

چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ابدی اور عالمگیر ہے، اس لیے اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو اسوۂ حسنہ بنا کر اس عالم آب و گل میں مبعوث فرمایا تاکہ آپ کی سیرت طیبہ ہر دور اور ہر عہد کے مسائل و چیلنجز کے لیے مشعل راہ بنی رہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(3)

ترجمہ: بے شک تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

لاریب سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا عالمگیر اور کامل اسوہ ہے، جس سے قیامت تک کا انسان اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں کامل رہنمائی اور روشنی پا سکتا ہے۔

آج کا دور ٹیکنالوجی اور سائنس کی حیرت انگریز ترقی کا دور ہے، وہ انسان جو کبھی محض پیادہ یا گھوڑ سوار تھا، آج خلاؤں کو تسخیر کرتے ہوئے فلک بوس بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔ لیکن اہل ایمان کے لیے مقام مسرت یہ ہے کہ دور حاضر کی جدید سائنسی ترقی کی خبر بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب حیات میں موجود ہے۔ لیجیے صرف ایک حدیث المستدرک للحاکم سے ملاحظہ کیجیے:

سیدنا عبد اللہ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿سیکون فی آخر امتی رجال یرکبون علی المیاثر بدل السروج العظام﴾(4)

یعنی: میری امت کے دور آخر میں لوگ گوشت پوست اور ہڈیوں کے جانور کی بجائے دوسری سواریوں پر سفر کریں گے۔

اس حدیث میں مکینکل ٹیکنالوجی اور جدید آلات کی جانب واضح اشارہ موجود ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ ہر دور کے ہر طبقۂ انسانی کے لیے کامل ترین نصاب زندگی ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ اہل علم و دانش سیرت طیبہ کے انوار کی روشنی میں عصر حاضر کے ڈیجیٹل، سائنسی اور اجتماعی مسائل کا حل پیش کریں۔ تا کہ ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل دنیا کے اس گھوارے میں گھری ہوئی انسانیت، اپنی اسلامی تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے جدید علوم سے مستفید ہو سکے اور دنیا کی صف اول کی قوموں میں اپنا وقار قائم کر سکے۔

برادر اصغر مفتی سید شہباز اصدق غوثی صاحب زادت معالیہ (صدر شعبۂ افتاء دارالعلوم قادریہ غریب نواز، ساؤتھ افریقہ۔ و مدیر اعلیٰ ماہنامہ الغوث) ہزار ہدیۂ تبریک و تہنیت کے مستحق ہیں جن کی کاوش سے ماہنامہ الغوث کو میلاد النبی ﷺ کے پر بہار موقع پر یہ "سیرت نمبر" شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ خصوصی شمارہ اس لحاظ سے انتہائی منفرد اور عظیم الشان ہے کہ اس کا مرکزی عنوان" سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں عصر حاضر کے فکری و معاشرتی مسائل و چیلنجز کا حل" ہے۔ یہ موضوع وقت کی اہم ترین ضرورت اور دور حاضر کا تقاضا ہے۔

یہ شمارہ چار ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب: جلیل القدر علما و مشائخ عظام کے گراں قدر تاثرات پر مبنی ہے۔

دوسرا باب: بطور تبرک اکابرین و اسلاف کے علمی و فکری نقوش کا آئینہ دار ہے، جسے مزید دو ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

- حصہ اول: عظمت مصطفی ﷺ اور شان رسالت سے متعلق بزرگوں کی برکت آفریں تحریریں شامل اشاعت ہیں۔
- حصہ دوم: ملت اسلامیہ ہند کے ان عظیم اکابرین کے قلمی جواہر پاروں پر مشتمل ہے جو قوم و ملت کی قیادت و سیادت کا حق ادا کر کے جوار رحمت میں پہنچ چکے ہیں، یا وہ شخصیات جن کا علمی فیضان ہنوز جاری و ساری ہے۔

تیسرا باب: یہاں سے شمارے کے مرکزی موضوع کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، جسے درج ذیل آٹھ اہم موضوعات میں ترتیب دیا گیا ہے:

- سیرت اور امن عالم
- سیرت اور روحانیت
- سیرت اور ٹیکنالوجی
- سیرت اور معاشرہ
- سیرت اور نوجوان
- سیرت اور خاندان
- سیرت اور خواتین

مذکورہ بالا عناوین کے تحت بتیس (32) اہم علمی، فکری، اصلاحی اور روحانی مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر مضامین کا تعلق جدید دور کے درپیش مسائل اور چیلنجز سے ہے۔ جس کی وجہ سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ محض ایک روایتی شمارہ نہیں، بلکہ سیرت طیبہ کی روشنی میں جدید دور کے مسائل کے حل تلاش کرنے کی ایک تحسین آمیز اور سعادت مندانہ کوشش ہے۔

یہ شمارہ اس اعتبار سے بھی نہایت قابل قدر ہے کہ اس کے اکثر مقالات ان مقتدر علما، محققین اور ارباب فکر و نظر کے قلم سے منصۂ شہود پر آئے ہیں جو علمی دنیامیں معتبر و مستند حیثیت رکھتے ہیں۔ ان بابرکت شخصیات کی نگارشات اس شمارے کی قبولیت اور کامیابی کی روشن سند ہیں۔ قوی امید ہے کہ یہ مقالے قارئین کے لیے بیش قیمت ثابت ہوں گے اور امت مسلمہ کے لیے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ بنیں گے۔

اب ہم اپنے تمام مقالہ نگار حضرات کی خدمت میں تہِ دل سے ہدیۂ امتنان و تشکر پیش کرتے ہیں، جن کے گراں قدر علمی تعاون سے ماہنامہ "الغوث" کو یہ خصوصی "سیرت نمبر" قارئین کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اپنے ان تمام علما اور مشائخ کے بھی تہہِ دل سے ممنون و شکر گزار ہیں جن کے گراں قدر تاثرات اور کلمات خیر نے اس ماہنامہ کی قدر و قیمت اور وقار کو دوبالا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کرم فرماؤں کو جزائے خیر سے نوازے۔ محترم ڈاکٹر نبیل احمد غزالی (ترکی) بھی خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے نہ صرف خود دواہم مضمون تحریر فرمایا بلکہ اپنے احباب سے بھی مقالات مرتب کروائے۔ حافظ افتخار احمد برکاتی بھی

خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف اس ماہنامہ کے مستقل قلمکار بھی ہیں اور اپنی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس نمبر کی تصحیح اور پروف ریڈنگ کا کام توجہ اور باریک بینی سے کیا گیا ہے، پھر بھی اگر کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم درگزر فرمائیں اور ہمیں ضرور آگاہ کریں تاکہ اصل متن میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔ ہم آپ کے بے حد ممنون رہیں گے۔

مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہے کہ یہ ماہنامہ رواں سال جنوری سے جاری ہوا، اور بفضلہ تعالیٰ محض سات ماہ کے مختصر عرصے میں قوم کو سیرت نبوی ﷺ کے عظیم الشان عنوان پر یہ یادگار "سیرت نمبر" پیش کرنے میں کامیاب رہا — جس پر میں بارگاہ الٰہی میں سجدۂ شکر بجالاتا ہوں۔

اس علمی و تحریری کامیابی کا سہرا بلاریب نبیرۂ غوث ثانی حضرت مفتی سید شہباز اصدق (حفظہ اللہ) کی مجاہدانہ کاوشوں کے سر ہے، جنہوں نے افتاء اور درس و تدریس کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کارِ عظیم کا بیڑا اٹھایا۔ موصوف نے جولائی کا شمارہ شائع کرنے کے فوراً بعد "سیرت نمبر" کی تیاری شروع کر دی، اور مقتدر علما و محققین سے رابطہ قائم کر کے مضامین حاصل کیے۔ بالآخر محض ایک ماہ کے مختصر ترین عرصے میں اپنی انتھک کاوشوں اور جذبۂ صادق کے نتیجے میں اس علمی ارمغان کو قارئین کی نذر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

موصوف میرے لفظی شکریہ سے بالاتر ہیں کہ دین متین کی ترویج و اشاعت میں شب و روز مصروف رہ کر اپنے آبا و اجداد کے علمی و دینی مشن کو عام کر رہے ہیں اور اپنے اکابرین کے حقیقی جانشین ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں تاہم رب قدیر کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے ان کا اقبال بلند فرمائے، انہیں آسمان علم و فضل پر سدا درخشاں رکھے، اس شمارے کو مقبول بارگاہ فرمائے اور تمام معاونین کو دارین کی برکات و جزائے خیر سے نوازے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

حوالہ: (1) سورۃ سبا، آیت 28۔ (2) بخاری، کتاب التیمم، باب التیمم، ۱ /۱۳۳، الحدیث :۳۳۵۔ (3) سورۃ الاحزاب، آیت 21۔ (4) المستدرک۔

تاثرات

علما و مشائخ

آپ کے تاثرات

شیخ العلما حضرت علامہ سید محمد علیم الدین اصدق غوثی مصباحی صاحب مدظلہ العالی (ساؤتھ افریقہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی سیرت طیبہ وہ مشعل راہ ہے جس کی روشنی ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی اور فلاح کی ضامن رہی ہے۔ سرور کونین ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو عام کرنا اور آپ کی حیات مبارکہ و تعلیمات کے روشن گوشوں کو اجاگر کرنا عظیم ترین سعادت اور وقت کی اہم ترین دینی ضرورت ہے۔

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ہماری خانقاہ غوثیہ اصدقیہ سہسرام کا Organ ماہنامہ الغوث اپنا خصوصی "سیرت نمبر" شائع کر رہا ہے۔ دورِ حاضر میں، جہاں مادیت اور اخلاقی زوال کے اثرات عام ہیں، ایسے بابرکت و علمی شماروں کی اشاعت نہ صرف دلوں میں حبِ رسول ﷺ کی شمع روشن کرتی ہے بلکہ نسلِ نو کی صحیح دینی و اخلاقی تربیت کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔

اس نمبر کے عناوین نظر نواز ہوئے، نہایت مسرت ہوئی کہ اہم فکری اور عصری موضوعات پر یہ نمبر مشتمل ہے۔ موجودہ دور میں سیرتِ طیبہ کے روشن پہلوؤں کو جدید اسلوب میں مرتب کرنا اور نبوی تعلیمات کی روشنی میں عصری مسائل و چیلنجز کا حل پیش کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ سیرت نمبر قابل قدر ہونے کے ساتھ ساتھ ارباب علم و دانش کو اس سمت سیرت کی روشنی میں علم و تحقیق کی قندیل روشن کا مبارک پیغام بھی دے رہا ہے۔

محب گرامی حضرت مفتی سید شہباز اصدق صاحب زید مجدہ (صدر شعبۂ افتاء دارالعلوم قادریہ غریب نواز، ساؤتھ افریقہ) نے اداریہ سمیت چند مضامین بھی دکھائے جسے میں نے چند جگہوں سے دیکھا، جس سے اندازہ ہوا کہ

مقالہ نگار حضرات نے تحقیقی انداز میں اپنے مقالے تحریر کیے ہیں۔ مدیر موصوف نے اداریہ بھی بصیرت افروز تحریر کیا ہے۔ اداریے میں موجود پُر نور تحریر جہاں رسول اکرم ﷺ کے آفاقی پیغام امن کو واضح کرتی ہے، وہیں موجودہ پر آشوب دور میں دنیا کے سامنے سیرت طیبہ کی عالمگیر اہمیت اور ضرورت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

بلاشبہ، حضور سرور کائنات ﷺ کی پوری حیات مبارکہ الفت، محبت، امن اور رواداری کا ایک مصفّٰی اور روشن نمونہ ہے۔ دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ، آپ ﷺ نے ہر ایک کے ساتھ بے پناہ محبت و شفقت کا برتاؤ فرمایا۔ جن جانی دشمنوں نے آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے اور ظلم وستم کی انتہا کر دی، ان سے بھی کبھی ذاتی انتقام نہیں لیا بلکہ جب کبھی انہوں نے ندامت کا اظہار کیا، تو آپ ﷺ نے ہمیشہ عفو ودرگزر کی چادر رحمت سے ان کی خطاؤں کو ڈھانپ دیا۔ آج دنیا جس کرب ناک صورت حال سے دوچار ہے، جہاں ہر طرف فتنہ وفساد کا دور دورہ ہے اور عالمی امن شدید خطرات کی زد میں ہے، ایسے ہولناک اندھیروں میں پیغمبر امن ﷺ کی سیرت طیبہ ہی انسانیت کے لیے واحد مشعل راہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

اس اداریہ میں آپ کو امن کی خاموش فضاؤں سے لے کر جنگ کے پر آشوب میدانوں تک، اور اپنے ہم مذہب سے لے کر دیگر مذاہب کے پیروکاروں تک، ہر گوشے میں آفتاب سیرت کی وہ پاکیزہ کرنیں نظر آئیں گی جو دلوں کی ویران دنیا کو امن و آشتی کے نور سے منور کر دیتی ہیں۔

ماہنامہ الغوث کا یہ قدم قابلِ صد تحسین ومبارکباد ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ خصوصی اشاعت قارئین اور اہل علم کے لیے علم وفکر کی بالیدگی اور قلبی جلا کا باعث بنے گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس مبارک کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے نوازے، ماہنامہ الغوث، اس کے مدیر، تحریری ٹیم اور تمام معاونین کے لیے اسے ذریعۂ نجات وذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین بجاہ النبی الامین ﷺ۔

آپ کے تأثرات

شیخ الحدیث حضرت علامہ افتخار احمد قادری مدنی صاحب مدظلہ العالی (مدینہ منورہ)

باسمہ تعالیٰ

"الغوث" اس کا معنی ہے مشکل وقت میں مدد و نصرت دینے والا۔ بلاشبہ عصر حاضر میں اُمت محمدیہ علی صاحبھا الصلاۃ والسلام ایک نہایت پر آشوب اور ناتوانی اور امتحانی دور سے گزر رہی ہے۔ خونخوار بھیڑیئے اس پر ہر چہار جانب سے حملہ آور ہیں۔ کسی ایک ملک کی بات تو جانے دیجیے بلکہ دنیا کے کسی ایک خطہ پر بھی اللہ عزوجل کے بھیجے ہوئے عمدہ اسلام کے احکام و قوانین کا نفاذ یکسر ناپید ہے۔ آپ غور تو فرمائیں کہ جس خدا نے انسان کو اپنی زمین اور اس کی بیش بہا نعمتیں اور آسائشیں عطا فرمائی، اسی سے اس قدر تباعد اور حکم عدولی اور اسی سے اتنا گریز؟ مگر پھر بھی اس خالق ارض و سما کی رحمت ہمیں پکار رہی ہے:

﴿لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾

اے میرے بندو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔

اس کی رحمت، اس کی قدرت ہر آن اپنے ناتواں بندوں کی فریادرسی کے لیے تیار رہتی ہے، بس ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ بندے اسی سے لو لگائیں۔

نہ ہو مایوس اے اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ایسے میں "الغوث" اللہ کے بندوں کے لیے دادرسی کا بیڑا اٹھائے ہوئے میدان عمل میں کود پڑا ہے۔ سب سے حسین و جمیل اور نفع بخش شئی جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتا تھا اسے لے کر آپ کے سامنے حاضر ہے۔

فرمان خداوندی ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کے بموجب سید کائنات ﷺ کی سیرت عطرہ اور پرنور حیات طیبہ کے چند خوش بودار پھولوں کا گلدستہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

بلاشبہ صحافت کی دنیا میں اور سیرت عطرہ کے ٹاپک پر یہ حسین گلدستہ ایک عظیم اضافہ بھی ہے اور کمزور دلوں کو نئی زندگی عطا کرنے کے لیے ایک سامان حیات بھی ہے۔ اس میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے کہ خلائق میں سب سے پاکیزہ، سب سے جامع اور سب سے خوبصورت اور حیات بخش سید کائنات ﷺ کی حیات میمونہ کے مقدس لمحات وساعات ہیں۔ انہیں سرمدی لمحات وکیفیات اور پرنور ساعات کے بعض گوشے امکانی حد تک پیش کرنے کی سعادت "الغوث" حاصل کر رہا ہے۔ آپ الغوث کا پرجوش استقبال کیجیے اور رضا الٰہی حاصل کیجیے۔

﴿فَهَنِيئًا لِأَرْبَابِ "الْغَوْثِ" تَهْنِئَةً طَيِّبَةً﴾

خصوصا الغوث کے روح رواں علامہ مفتی سید شہباز اصدق صاحب کو توبے تحاشا مبارک بادیاں ہیں۔

﴿اللّٰهُمَّ اجْعَلْ أَعْمَالَ "الْغَوْثِ" مَرْضِيَّةً وَمَقْبُولَةً لَدَيْهِ، إِنَّهُ سَمِيعٌ مُجِيبُ الدَّعَوَاتِ، آمِين بِجَاهِ حَبِيبِهِ الْأَكْرَمِ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ۔﴾

آپ کے تاثرات

استاذ الشعراء حضرت علامہ و مولانا عبد المجید نوری صاحب مدظلہ العالی (ڈربن، ساؤتھ افریقہ)

آئینۂ حسرت بنا ہے ماہنامہ غوث کا
دیدۂ حیرت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

سارے علما و مشائخ سب دعا دینے لگے
زینتِ زینت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

یہ مزین ہے قلم کے شہسواروں سے جہان
مسلکی قوت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

قادری نسبت سے یہ ہے سنیت کا شاہکار
نسبتِ نسبت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

اس جریدے کو خدایا بد نظر سے تو بچا
چشمۂ سیرت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

حضرتِ اصدق کی انتھک کاوشوں کا ہے ثمر
مطلعِ حکمت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

ہے کرم نوری یہ بے شک نور کی سرکار کا
نغمۂ سنت بنا ہے ماہنامہ غوث کا

آپ کے تاثرات

شیخ العلماء حضرت علامہ مفتی فیضان المصطفی قادری صاحب مدظلہ العالی (جامعہ امام اعظم ابوحنیفہ، لکھنو)

مفتی سید شہباز اصدق طالبِ علمی کے زمانے میں اس فقیر سے بہت قریب رہے، اور ہم نے ان کے اندر اسی وقت وہ جوہر دیکھ لیے تھے جو ایک طالبِ علم کو مستقبل میں قائد بناتے ہیں۔ سنجیدگی نمایاں تھی اور نشست و برخاست میں وقار جھلکتا تھا، کچھ کرنے کا جذبہ لیے نصاب کی کتابیں توجہ اور اشتیاق سے پڑھتے تھے، فراغت کے بعد لیڈی اسمتھ، ساؤتھ افریقہ کی مشہور درس گاہ دار العلوم قادریہ غریب نواز چلے گئے اور وہاں پہنچ کر تدریسی و تبلیغی کیریئر کا آغاز کیا، ہم نے جب دہلی سے ماہنامہ پیغامِ شریعت نکالا تو اس کے ممتاز قلم کاروں میں شریک رہے، اور اب ایک مستقل رسالہ نکالنے لگے، یہ رسالہ علمی و ادبی کاموں سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دو تین ماہ قبل جب انڈیا آئے تو ایک زمانے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی اس وقت انھوں نے اپنے رسالہ الغوث کا ایک شمارہ دیا، اسی وقت ہم نے اس کی ورق گردانی کی تو محسوس ہوا کہ بہت سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے، ہر ہر صفحہ اعلیٰ ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ مضامین اہم اور لائقِ مطالعہ تھے۔

ابھی موصوف نے موقع کی مناسبت سے خصوصی سیرت نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا ہے، یہ بڑی ہمت کا کام ہے، کیوں کہ نمبر میں کثیر جہتوں کا احاطہ کرنا ہوتا ہے اور قلم کاروں کی اچھی خاصی تعداد درکار ہوتی ہے، خصوصی نمبر کا خاکہ نظر نواز ہوا، عناوین اور قلم کاروں کے نام دیکھ کر ان کے وسیع حلقۂ احباب اور گہرے روابط و تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوتی ہے کہ موصوف نے دیارِ غیر میں جانے کے بعد اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کی بجائے انھیں تر و تازہ رکھنے کا بہترین بندوبست کیا۔

عیدِ میلاد النبی ﷺ کے موقع سے خصوصی سیرت نمبر عاشقانِ رسول کے لیے روح افزا اور فرحت بخش ہے۔ عناوین کا تنوع اس نمبر کی جامعیت کا غماز ہے، جب یہ نمبر زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے گا تو قارئین کے ذوق کو تسکین کے سامان فراہم کرے گا۔ اس نمبر کی خاص بات جو محسوس ہوئی وہ یہ کہ اس میں روایتی عناوین سے ہٹ کر کچھ جدید عناوین شامل کیے گئے ہیں، جن کی وجہ سے اس نمبر میں خاصی کشش پیدا ہو گئی ہے، ضرورت ہے کہ سیرت کے موضوع پر عصری عناوین پر جدید اسلوب میں کام کیا جائے۔ توقع ہے کہ اس نمبر کے ذریعہ سیرتِ نبوی کے نئی راہیں کھلیں گی جن سے آنکھیں آشنا نہ تھیں، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مفتی سید شہباز اصدق اور ان کی پوری ٹیم کی طرف سے اس علمی خدمت کو قبول فرمائے اور اسے ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین بجاہ حبیبِ سید المرسلین علیہ و علی آلہ و اصحابہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

آپ کے تاثرات

شیخ طریقت حضرت علامہ ابو الفیضان محمد رمضان حیدر قادری فردوسی صاحب مدظلہ العالی

(خانقاہ فردوسیہ جونکا شریف جھارکھنڈ)

حضرت مفتی سید محمد شہباز اصدق غوثی مدظلہ العالی والنورانی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق یہ "سیرت نمبر" محض ایک رسالہ یا مقالات کا مجموعہ نہیں، بلکہ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کو عصرِ حاضر کے فکری، اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور روحانی مسائل سے مربوط کرنے والی ایک جامع علمی کاوش ہے۔

خصوصی سیرت نمبر میں قدیم و جدید دونوں زاویوں کو یکجا کیا گیا ہے، جس میں سیرتِ نبوی ﷺ کے کمالات، عشق و اتباع، جدید ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت، نوجوانوں کے مسائل، خاندان، معیشت، معاشرہ، خواتین، تعلیم، روحانیت اور حال و مستقبل کے چیلنجز تک کو موضوع بنا کر آپ نے کمال کر دیا ہے آپ کی دور اندیشی، دور بینی قابلیت و صلاحیت اور حکمت عملی کا قائل تو پہلے بھی تھا مگر اس بار آپ نے اپنی ان خداداد صلاحیتوں پر ناقابل رد ثبوت فراہم کر دیا۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

سیرتِ مصطفیٰ ﷺ وہ بحرِ بے کراں ہے جس کی وسعتوں کا احاطہ الفاظ سے کرنا کہاں ممکن۔ صدیوں سے اہلِ علم و قلم اس بحرِ رحمت میں غواصی کرتے آئے ہیں، ہر عہد اپنے سوالات، اپنے مسائل، اپنے فکری تقاضوں کے ساتھ سیرتِ طیبہ ﷺ کی طرف رجوع کرتا ہے اور ہر مرتبہ اسی آفتابِ نبوت سے نئی روشنی، نئی رہنمائی اور نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ زیرِ نظر خصوصی سیرت نمبر اسی زندہ اور لازوال حقیقت کی ایک نہایت خوب صورت، سنجیدہ اور قابلِ تحسین علمی تعبیر ہے۔

ماہنامہ "الغوث" کا یہ خصوصی شمارہ صرف سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ کے روایتی گوشوں تک محدود نہیں رہا بلکہ سیرتِ طیبہ کو عصرِ حاضر کے فکری اور عملی مسائل کے ساتھ مربوط کرکے یہ ثابت کرتا ہے کہ ہادی عالم کی سیرت کسی ایک زمانے، ایک قوم یا ایک خطے کا دستورِ حیات نہیں بلکہ ہر زمانے کے انسان کے لیے کامل رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

اس خصوصی شمارے کی سب سے بڑی خوبی اس کی موضوعاتی وسعت اور فکری جامعیت ہے۔ ایک طرف کمالاتِ نبوی، بشارتِ انبیا، رسالتِ محمدی کا عقلی ثبوت، دنیا آخرت میں حضور کی سیادت، عظمتِ محمد مصطفیٰ اور اختیارات مصطفیٰ جیسے بنیادی اور اعتقادی موضوعات ہیں، تو دوسری طرف سیرت اور جدید ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل دور، آن لائن پرائیویسی، ڈیجیٹل شہرت اور نوجوانوں کے مسائل جیسے نئے اور نہایت اہم مباحث بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ امت کے موجودہ فکری حالات کی نبض شناسی کی روشن علامت ہے۔

ان نئے موضوعات کے انتخاب پر شہزادۂ خانقاہ غوثیہ کو خصوصی داد و دعا دینے پر مجبور ہوں مولیٰ کریم اس فکری اڑان کو مزید بال و پر عطا فرمائے۔

خصوصی شمارے کا ایک نہایت قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ سیرت کو محض تاریخی واقعات کے مجموعے کے بجائے مکمل نظامِ حیات کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاندان کے عنوان سے میاں بیوی کے حقوق، بچوں کی تربیت، والدین کی خدمت، اور رشتوں کی حفاظت؛ معیشت کے تحت کاروباری دیانت داری، رزقِ حلال اور غربت کے خاتمے کا نبوی تصور؛ جبکہ معاشرت کے باب میں انسانی حقوق، ماحولیاتی تحفظ، عالمی امن، بین المذاہب ہم آہنگی اور پڑوسیوں کے حقوق جیسے موضوعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مرتبین نے سیرتِ طیبہ کے عملی اور اجتماعی پہلوؤں کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

اسی طرح تعلیم کے میدان میں سیرت نویسی کے مناہج، تعلیم و تربیت کا نبوی منہج اور جدید تعلیمی چیلنجز خواتین کے باب میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت و کردار اور مسلم بچیوں کے لیے سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کی معنویت؛ جبکہ روحانیت کے گوشے میں تزکیۂ نفس اور اخلاقی تربیت جیسے مباحث اس شمارے کو محض ایک علمی

مجموعہ نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے فرد سے خاندان، خاندان سے معاشرہ اور معاشرے سے پوری انسانیت تک نبوی تعلیمات کے سفر کا ایک فکری نقشہ بنادیتے ہیں۔

اس شمارے کا ایک اور امتیاز اس میں شامل اہلِ قلم کی علمی وسعت ہے۔ مختلف علما، مفتیانِ کرام، مفکرین، اساتذہ اور اہلِ قلم کی نگارشات اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ سیرتِ رسول صلی ﷺ پر گفتگو کسی ایک اسلوب یا ایک علمی زاویے کی پابند نہیں؛ بلکہ عقیدہ، فکر، تاریخ، اخلاق، معاشرت، تعلیم، معیشت اور روحانیت—ہر میدان میں سیرتِ طیبہ ﷺ اپنی رہنمائی کا دروازہ کھولتی ہے۔

سرزمین بہار پر بہار کے اس جواں سال عالم فاضل کامل کو جب افریقہ کی سرزمین سے مخدوم جہاں سلطان المحققین امام العارفین شیخ شرف الدین یحییٰ منیری فردوسی رضی اللہ عنہ کی تحریروں کا ناشر و مبلغ و داعی بنتے دیکھا تو ان کے اسلاف و اساتذہ کی تربیت پر رشک ہونے لگا ہے مولیٰ کریم سیدی سندی مفتی شہباز اصدق غوثی کو اپنے اسلاف کی کرامات سے متصف فرمائے۔

میرے نزدیک اس خصوصی سیرت نمبر کی سب سے بڑی معنویت یہ ہے کہ اس نے سیرتِ رسول علیہ التحیۃ والثنا کو ماضی کی یاد سے نکال کر حال کی ضرورت اور مستقبل کی ضمانت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج انسان مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل انقلاب کی حیرت انگیز دنیا میں داخل ہو چکا ہے، خاندان ٹوٹ رہے ہیں، اخلاقی اقدار کمزور ہو رہی ہیں، نوجوان فکری انتشار کا شکار ہیں، معاشی بے اعتدالی بڑھ رہی ہے اور تہذیبی تصادم کے سوالات شدت اختیار کر رہے ہیں ایسے میں سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ان مسائل کا مطالعہ وقت کی ناگزیر ضرورت ہے۔ شمارے کے آخری حصے میں مستقبل کے چیلنجز، اسلامی تہذیب کے مستقبل اور اکیسویں صدی میں سیرتِ نبوی کی معنویت جیسے موضوعات اسی احساسِ ضرورت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

یہ شمارہ اس حقیقت کا خوب صورت اعلان ہے کہ سیرتِ مصطفیٰ علیہ الصلاۃ والسلام صرف پڑھنے کے لیے نہیں، جینے کے لیے ہے؛ صرف محبت کا موضوع نہیں، زندگی کی تعمیر کا دستور ہے؛ صرف ماضی کا تذکرہ نہیں، حال کی رہنمائی اور مستقبل کی ضمانت ہے۔

ماہنامہ الغوث کے اس خصوصی سیرت نمبر کی ترتیب وپیش کش یقیناً قابلِ تحسین ہے۔اس میں موضوعات کی کثرت کے ساتھ موضوعات کا تنوع، قدیم علمی مباحث کے ساتھ جدید عصری سوالات، عقائد کے ساتھ اخلاق، عبادات کے ساتھ معاملات، فرد کے ساتھ خاندان، خاندان کے ساتھ معاشرہ اور معاشرے کے ساتھ عالمی انسانیت کو سامنے رکھا گیا ہے۔یہی جامعیت اسے ایک عام خصوصی شمارے سے ممتاز کر کے ایک قابلِ مطالعہ علمی وفکری دستاویز کا درجہ عطا کرتی ہے۔میرا خیال ہے یہ کارنامہ صدیوں تک یاد رکھا جائے گا اور ہر صاحب علم اسے سراہے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علمی کاوش کو شرفِ قبول بخشے،اس کے مرتبین، مصنفین اور تمام معاونین خصوصا مفتی صاحب قبلہ کو جزائے خیر عطا فرمائے،اور اس شمارے کو عشقِ رسول اتباعِ رسول اور تعلیماتِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کی ترویج کا مؤثر ذریعہ بنائے۔

یہ شمارہ پڑھنے کی چیز نہیں، سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اپنے عہد کو سمجھنے اور اپنی زندگی کو سنوارنے کی دعوت ہے۔

اس تاریخی انقلابی روحانی عرفانی اور سراسر علمی موقع پر آپ جیسی عظیم با مروت اور روحانی شخصیت کا اس ہیچ مداں فقیر فردوسی کو یاد کرنا میرے لیے بڑی بات اور سعادت ہے،کسی عنوان پر تفصیل سے لکھتا ضرور مگر اب نا آپ کے پاس وقت ہے نا میرے پاس، ان شاء اللہ کسی دوسرے موقع پر آخر میں اس خورد نوازی اور بندہ پروری کا بھی شکریہ ہے۔

آپ کے تاثرات

داعی اسلام حضرت علامہ ارشد مصباحی صاحب مدظلہ العالی (اہل سنت فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، انگلینڈ)

باسمہ تعالیٰ

جملہ اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ہر نقص و عیب سے پاک پیدا فرمایا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں یہ حقیقت بیان کی گئی کہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

بے شک تمھیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے

فقیر پر تقصیر کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ الحمد للہ "ماہنامہ الغوث" اس حوالہ سے ایک خصوصی سیرت نمبر نکال رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے دور کے مسلمانوں کو سیرت طیبہ کی روشنی میں اپنی زندگیاں گزارنے کی تاکید کی جاتی رہے، اسی میں ہماری حقیقی فلاح و کامیابی ہے۔ اس نمبر کے عناوین سے عیاں ہے کہ حالات حاضرہ اور جدید مسائل و چیلنجز کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ سید العالمین ﷺ کی مبارک زندگی سے تمام مسائل کا حل نکالا جائے۔ اللہ تعالیٰ مدیر محترم علامہ مفتی سید شہباز اصدق صاحب اور ان کی پوری ٹیم کو بہترین جزاؤں سے نوازے اور اس طرح مزید دین سنیت کا کام کرتے رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

آپ کے تاثرات

محقق عصر حضرت علامہ مولانا طارق انور مصباحی صاحب مدظلہ العالی (کلکتہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ واصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ عزوجل نے قرآن مقدس میں سیرت نبویہ کو اسوہ حسنہ قرار دیا اور حضور اقدس شفیع محشر ساقی کوثر ﷺ کے اخلاق وکردار کو خلق عظیم سے تعبیر فرمایا۔ حضور اقدس نور مجسم رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿بعثت لاتمم مکارم الاخلاق﴾ یعنی اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے واسطے مجھے مبعوث فرمایا گیا۔

مورخین نے بھی کائنات عالم میں سب سے افضل انسان ہمارے رسول مقبول ﷺ کو تسلیم کیا ہے اور یہ بات مبنی بر حقیقت ہے۔ ہمارے پیغمبر حضور اقدس سرور کائنات افضل مخلوقات ﷺ جملہ مخلوقات خداوندی سے افضل واعلیٰ اور برتر وبالا ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے رتبہ ودرجہ کی عظمت وبلندی سے بھی دنیا والے کماحقہ واقف وآشنا نہیں۔ درج ذیل فارسی شعر میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

همه پیغمبراں در جستجو اند

خدا داند کہ تو در چہ مقامی

تمام پیغمبران کرام علیہم الصلوۃ والسلام تلاش وجستجو میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ آپ کس عظیم منزل پر فائز المرام ہیں۔

یہ جان کر بے حد فرحت وشادمانی ہوئی کہ فاضل شہیر حضرت مولانا سید شہباز اصدق امجدی زید فضلہ ماہنامہ "الغوث" (سہسرام) کا خصوصی شمارہ "سیرت نمبر" شائع کر رہے ہیں۔ خصوصی شمارہ کے عناوین کا مشاہدہ

کیا،خواص وعوام کے لیے نفع بخش اور معلومات افزا پایا۔منتخب اور ماہر قلم کاران ومحررین نے اس خصوصی نمبر میں تحریری حصہ لیاہے۔ایسے خوب نویسوں کے مضامین ومقالات یقیناخوب اور قابل تحسین ہوں گے۔

سیرت نبویہ سے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلمین کو بھی واقف کیا جائے،تاکہ وہ بھی ہمارے رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے اخلاق حسنہ اور اوصاف جمیلہ سے باخبر ہو جائیں اور ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ سید موصوف کو اور ماہنامہ کے جملہ کارکنان ومتعلقین، قلم کاران ومحررین،وابستگان ومعاونین اور تمام حصہ داران وقارئین کو دونوں جہاں کی نعمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائے اور سیرت نمبر کی طباعت واشاعت کے وسائل واسباب مہیا فرمادے اور اس نمبر اور ماہنامے کو قبولیت وافرہ عطا فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الکریم الامین صلوات اللہ تعالیٰ وتسلیماتہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

آپ کے تأثرات

حضرت علامہ و مولانا شاہ فیصل خاں قادری مصباحی بلرام پوری مدظلہ العالی (ساؤتھ افریقہ)

الحمد للہ رب العلمین و الصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین و علی آلہ و صحبہ أجمعین۔ اما بعد

خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ، برصغیر کی ایک جانی مانی دینی وروحانی خانقاہ ہے جو سواد اعظم اہل سنت وجماعت کے صوفیانہ منہج پر گامزن ہے اور ماشاءاللہ شب وروز خدمت خلق میں مصروف عمل ہے۔

﴿ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴾

اسی مبارک سلسلہ کی ایک اہم کڑی "ماہ نامہ الغوث" کی اشاعت کریمہ ہے جس کا حسن آغاز بحمدہ تعالیٰ، عیسوی سال رواں ۲۰۲۶ء کی آمد آمد کے ساتھ ہوا۔

وقت اور ماحول کی نزاکت کے پیش نظر، ماہنامے کے ارباب حل وعقد نے فیصلہ کیا کہ ماہ اگست کا شمارہ میلاد النبی شریف کی نسبت سے سیرت رسول اکرم ﷺ سے معنون ومنسوب کیا جائے۔

نبیٔ پاک کی سیرت طیبہ ایک تاریخ ہی نہیں بلکہ یہ بنی نوع انساں کے لیے ایک غیر منتہی سرچشمہ ہدایت ورحمت ہے۔ زیر نظر ماہ نامہ نے، حضور خاتم النبیین کے گوناگوں شعبہ ہائے حیات طیبہ کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پاک کو انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے اعلیٰ ترین نمونہ حیات بنا کر بھیجا ہے۔

بہتر انسان بننے کے لیے، ہمیں زندگی کے ہر مرحلہ پر ہدایت کی ضرورت ہے، ایک کام یاب، ذمہ دار اور باادب انسان اور مسلمان بنے رہنے کے لیے قدم قدم پر ایک عظیم راہنما کی تلاش ہے تاکہ ہم اپنی نجی اور سماجی زندگی میں ایک صحت مند فرد بن کر حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کر سکیں۔ الحمد للہ، اس مبارک ماہ نامہ میں سرکار دوعالم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں، مختلف مراحل حیات کے لیے مہکتے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

ہمیں کرنی ہے شاہنشاہ بطحا کی رضا جوئی

وہ اپنے ہوگئے تو رحمت پروردگار اپنی

اس مبارک نمبر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں چنے گئے مختلف النوع مواد و مضامین، امت کے مختلف عوام و خواص کے لیے یکساں مفید ہیں ۔ مرد و عورت ،جوان اور بوڑھے، ماں باپ اور اولاد، استاد و شاگرد الغرض

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

اس ماہ نامے کی دو چیزیں دامن دل کو بار بار اپنی طرف کھینچتی ہیں

1: نام ونسبت: الغوث

عاشقان اولیائے کرام کے لیے ایک بہترین یاد دہانی اور ان شاء اللہ العزیز، معظم قاری کو سرکار غوثیت کبری سے روحانی تحفہ ملتا رہے گا۔

2:شرکائے بزم سیرت طیبہ

الحمد للہ الکریم تمام تر قلم کار حضرات، اپنے اپنے میدانوں کے شہ سوار اور ماہر و مستند علمائے کرام و مشائخ عظام ہیں جو در حقیقت نائبین رسول گرامی وقار ہیں۔ بلا شبہہ قاری حضرات پر علوم نبویہ کی بارش رشد و رحمت ہوگی۔

دعا ہے کہ مولی تعالٰی، حضرات پنج تن پاک کے صدقے، اس مبارک اشاعت کا دائرہ افادہ و استفادہ عام سے عام تر فرمائے اور اس کے تمام تر متعلقین متوسلین محبین و معاونین و قارئین و ناشرین بالخصوص مدیر اعلی، محب گرامی حضرت مفتی سید شہباز اصدق کو دن دونی رات چوگنی ترقیاں عطا فرمائے ۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

آپ کے تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد وقار احمد نوری معینی صاحب زید مجدہ (کرناٹک)

علم و عرفاں کا حسیں اک ترجماں الغوث ہے
اصدقی افکار کا روشن جہاں الغوث ہے

معرفت کی نکہتوں سے سمتِ جاں مہکائی ہے
مکتبِ غوثی کا عالی بوستاں الغوث ہے

مسلکِ احمد کا داعی نورِ پیمائے صفا
عصرِ حاضر میں ہدایت کا نشاں الغوث ہے

فکر و دانش، عقل و حکمت، جذبۂ شوقِ یقیں
ان سبھی پاکیزہ خو کا گلستاں الغوث ہے

فکر و فن کی تیرگی میں روشنی کا استعار
مشعلِ علم و عمل کا پاسباں الغوث ہے

اہلِ دل اہلِ بصیرت کہہ رہے ہیں بالیقیں
صدق و حق کی منزلوں کا کارواں الغوث ہے

جس کی ہر اک موج سے پاتی ہیں خوشبو بھی وجود
بحرِ الفت کا مہکتا ارمغاں الغوث ہے

کاوشوں کا عکس ہے یہ حضرتِ شہباز کی
علم و تحقیق و ادب کا کارواں الغوث ہے

سیرتِ سرکار پر ہے یہ درخشاں آفتاب
جلوۂ خلقِ نبی کا رازداں الغوث ہے

فیضِ صدیق و عمر عثمان و حیدر کا امیں
چار یاروں کے کرم کا قدرداں الغوث ہے

غوث و خواجہ اور رضا کے بے بہا فیضان سے
اولیائے حق کا تابندہ سماں الغوث ہے

آستانِ غوثیہ کا فیضِ ہے یہ بالیقیں
مشعلِ راہِ ہدیٰ نورِ سماں الغوث ہے

ظلمتِ عہدِ رواں میں گوہرِ ایماں کا نور
کہکشاں در کہکشاں تابِ کناں الغوث ہے

فکرِ باطل کے لیے جو صدمۂ برہاں بنے
حیدری للکار کا وہ گل فشاں الغوث ہے

گلشنِ اصدق کا گل ہے یہ وقارِ قادری
چار سو خوشبو لٹاتا عطر داں الغوث ہے

انوار سیرت

بزرگوں کے قلم سے

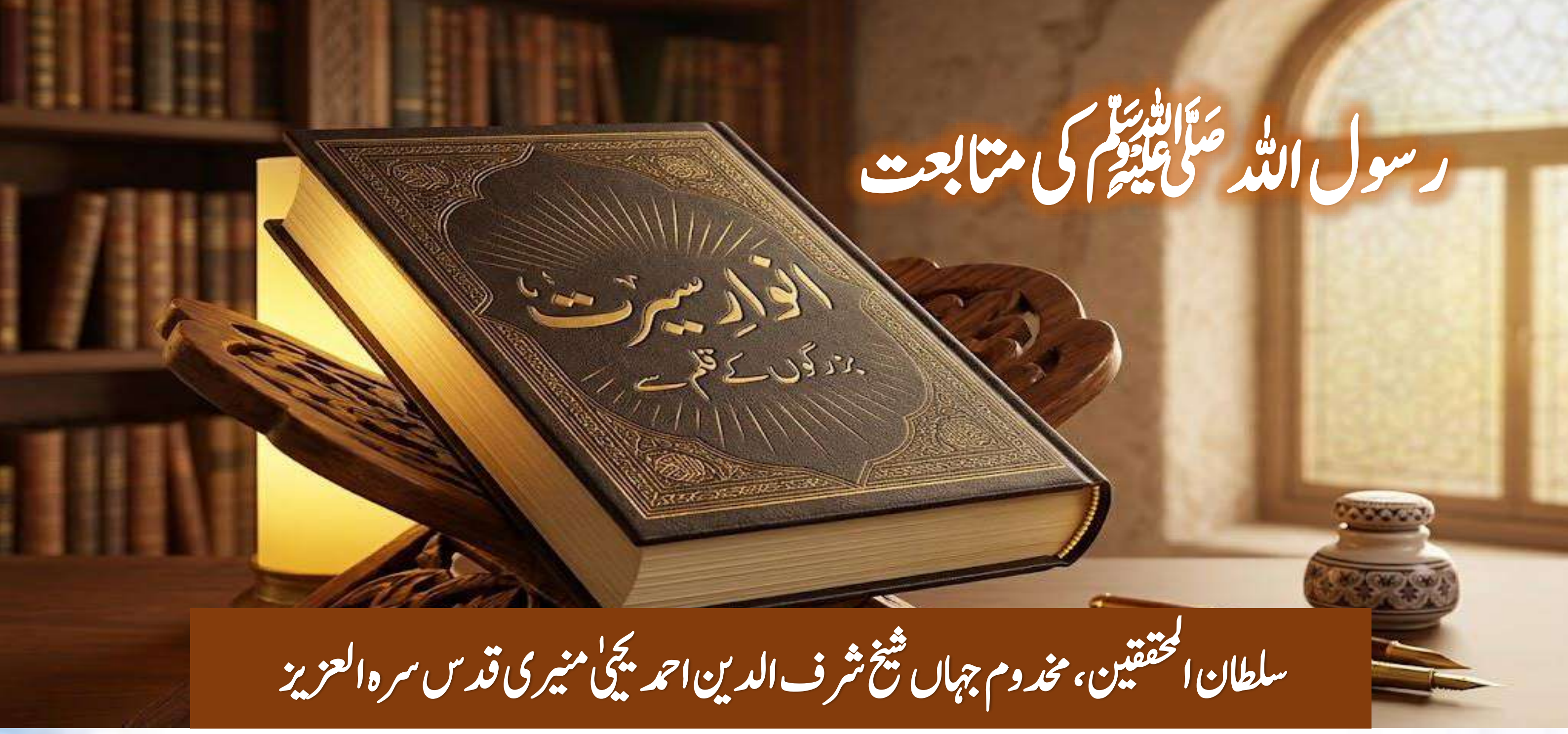

رسول اللہ ﷺ کی متابعت

سلطان المحققین، مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ العزیز

برادرم شمس الدین سلمہ اللہ تعالیٰ!

تم یقین جانو کہ سعادت ابدی اور عزت سرمدی انسان کے لیے خداوند جلّ وعلا کی محبت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس دولت و خلعت کا محل حضرت سید المرسلین، خاتم النبیین ﷺ کی متابعت کا دربار شاہانہ ہے۔ یہ دولت و خلعت حضور ﷺ کی سنت کی متابعت پر موقوف ہے۔ دیکھو! قرآن شریف کس طرح گہر ریز ہے:

﴿ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾

ترجمہ: میری پیروی کرو، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا۔

یعنی اپنے شہنشاہ کی فرماں برداری کا طوق گلے میں ڈالو، اور حلقۂ اطاعت کانوں میں پہن لو۔ حکم سرکار بجالاؤ، نواہی سے دور رہو، اور سراپا قصر ایمان کو طاعت کے گلدستوں سے سجالو۔ سنتوں سے واقفیت تامہ حاصل کرو، اور اس پر ایسا عمل کرو جیسا عمل کرنے کا حق ہے۔

پھر دیکھ لوگے کہ وہ عہد نامۂ دوستی جو لکھا گیا ہے، اور خطبۂ عقد محبت جو پڑھا گیا ہے، بسند اتباع حضور پرنور ﷺ یقیناً نافذ ہو کر رہے گا۔ اور ضرور مکمل سمجھا جائے گا جب یہ فرمان شاہی اور یہ وثیقۂ سندی وسری تمہارے پاس رہے گا تو یہاں بھی مزے لوٹو گے اور عیش کروگے۔ پھر جس وقت حضرت محبوب حقیقی کے دربار میں حاضری ہوگی تو وہاں بھی ﴿ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾ یعنی مقعد صدق کے مقام میں خدائے بلند و برتر کے پاس۔

ذرا سمجھنے کی بات ہے! مقعد صدق عہد پاک مقتدر کا دلچسپ گھوارہ، خوش نما چپر کھٹ ہے۔ کیا کسی دوسرے مہمان عزیز کے لیے آراستہ ہوا ہے؟ نہیں، صرف تمہارے لیے، یعنی غلامان رسول ﷺ کے لیے۔

مقام صدق میں پہنچ کر، اللہ اکبر! تمہاری شان کی کوئی حد بھی ہوگی؟ پہلی ہی منزل میں آٹھوں بہشت ہیں، عیش و آرام، سیر و تفریح، حوران جنت کے حسن دل افروز کا نظارہ، چاندی، سونا، یاقوت اور موتیوں کے جواہرات، شاہی محلوں میں جلوس، کوثر و تسنیم کی لہروں کے سرور بخش مناظر، درختوں کے پھل، پھول، سبزہ کی وہ دلکش بہار، شراب طہور کا دور مسلسل، انواع واقسام کے خوان پر نعمت کی لزتیں یعنی:

﴿ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾

ان لوگوں کے لیے جنت الفردوس اترنے کی جگہ ہوگی۔

مگر یاد رہے کہ درد طلب میں صدق واخلاص ہے، تو باوجود ان تمام سامانوں کے تم گھبرا اٹھوگے اور کہنے لگوگے:

دلِ بریاں بہ مرغِ بریاں نیاساید
و جگر سوختہ و دل خون شدہ بہ حور و قصور ننگرد

یعنی جلا ہوا دل مرغ بریاں سے لذت نہیں اٹھاتا، اور جس کا جگر سوختہ اور دل خون ہو چکا ہو، وہ حورانِ جنت اور بہشتی محلوں کی طرف بھی نگاہ نہیں کرتا۔

یہ خیال آتے ہی فوراً اس بہشت کو چھوڑ کر تمہارا قدم آگے چل نکلے گا اور اس منزل اعلیٰ پر پہنچا دے گے جس کا وصف خوش بیانوں کی توصیف سے باہر ہے، جس کے لیے بیش بہا خزانے کے انمول موتی وہم وگمان و عقل سے روپوش ہیں یعنی جس بہشت کی یہ شان ہے:

﴿أعددتُ لعبادي الصالحين ما لا عينٌ رأتْ ولا أذنٌ سمعت ولا خطر على قلبِ بشرٍ﴾

نیک بندوں کے لیے مقرر کیا گیا وہ ایسا مقام ہے کی جس کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ ہو اور نہ کسی کے کان نے اس کی تعریف سنی ہو اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کی آرائش کا خیال تک گزرا ہو۔

پھر یہاں کی نورانیت تم کو بھی سراپا نور بنا کر وصل حقیقی کے رنگ میں رنگ ڈالے گی اور معراج کمال پر پہنچا دے گی۔ اب کیا پوچھنا! وہ راز و نیاز، وہ رموز واشارات کا دفتر عشق وحسن کے مابین کھلے گا کہ ذاق من ذاق (یعنی چکھا جس نے چکھا) کے سوا اور کچھ تعبیر نہیں ہو سکتی۔

سبحان اللہ! یہ خطاب جاں فزا کہ:

﴿مِنَ الْمَلِكِ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ الى الملك الحيی الذی لا یموت﴾

یعنی: اس ہمیشہ زندہ رہنے والے بادشاہ کی طرف سے، اس ہمیشہ زندہ رہنے والے کے بادشاہ کی طرف جس کو کبھی موت نہیں۔

کس وصل حقیقی کو ظاہر کر رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جو معاملہ تمہارے ساتھ ہوا، ہو گا اور ہو رہا ہے اسے عشق و محبت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت میں نظر سے ذرا

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾

اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

کی شان دیکھو! کیا اس علو مرتبت کی کوئی حد بھی ہے؟ کیا اس عز و شان کی کوئی انتہا بھی ہے؟ تم سمجھے؟ اسی محبت کو جذبۂ حقیقت کہتے ہیں۔ کہاں یہ رنگ، کہاں ہماری تمہاری یہ حالت کہ بغیر طمع بہشت و خوف دوزخ ایک عمل بھی خالص لوجہ اللہ نہیں ہوتا۔ افسوس! کیا وہ خدائے برتر اگر بہشت و دوزخ پیدا نہ کرتا تو مسجود و معبود نہ ہوتا۔ نہیں نہیں، ضرور ہوتا۔

ہم پست ہمتوں کے حسب حال واقعی کسی عزیز کا قول کس قدر صحیح ہے کہ دوزخ اگرچہ صورتاً مظہر قہر و جلال مگر اس کا پیدا کرنا تخلیق بہشت سے کہیں زیادہ دلیل رحمت ہے کیونکہ اصحاب لذات و شہوات کو اگر صرف جنت کی ترغیب دلائی جاتی تو پورا مقصد حاصل نہ ہوتا۔ لالچ سے وہ خوف پیدا نہیں ہوتا جو عذاب سے ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، خواب غفلت میں سونے والے خوشگوار آواز سے صرف آنکھ کھول کر رہ جاتے ہیں، ہاں مہیب آواز سے البتہ چونک پڑتے ہیں۔ عذاب دوزخ سے اس لیے ان کو ڈرایا گیا ہے تاکہ ہوشیار ہو جائیں، فانی لذتوں کو بھول

جائیں ایسا خوف ان کے دل میں طاری ہو کہ لذات و شہوات کی طرف سے منھ موڑ لیں اور آخرت کی طرف دل سے متوجہ ہو جائیں۔

اس سے زیادہ ہم لوگوں کے لیے رونے کا مقام یہ ہے کہ دل میں نہ طمع بہشت ہے اور نہ خوف دوزخ ہے۔ اگر بہشت کی طمع یا دوزخ کے خوف سے بھی عبادت کریں تو بھی غنیمت سمجھو۔ ہم تم سے کیا کہیں کہ اخلاص سے عبادت کا کیا حال ہوتا ہے۔ عبادت محبوب ہو جاتی اور تعظیماً لامر اللہ کا اس میں پختہ رنگ آجاتا ہے۔ ایسی ہی عبادت کے بعد مستی محبت کا ظہور ہوتا ہے، جہاں یہ مستی پیدا ہوگئی ایسے شخص کی ضمیر پر بہشت و دوزخ کا وہم بھی نہیں گزرتا، نہ فوت کا غم نہ یافت کی خوشی، سچ ہے سلطان محبت و شوق کا جب تسلط ہو جاتا ہے تو حدیث راحت بہشت اور زحمت دوزخ کا وہاں ذکر کہاں؟ کیا خوب کسی نے کہا ہے

شربتِ وصل را بہشت خَسے است
در رہِ عاشقاں بہشت بس است

شربت وصل کے مقابلہ میں بہشت ایک تنکے کے برابر ہے عاشقوں کے راستے میں ایسی ایسی بہشت بہت ملتی ہے۔

بحوالہ: مکتوبات صدی، ص ۲۰۴-۲۰۷

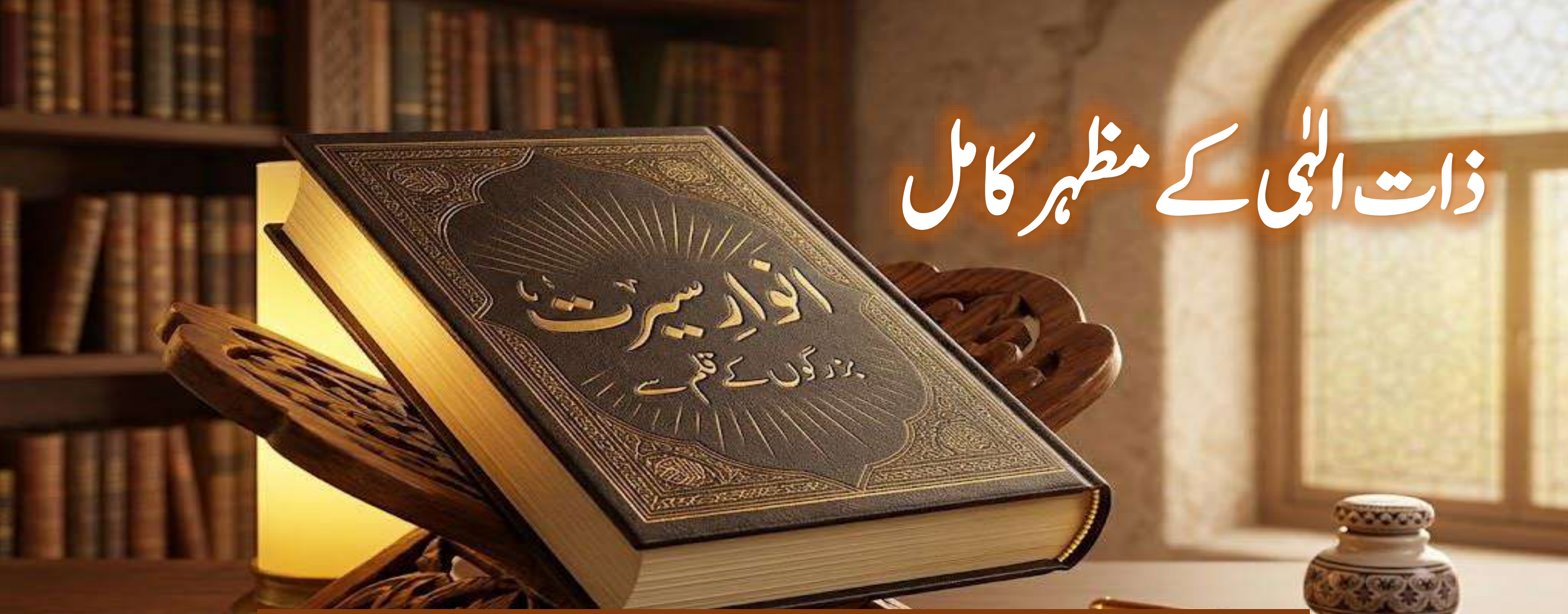

ذات الٰہی کے مظہر کامل

قطب عالم حضور سیدنا شاہ خواجہ قیام اصدق چشتی قادری قدس سرہ العزیز

سید المرسلین صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ﴾

ترجمہ: جس نے مجھے دیکھا، اس نے تحقیق حق کو دیکھا۔

معلوم ہوا کہ آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مظہر ذات الٰہی ہیں نیز اس کی طرف حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾

ترجمہ " : بے شک جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ در حقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اور اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾

اے محبوب! جب آپ نے کنکریاں پھینکیں تو حقیقت میں آپ نے نہیں پھینکیں، بلکہ اللہ ہی نے انہیں پھینکا۔

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے دست اقدس کو اپنی قدرت کا مظہر قرار دیا اور آپ کے فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ لہٰذا وہ جو ظاہر بین ذات سرکار دو عالم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم میں قدرت خاص کا نہ ہونا بتلاتے ہیں وہ قابل اعتبار بات نہیں۔

آپ ﷺ کی عظمت کے بیان میں یہ احادیث یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا اور تمام مخلوق میرے نور سے پیدا کی گئی۔

اور یہ بھی فرمایا: سب سے پہلے جس چیز کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدا کیا وہ میرا نور تھا۔

نیز ارشاد فرمایا: میں اس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔

اسی مقام کی مناسبت سے ایک عاشقِ رسول نے یہ نعتیہ اشعار کہے ہیں:

چو حسنِ جمالت چراغم بود
مرا در دو عالم چراغم بود

چرا غم بود چوں چراغم توئی
چراغم توئی، چوں چرا غم بود

ترجمہ: جب آپ کا جمال میرے سامنے ہے تو پھر غم کس بات کا ہے اس لیے کہ اگر دونوں جہاں کا درد بھی میرے دل میں سما جائے تو میرے سینے میں چراغ کا کام دے گا۔ میرے دل کی تاریک کوٹھری میں آپ کا نور چراغ کی طرح روشن ہے اور جب آپ میرے دل کے چراغ ہوں تو پھر مجھے کسی بات کا غم کیوں ہو گا۔

اور جو حضرت سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے وہ شاید تجھے یاد ہو گا۔

تو اصلِ وجود آمدی از نخست
دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

ترجمہ: آپ ﷺ ابتدا ہی سے وجود ممکنات کی اصل اور جڑ ہیں، اور اس کے بعد جو کچھ بھی ظہور میں آیا وہ سب آپ ہی کی فرع ہے۔

اس مقام پر دل سے زبان پر ایک چیز آ گئی، جو لکھے دیتا ہوں:

ذاتِ احمد نورِ ربانی بود
فعل احمد فعل یزدانی بود

ترجمہ: ذات مصطفی ﷺ نور ربانی ہے، آپ کا ہر فعل گویا خدا ہی کا فعل ہے

گر نبود ذات احمد در میاں
نے شدی کثرت ، و نے وحدت عیاں

ترجمہ: اگر سرکار دو عالم ﷺ کی ذات والا صفات نہ ہوتی تو نہ تو وحدت عیاں ہوتی نہ کثرت۔

گر ترا چشم یقیں باشد دلا
در میانِ ذاتِ احمد بیں خدا

ترجمہ: اے دل اگر تیرے پاس ایمان والی آنکھ ہے تو سرکار دو عالم ﷺ کی ذات کے درمیان حق کو دیکھ۔

آں محمد، کیست دانی، اے بشر
حق عیاں گشتہ میانِ آں بشر

ترجمہ: اے انسان تو جانتا ہے کہ محمد ﷺ کون ہیں؟ وہی ایسے بشر ہیں کہ جن میں جلوۂ حق عیاں ہے

آں محمد کز پیش لولاک گفت
آں محمد ، درّ من رآنی بسفت

ترجمہ: وہ ذات والا صفات ایسی ہے کہ جس کی شان میں کلمہ " لو لا ک" کہا گیا۔ وہ وہی محمد ﷺ ہیں جنہوں نے "من رآنی فقد رأی الحق" (جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا) کا راز بیان فرمایا۔

آں محمد، کو شد آخر در عیاں
بود سابق از عیاں اندر نہاں

ترجمہ: یہ وہی ہیں جن کا ظہور سب سے آخر میں ہوا لیکن سب سے اول نبی بنائے گئے۔

گاہ گوید مثل تاں من آدمم
گاہ گوید نفسِ تاں من آدمم

اپنے متعلق کبھی یہ فرمایا کہ میں تم ہی میں سے ایک بشر ہوں اور کبھی یہ ارشاد فرمایا کہ میں بھی تمہارے نفوس میں ہوں۔

جملگی ماراا بود در دو جہاں
ذات او مقصود و قصد طالباں

ترجمہ: دونوں جہانوں میں ہم سب کے لیے ان (ﷺ) ہی کی ذات مقصود اور طالبوں کا اصل مقصد و حاصل ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کی ذات گرامی پل صراط ہے تو اس سے شریعت کی سیدھی راہ نکلی ہے، لوح محفوظ سرکار ﷺ کا حافظہ ہے اور جس چیز پر لوح محفوظ رکھی ہوئی ہے وہ سرکار ﷺ کا دماغ ہے، عرش کی کرسی سرکار ﷺ کے بیٹھنے کی جگہ ہے اور عرش سے مراد سرکار ﷺ کی شان بلندی ہے۔ اس ذات گرامی میں رب کی شان اور عبد کی عبودیت دونوں جلوہ گر ہیں۔ جب مظہر حق کا اظہار مقصود ہوا تو کلام ربانی یعنی قرآن مجید کو بیان فرمایا اور جب عبودیت کا حال طاری ہوا تو ظاہر میں بندے کی طرح عمل فرمایا۔

یاد رکھو کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے جو حکم ہو گیا اس پر بغیر کسی رد و قدح کے عمل کیا جائے اور یقین رکھا جائے۔ اسراف کی حضور نبی کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے تو وضو کے لیے پانی کا جو استعمال ہوتا ہے اس میں بھی اس کا خیال رکھا جائے۔ دین کے معاملے میں اپنی عقل کو بروئے کار نہیں لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے جو حکم کر دیا ہے وہی دین ہے اس حکم پر بلا کم و بیش عمل کرنا یہ دینداری و بندگی ہے۔ ایک لوٹا پانی کی جگہ پر چار لوٹا پانی خرچ کیا جائے اور شیطانی وسوسہ یہ ہو کہ ہم پاک ہو گئے اصل چیز تو دل کی پاکی ہے۔ اور دل اسی وقت پاک ہو گا جب گناہ سے بچا جائے اور اگر گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ کر لیا جائے۔

بحوالہ: زاد السفر مماحضر

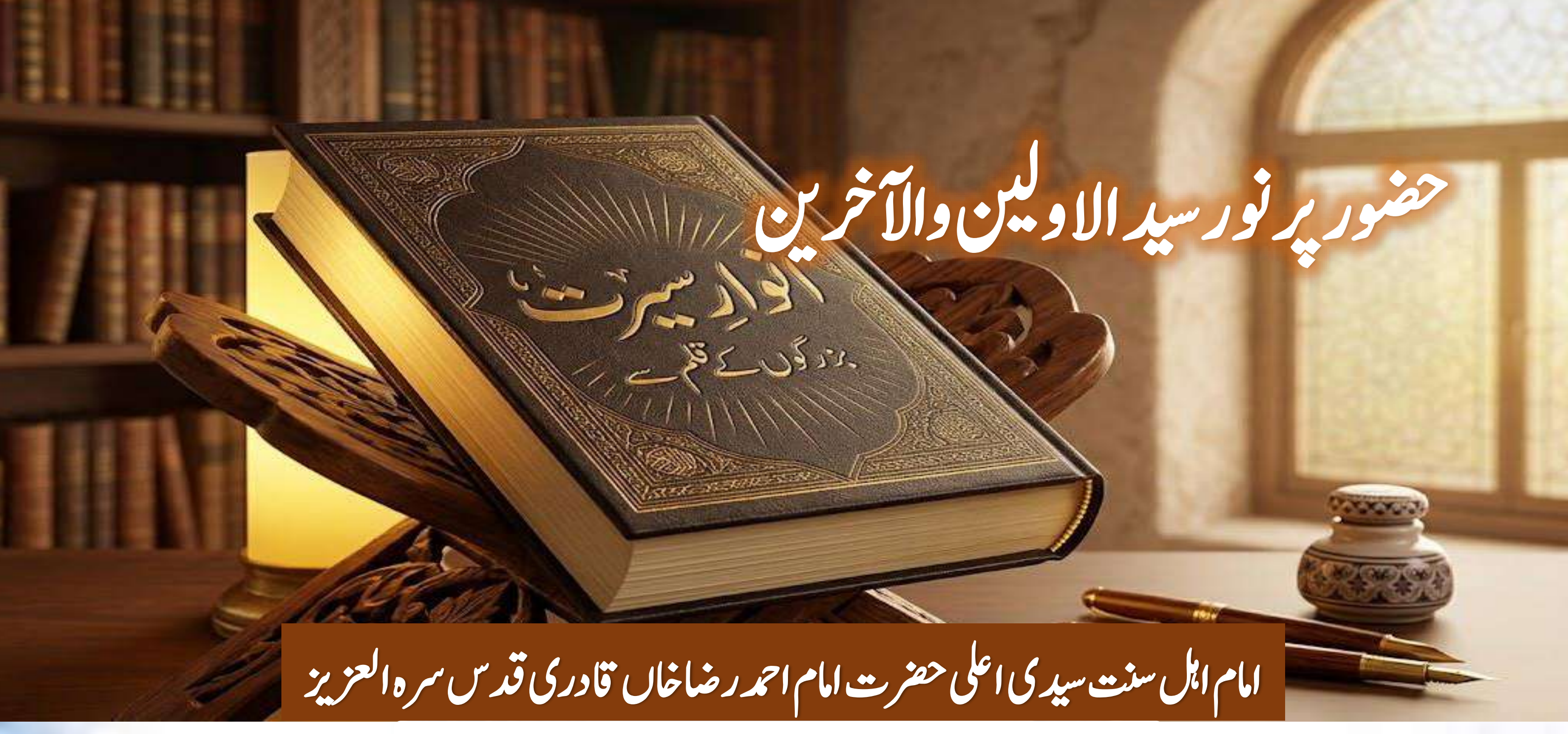

حضور پر نور سید الاولین والآخرین

امام اہل سنت سیدی اعلی حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ العزیز

حضور پر نور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا افضل المرسلین وسید الاولین والآخرین ہونا قطعی، ایمانی، یقینی، اذعانی، اجماعی، ایقانی مسئلہ ہے، جس میں خلاف نہ کرے گا مگر گمراہ، بددین، بندۂ شیاطین، والعیاذ باللہ رب العالمین۔

کلمہ پڑھ کر اس میں شک عجیب ہے، آج نہ کھلا تو کل قریب ہے۔ جس دن تمام مخلوق کو جمع فرمائیں گے، سارے مجمع کا دلہا حضور کو بنائیں گے۔ انبیائے جلیل تا حضرت خلیل، سب حضور ہی کے نیاز مند ہوں گے۔ موافق و مخالف کی حاجتوں کے ہاتھ انہیں کی جانب بلند ہوں گے۔ انہیں کا کلمہ پڑھا جاتا ہوگا، انہیں کی حمد کا ڈنکا بجتا ہوگا۔ جو آج بیاں ہے، کل عیاں ہے۔ اس دن مومن و مقربین، نوربار عشرتوں سے شادیاں رچائیں گے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا﴾ اور جو مبطل و منکر ہیں، دل فگار حسرتوں سے ہاتھ چبائیں گے۔

گروہ معتزلہ کہ ملائکہ کرام کو حضرات انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل مانتے ہے۔ وہ بھی حضور سید العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وعلیہم وعلی آلہ اجمعین کو بالیقین مخصوص و مستثنیٰ جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی حضور پر نور انبیاو مرسلین و ملائکہ مقربین و خلق اللہ اجمعین سب سے افضل و اعلیٰ و بلند و بالا۔ علیہ صلوٰۃ المولیٰ تعالی۔

کلمات علما کرام میں اس کی تصریح، اور فقیر کے رسالہ "اجلال جبرئیل بجعلہ خادماً للمحبوب الجمیل "میں تحقیق و توضیح۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّ حِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ﴾

"اور یاد کر اے محبوب! جب خدا نے عہد لیا پیغمبروں سے کہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تمہارے پاس آئے رسول تصدیق فرماتا ہوا اس کی جو تمہارے ساتھ ہے، تو تم ضرور ہی اس پر ایمان لانا اور بہت ضرور اس کی مدد کرنا۔"

پھر فرمایا: ﴿قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۔ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴾

"کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا؟ سب انبیا نے عرض کی کہ ہم ایمان لائے۔ فرمایا: تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں۔ اب جو اس کے بعد پھرے گا تو وہی لوگ بے حکم ہیں۔"

امامِ اجل ابو جعفر طبری وغیرہ محدثین اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولی المسلمین، امیر المؤمنین، جناب مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے راوی:

﴿لم یبعث اللہ نبیا من اٰدم فمن بعدہ الا اخذ علیہ العھد فی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لئن بعث وھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنّہ ویاخذ العھد بذٰلک علی قومہ﴾

یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر آخر تک جتنے انبیا بھیجے، سب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں عہد لیا کہ اگر یہ اس نبی کی زندگی میں مبعوث ہو تو وہ ان پر ایمان لائے اور ان کی مدد فرمائے، اور اپنی امت سے اس مضمون کا عہد لے۔

اسی طرح حبرُ الائمہ، عالمُ القرآن حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہوا، رواہ ابن جریر وابن عاسکر وغیرہما۔ بلکہ امام بدر زرکشی اور حافظ عماد بن کثیر اور امام الحفاظ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اسے صحیح بخاری کی طرف نسبت کیا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور اس کے مثل امام ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں سدی سے روایت کیا، جیسا کہ امام اجل سیوطی علیہ الرحمہ نے خصائص کبریٰ میں وارد کیا ہے۔اس عہدِ ربانی کے مطابق ہمیشہ حضرت انبیاء علیہم الصلوٰۃ و الثناء نشر مناقب و ذکر مناصب حضور سید المرسلین صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہ و علیھم اجمعین سے رطب اللسان رہتے، اور اپنی پاک مبارک مجالس و محافل ملائک منزل کو حضور کی یاد و مدح سے زینت دیتے، اور اپنی امتوں سے حضور پر نور پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد لیتے۔

یہاں تک کہ وہ پچھلا مژدہ رساں، کنواری بتول کا ستھرا بیٹا، مسیح کلمۃ اللہ ﴿علیہ صلوات اللہ مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد﴾ کہتا تشریف لایا، اور جب سب ستارے روشن مہ پارے مکمنِ غیب میں گئے، آفتاب عالمتاب، ختمیت مآب نے باہزاراں ہزار جاہ و جلال طلوع اجلال فرمایا۔صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیھم اجمعین و بارک وسلم دہرَ الداہرین۔

ابن عساکر، سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی

﴿لم یزل اللہ یتقدم فی النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم الی اٰدم فمن بعدہ ولم تزل الامم تتباشر بہ وتستفتح بہ حتی اخرجہ اللہ فی خیر امۃ ، وفی خیر قرن وفی خیر اصحاب وفی خیر بلد﴾

ہمیشہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں آدم علیہ السلام اور ان کے بعد سب انبیاء علیہم الصلاۃ و السلام سے پیش گوئی فرماتا رہا، اور قدیم سے سب امتیں تشریف آوری حضور کی خوشیاں مناتی اور حضور کے توسل سے اپنے اعداء پر فتح مانگتی آئیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو بہترین امم و بہترین قرون و بہترین اصحاب و بہترین بلاد میں ظاہر فرمایا۔صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

اور اس کی تصدیق قرآن عظیم میں ہے:

﴿وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ٘ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾

یعنی اس نبی کے ظہور سے پہلے کافروں پر اس کے وسیلے سے فتح چاہتے، پھر جب وہ جانا پہچانا ان کے پاس تشریف لایا، تو منکر ہو بیٹھے۔ تو خدا کی پھٹکار منکروں پر۔

علما فرماتے ہیں: جب یہود مشرکوں سے لڑتے دعا کرتے:

﴿اللھم انصرنا علیھم بالنبی المبعوث فی اٰخر الزمان الذی نجد صفتہ فی التورٰۃ﴾

الٰہی مدد دے ان پر صدقہ نبی آخر الزماں کا جس کی نعت ہم تورات میں پاتے ہیں۔ اس دعا کی برکت سے انہیں فتح دی جاتی۔

اسی پیمانے الٰہی کا سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿والذی نفسی بیدہٖ لو ان موسیٰ کان حیّاً الیوم ماوسعہ الا ان یتبعنی﴾

"قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، آج اگر موسیٰ دنیا میں ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کو گنجائش نہ ہوتی۔"

اس کو امام احمد، دارمی اور شعب الایمان میں بیہقی نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے، اور ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، اور لفظ ابو نعیم کے ہیں۔

اور یہی باعث ہے کہ جب آخر الزمان میں حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نزول فرمائیں گے، باآں کہ بدستور منصبِ رفیع نبوت و رسالت پر ہوں گے، حضور پر نور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امتی بن کر رہیں گے، حضور ہی کی شریعت پر عمل کریں گے، اور حضور کے ایک امتی و نائب، یعنی امام مہدی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

﴿کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم ۔ اخرجہ الشیخان؎ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ﴾

"کیسا حال ہو گا تمہارا جب ابن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہو گا۔"

اس کو شیخین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

اور اس عہد واثق کی پوری تائید و توکید حق عز جلالہٗ نے تورات مقدس میں فرمائی۔

امام علامہ، تقی الملۃ والدین، ابو الحسن علی بن عبد الکافی سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک نفیس رسالہ "التعظیم والمنۃ فی التبشیر والتعظیم وَلَتُنْصُرُنَّهُ "لکھا۔

اور اس میں آیت مذکورہ سے ثابت فرمایا کہ ہمارے حضور صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ سب انبیا کے نبی ہیں اور تمام انبیاء و مرسلین اور ان کی امتیں سب حضور کے امتی۔ حضور کی نبوت و رسالت زمانۂ سیدنا ابو البشر علیہ الصلوٰۃ و السلام سے روزِ قیامت تک جمیع خلقِ خدا کو شامل ہے۔

اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد:

﴿وَكُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ﴾

ترجمہ: میں نبی تھا جبکہ آدم علیہ السلام روح و جسد کے درمیان تھے۔ اپنے معنی حقیقی پر ہے۔

اگر ہمارے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت آدم و نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیھم والسلام کے زمانہ میں ظہور فرماتے تو ان پر فرض ہوتا کہ حضور پر ایمان لاتے اور حضور کے مددگار ہوتے۔ اسی کا اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا۔

اور حضور کے نبی الانبیاء ہونے ہی کا باعث ہے کہ شبِ اسراء تمام انبیاء و مرسلین نے حضور کی اقتدا کی، اور اس کا پورا ظہور روز نشور ہوگا، جب حضور کے زیر لواء آدمی و من سواکافۂ رسل و انبیا ہوں گے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اجمعین۔

یہ رسالہ نہایت نفیس کلام پر مشتمل، جسے امام جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ اور امام شہاب الدین قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں، اور ائمۂ مابعد نے اپنی تصانیف میں نقل کیا اور اسے نعمتِ عظمیٰ اور مواہبِ کبریٰ سمجھا۔

بالجملہ مسلمان بہ نگاہ ایمان اس آیت کریمہ کے مفادات عظیمہ پر غور کرے۔ صاف صریح ارشاد فرمارہی ہے کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اصل الاصول ہیں، محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رسولوں کے رسول ہیں۔ امتیوں کو جو نسبت انبیا و رسل سے ہے، وہ نسبت انبیا و رسل کو اس سید الکل سے ہے۔

امتیوں پر فرض کرتے ہیں رسولوں پر ایمان لاؤ، اور رسولوں سے عہد و پیمان لیتے ہیں محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گرویدگی فرماؤ۔ غرض صاف صاف جتارہے ہیں کہ مقصود اصلی ایک وہی ہیں باقی تم سے تابع وطفیلی۔

مقصود ذات اوست دیگر جملگی طفیل

اقول وباللہ التوفیق: میں اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ کہتاہوں کہ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس مضمون کو قرآن عظیم نے کس قدر مہتم بالشان ٹھہرایا، اور طرح طرح سے مؤکد فرمایا۔

اولاً، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء معصومین ہیں، زنہار حکم الٰہی کا خلاف ان سے محتمل نہیں۔ کافی تھا کہ رب تبارک وتعالیٰ بطریقِ امر انہیں ارشاد فرماتا کہ اگر وہ نبی تمہارے پاس آئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ مگر اس قدر پر اکتفانہ فرمایا، بلکہ ان سے عہد وپیمان لیا۔ یہ عہد عہد ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾، "کیامیں تمہارارب نہیں ہوں؟" کے بعد دوسرا پیمان تھا، جیسے کلمۂ طیبہ میں لا اِلٰہ اِلا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ تاکہ ظاہر ہو کہ تمام ماسویٰ اللہ پر پہلا فرض ربوبیتِ الٰہیہ کا اذعان ہے، پھر اس کے برابر رسالت محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان۔

ثانیاً، اس عہد کو لام قسم سے مؤکد فرمایا:

﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾

تم ضرور اس کی مدد کرنا اور ضرور اس پر ایمان لانا۔"

جس طرح نوابوں سے بیعت سلاطین پر قسمیں لی جاتی ہیں۔

امام سبکی فرماتے ہیں شاید سوگند بیعت اسی آیت سے ماخوذ ہوتی ہے۔

ثالثاً: نون تاکید۔ **رابعاً**: وہ بھی ثقیلہ لاکر ثقل تاکید کو اور دوبالا فرمایا۔ **خامساً**: یہ کمال اہتمام ملاحظہ کیجیے کہ حضرات انبیا ابھی جواب نہ دینے پائے کہ خود ہی تقدیم فرماکر پوچھتے ہیں ﴿ءَاَقْرَرْتُمْ﴾ "کیا اس امر پر اقرار لاتے ہو ؟" یعنی کمال تعجیل وتسجیل مقصود ہے۔

سادساً: اس قدر پر بھی بس نہ فرمائی بلکہ ارشاد ہوا

﴿وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ﴾

خالی اقرار ہی نہیں بلکہ اس پر میرا بھاری ذمہ لو۔

سابعاعلیہ یا علی ھذا کی جگہ علی ذلکم فرمایا کہ بعد اشارت عظمت ہو۔ **ثامنا:** اور ترقی ہوئی کہ

﴿فَاشْهَدُوْا﴾

تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ

حالانکہ معاذ اللہ، اقرار کر کے ان پاک مقدس جنابوں سے معقول نہ تھا۔ تاسعا کمال یہ ہے کہ فقط ان کی گواہیوں پر بھی اکتفا نہ ہوئی بلکہ ارشاد فرمایا

﴿وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ﴾

"اور میں خود بھی تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں

عاشرا سب سے زیادہ نہایت کار یہ ہے کہ اس قدر عظیم جلیل تاکیدوں کے بعد باآنکہ انبیا کو عصمت عطا فرمائی، یہ سخت شدید تہدید بھی فرمادی گئی کہ

﴿فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

"اب جو اس اقرار کے بعد پھرے گا، فاسق ٹھہرے گا۔"

اللہ اللہ! یہ وہ اعتنائے تام و اہتمام تمام ہے جو باری تعالیٰ کو اپنی توحید کے بارے میں منظور ہوا کہ ملائکہ معصومین کے حق میں ارشاد کرتا ہے

﴿ وَ مَنْ یَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِیْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ﴾

جو ان میں سے کہے گا میں اللہ کے سوا معبود ہوں اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے، ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں ستمگاروں کو۔

گویا اشارہ فرماتے ہیں جس طرح ہمیں ایمان کے جزوِ اوّل لا إله إلا الله کا اہتمام ہے، یوں ہی جزوِ دوم محمد رسول اللہ سے اعتنائے تام ہے۔

میں تمام جہان کا خدا کہ ملائکہ مُقربین بھی میری بندگی سے سر نہیں پھیر سکتے، اور میرا محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سارے عالم کا رسول و مقتدا کہ انبیاء و مرسلین بھی اس کی بیعت و خدمت کے محیط دائرہ میں داخل ہوئے۔ اس سے بڑھ کر حضور کی سیادت عامہ و فضیلت تامہ پر کون سی دلیل درکار ہے۔

قرآن شریف کے تفصیلی ارشادات و محاورات و نقلِ اقوال و ذکر احوال پر نظر کیجیے تو ہر جگہ اس نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی شان، سب انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بلند و بالا نظر آتی ہے۔

یہ وہ بحرِ زخار ہے جس کی تفصیل کو دفتر درکار۔ علمائے دین، مثل امام ابو نعیم، ابن فورک، قاضی عیاض، جلال سیوطی، و شہاب قسطلانی وغیر ہم و رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان تفرقوں سے بعض کی طرف اشارہ فرمایا۔

1 : خلیل جلیل علیہ الصلوٰۃ والتبجیل سے نقل فرمایا:

﴿وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ﴾

"مجھے رسوانہ کرنا جس دن لوگ اٹھایے جائیں۔"

حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خود ارشاد ہوا:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾

"جس دن خدا رسوانہ کرے گا نبی اور اس کے ساتھ والے مسلمانوں کو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں صحابہ بھی اس بشارت عظمیٰ سے مشرف ہوئے۔

2 : خلیل علیہ الصلوٰۃ السلام سے تمنائے وصال نقل کی:

﴿اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾

"بے شک میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں اور وہ مجھے راہ دے گا۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خود بلا کر عطائے دولت کی خبر دی۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾

"پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا۔

3 : خلیل علیہ السلام سے آرزوئے ہدایت نقل فرمائی:

﴿سَيَهْدِيْنِ﴾

"وہ مجھے راہ دے گا۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خود ارشاد فرمایا: ویھدیک صراطا مستقیما۔ "وہ تمہیں سیدھی راہ دیکھا دے۔

4: خلیل علیہ الصلوۃ والسلام کے لیے آیا فرشتے ان کے معزز مہمان ہوئے

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾

"اے محبوب! کیا تمہارے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی؟

حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا فرشتے ان کے لشکری وسپاہی بنے:

﴿وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾

اور ان فوجوں سے اس کی مدد کی جو تم نے نہ دیکھیں

﴿هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾

تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا اور اس کے بعد فرشتے مدد پر ہیں۔

5: کلیم علیہ الصلاۃ والتسلیم کو فرمایا انہوں نے خدا کی رضا چاہی۔

﴿وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى﴾

اور تیری طرف میں جلدی کر کے حاضر ہوا کہ تو راضی وہ۔

حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بتایا: خدا نے ان کی رضا چاہی۔

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾

﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾

6: کلیم علیہ الصلوۃ والسلام کا بخوف فرعون مصر سے تشریف لے جانا بلفظ فرار نقل فرمایا۔

﴿فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ﴾

"تو میں تمہارے یہاں سے نکل گیا جبکہ تم سے ڈرا۔

حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت فرمانا باحسن عبارات ادا فرمایا:

﴿وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

"اور اے محبوب! یاد کرو جب کافر تمہارے ساتھ مکر کرتے تھے۔

7: کلیم اللہ علیہ الصلوۃ والتسلیم سے طور پر کلام کیا اور اسے سب پر ظاہر فرمادیا۔

﴿وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰى ۝ اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾

"اور میں نے تجھے پسند کیا اب کان لگا کر سن جو تجھے وحی ہوتی ہے بے شک میں ہی ہوں اللہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم رکھ۔ الخ

حبیب صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے فوق السموٰت مکالمہ فرمایا اور سب سے چھپایا۔

﴿فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴾

"اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔

8: داود علیہ السلام کو ارشاد ہوا

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾

"خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ تجھے بہکا دے خدا کی راہ سے،

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں باقسم فرمایا۔

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (3) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى﴾

"کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کہتا وہ تو نہیں مگر وحی کہ القا ہوتی ہے

اب فقیر عرض کرتا ہے وباللہ التوفیق۔

9: نوح وھود علیھما السلام سے دعا نقل فرمائی:

﴿رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ﴾

"الٰہی میری مدد فرما بدلہ اس کا کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا۔

محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خود ارشاد ہوا:

﴿وَّیَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا﴾

"اور اللہ تیری مدد فرمائے گا زبردست مدد

10: نوح وخلیل علیھما الصلوۃ والتسلیم سے نقل فرمایا انہوں نے اپنی امت کی دعائے مغفرت کی۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾

"اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں، باپ کو اور سب مسلمانوں کو جس دن حساب قائم ہو گا۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خود حکم دیا اپنی امت کی مغفرت مانگو۔

﴿وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾

"اور اے محبوب! اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔

11: خلیل علیہ الصلوۃ والسلام کے لیے آیا۔ انہوں نے پچھلوں میں اپنے ذکر جمیل باقی رہنے کی دعا کی:

﴿وَ اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ﴾

اور میری سچی ناموری رکھ پچھلوں میں۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خود فرمایا

﴿وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾

"اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔

اور اس سے اعلیٰ وارفع مزدہ ملا

﴿عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾

"قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں۔

کہ جہاں اولین وآخرین جمع ہوں گے، حضور کی حمد وثنا کا شور ہر زبان سے جوش زن ہو گا

12: خلیل علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا انہوں نے قوم لوط علیہ الصلوۃ والسلام سے رفع عذاب میں بہت کوشش کی

﴿یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾

ہم سے لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔

﴿یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا﴾

اے ابراہیم! اس خیال میں نہ پڑ۔

عرض کہ

﴿اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا﴾

اس بستی میں لوط جو ہے۔

حکم ہوا: ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا﴾

ہمیں خوب معلوم ہیں جو وہاں ہیں۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾

"اللہ ان کافروں پر بھی عذاب نہ کرے گا جب تک اے رحمت عالم تو ان میں تشریف فرما ہے۔

13: خلیل علیہ الصلوۃ والسلام سے نقل فرمایا

﴿رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ﴾

الٰہی میری دعا قبول فرما

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے طفیلیوں کو ارشاد ہوا

﴿ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

"مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔

14: کلیم علیہ الصلوۃ والسلام کی معراج درخت دنیا پر ہوئی۔

﴿نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ﴾

"ندا کی گئی میدان کے دائیں کنارے سے برکت والے مقام میں پیڑ سے

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معراج سدرۃ المنتہٰی و فردوس اعلیٰ تک بیان فرمائی:

﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى﴾

﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾

سدرۃ المنتہٰی کے پاس، اس کے پاس جنت الماویٰ ہے۔

15: کلیم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے وقت ارسال اپنی دل تنگی کی شکایت کی:

﴿وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ﴾

"اور میرا سینہ تنگی کرتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی تو تو ہارون کو بھی رسول کر

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خود شرح صدر کی دولت بخشی اور اس سے منت عظمیٰ رکھی

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴾

"کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا۔

16: کلیم علیہ الصلوۃ والسلام پر حجاب نار سے تجلی ہوئی

﴿ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾

" پھر جب وہ آگ کے پاس آیا، ندا کی گئی کہ برکت دیا گیا وہ جو اس آگ کی جلوہ گاہ میں ہے (یعنی حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام)

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جلوۂ نور سے تجلی ہوئی اور وہ بھی غایت تفخیم و تعظیم کے لیے بالفاظ ابہام بیان فرمائی گئی:

﴿اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى﴾

"جب چھا گیا سدرہ پر جو کچھ چھایا۔

ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، بزار، ابو یعلیٰ، بیہقی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث طویل معراج میں راوی:

﴿ثم انتھی الی السدرۃ فغشیھا نور الخلاق عز وجل فکلمہ تعالیٰ عند ذلک فقال لہ سل ﴾

پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے، خالق عزوجل کا نور اس پر چھایا، اس وقت اللہ جل جلالہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کلام کیا اور فرمایا: مانگو۔

17: کلیم علیہ الصلوۃ والتسلیم سے اپنے بھائی کے سوا سب سے براءت و قطع تعلق نقل فرمایا۔ جب انہوں نے اپنی قوم کو قتال عمالقہ کا حکم دیا اور انہوں نے نہ مانا۔ عرض کی

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾

الٰہی! میں اختیار نہیں رکھتا مگر اپنا اور اپنے بھائی کا، تو جدائی فرمادے ہم میں اور اس گنہگار قوم میں۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ظل وجاہت میں کفار تک کو داخل فرمایا

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِیْهِمْ﴾

"اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب! تم ان میں تشریف فرما ہو، قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اس جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں۔

یہ شفاعت کبریٰ ہے کہ تمام اہل موقف موافق و مخالف سب کو شامل۔

18: ہارون و کلیم علیہم الصلوۃ والتسلیم کے لیے فرمایا: انہوں نے فرعون کے پاس جاتے اپنا خوف عرض کیا:

﴿رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَاۤ اَوْ اَنْ یَّطْغٰى﴾

اے ہمارے رب! بے شک ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا شرارت سے پیش آئے۔

اس پر حکم ہوا

﴿لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾

ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں، سنتا اور دیکھتا۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خود مژدۂ نگہبانی دیا:

﴿وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾

اور اللہ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے

19: مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کے حق میں فرمایا ان سے پرائی بات پر یوں سوال ہو گا:

﴿یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے کہہ دی تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا ٹھہرالو۔

معالم میں ہے اس سوال پر خوف الٰہی سے حضرت روح اللہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ کا بند بند کانپ اٹھے گا اور ہر بن موسے خون کا فوارہ بہے گا پھر جواب عرض کریں گے جس کی حق تعالیٰ تصدیق فرماتا ہے۔ حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کا قصد فرمایا اور منافقوں نے جھوٹے بہانے بنا کر نہ جانے کی اجازت لے لی۔ اس پر سوال تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی ہوا مگر یہاں جو شان لطف و محبت و کرم و عنایت ہے قابل غور ہے ارشاد فرمایا:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾

اللہ تجھے معاف فرمائے، تونے انہیں اجازت کیوں دے دی۔

سبحان اللہ! سوال پیچھے ہے اور محبت کا کلمہ پہلے۔ والحمد للہ رب العالمین

20: مسیح علیہ الصلوۃ والسلام سے نقل فرمایا، انہوں نے اپنے امتیوں سے مدد طلب کی:

﴿فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾

پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر پایا، بولا کون میرے مدد گار ہوتے ہیں اللہ کی طرف، حواریوں نے کہا ہم دین خدا کے مدد گار ہیں۔

حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت انبیا و مرسلین کو حکم نصرت ہوا:

﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾

تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا

غرض جو کسی محبوب کو ملا وہ سب اور اس سے افضل و اعلیٰ انہیں ملا، اور جو انہیں ملا وہ کسی کو نہ ملا

حسن یوسف ، دم عیسیٰ ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

آپ یوسف علیہ السلام کا حسن، عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک اور روشن ہاتھ رکھتے ہیں، جو کمالات وسارے رکھتے ہیں آپ اکیلے رکھتے ہیں۔ (ماخوذ از فتاویٰ رضویہ جلد 30)

تجلیاتِ سیرت

اکابرین کے قلم سے

رسالت محمدی کا عقلی ثبوت

قائد اہل سنت، رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری صاحب رحمہ اللہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آسان اور واضح سے واضح بات بھاری بھرکم الفاظ کے نیچے کچھ اس طرح دب جاتی ہے کہ مدتوں ہم اس کی اہمیت سے مرعوب رہتے ہیں اور خواہ مخواہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ کوئی بہت باریک اور پیچیدہ بات ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارے ذہن کا اس مسئلے میں بھی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ عقل سلیم کے لیے رسالتِ محمدی کا عقلی ثبوت دنیا کی سب سے واضح اور مانوس حقیقت ہے۔

زحمت نہ ہو تو چودہ سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کے اس تاریک دور میں قدم رکھیے، جب کہ خدائے واحد کا ایک پرستار روئے زمین پر نہیں تھا۔ پھر انسانوں پر ابدی سعادتوں کا دروازہ کھلا، رحمتوں کا سویرا ہوا، روح کی بہاروں کا موسم آیا، گل قدس کی خوشبو اڑی اور بہ ہزار جاہ و جلال فاران سے خورشید رسالت کی پہلی کرن چمکی۔

صدیوں کے بعد پھر حرم کی سرزمین سجدوں سے آباد ہو گئی۔ کہاں روئے زمین پر ایک بھی خدا کا ماننے والا نہیں تھا اور اب صرف عرفات کے میدان میں ایک لاکھ فرزندان توحید اپنی پیشانیوں میں سجدۂ بندگی کا اضطراب لیے کھڑے تھے اور خدا کا آخری رسول ان پر رحمتوں کے پھول برسا رہا تھا۔ رسالت محمدی کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے والے صرف اتنی بات تاریخ سے دریافت کرنے کی زحمت فرمائیں کہ ماننے والوں نے پہلے خدا کو مانا یا اس کے رسول کو؟

تاریخ واضح طور پر شہادت دے گی کہ پہلے سید عربی ﷺ کے آگے لوگوں کے دل جھکے۔ اس کے بعد ان کے سروں کو خدا کا سجدہ نصیب ہوا۔ ماننے والوں نے پہلے رسالت محمدی کا اقرار کیا، اس کے بعد توحید الٰہی کی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

اب یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ پہلے پہل جن لوگوں نے رسالت کا اقرار کیا، حق کی شناخت کے لیے ان کے پاس سوائے عقل سلیم کے اور کوئی مشعل نہیں تھی۔ اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ عقل کی ساری رہنمائی رسول کو ماننے تک تھی۔ رسول کے مان لینے کے بعد عقل کو درمیان سے ہٹ جانا پڑا۔ اب ماننے والوں کے سامنے صرف رسول کی زبان تھی۔ وہ جب بھی حرکت میں آئی، یقین کا سر جھک گیا۔

اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسانوں کو رسالت محمدی ﷺ کی شناخت سب سے پہلے عقل ہی کے ذریعہ ہوئی۔ عقل ہی کے مشورے پر دل جھکے۔ اس کے بعد اعتراف حق کے لیے زبان کھلی۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ عقل کے پاس وہ کون سا معیار ہے، جس پر وہ رسالت و نبوت کا دعویٰ پرکھتی ہے اور پورا اترنے کے بعد دل کی ساری کائنات کو قدموں پر ڈال دیتی ہے، تو اس کی تشریح مفصل طور پر ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

عقل سلیم کا کہنا ہے کہ رسول کی صحیح شناخت تین باتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ان تین باتوں کے ثابت ہو جانے کے بعد کسی دور کی بھی عقل رسول کو ماننے سے ہرگز انکار نہیں کر سکتی۔

رسول کی شناخت کا پہلا عقلی ذریعہ

یہ ہے کہ عام انسانی زندگیوں کے درمیان رسول کی زندگی ماحول کی تاثیرات سے اس درجہ بالاتر اور معصوم و ممتاز ہوتی ہے کہ اسے دیکھتے ہی دنیا کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی معمولی انسان کی زندگی نہیں ہے، اس کے پیچھے ضرور کوئی آسمانی طاقت ہے، جو پس پردہ کارساز ہے۔

اس رخ سے جب ہم سرور کائنات محمد عربی ﷺ کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہوش اڑنے لگتا ہے۔ اور عالم حیرت میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

زندگی کا پہلا رخ

تاریخ کی گہرائی میں اترنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہونے والا رسول ایک ایسے خاندان میں جنم لیتا ہے، جہاں ہر طرف بتوں کی فرمانروائی ہے۔ پجاریوں کی سیادت وافسر کا منصب ہی گھر کا پیشہ ہے۔ آنکھیں کھولتا ہے تو سارا ماحول اخلاقی رذائل، روحانی کثافت اور شر وفساد کی غلاظتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ کہیں بھی قدم رکھنے کی کوئی صاف جگہ نظر نہیں آتی۔

بچپن ہی میں سر سے والدین کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ گرد وپیش میں شائستہ تربیت کا کوئی چشمۂ صافی نہیں ہے، جہاں وہ اپنا حلق بھی تر کر سکے۔ کسی درسگاہ سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ اکتسابی علم کے ذریعہ خیر وشر کو سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہو۔ ایسے پر آشوب، بلاخیز اور تاریک ماحول میں وہ ایام طفلی کا معصوم دور گزارتا ہے۔ شعور کی منزل سے آشنا ہوتا ہے۔

شباب کی خاردار وادی میں قدم رکھتا ہے، یہاں تک کہ چالیس سال کی طویل مدت وہ صحراؤں، غاروں اور دریاؤں کی بے خطر تنہائیوں میں نہیں، گمراہوں، غارت گروں، ستم شعاروں، مے نوشوں، بدکاروں، فتنہ پروروں اور جرائم پیشہ عناصر کی بھیڑ میں بسر کرتا ہے، لیکن عقل اور تاریخ دونوں محوِ حیرت ہیں کہ پانی میں رہتے ہوئے بھی نہ اس کا جسم بھیگتا ہے، نہ جیب ودامن میں کہیں نمی نظر آتی ہے۔

نشست وبرخاست، رفتار وگفتار، سیرت واطوار، اخلاق وعادات، افکار وخیالات اور عبادت ومعاملات میں چالیس سال کی طویل صحبتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لاکھوں زندگیوں کے بیچ میں وہ تنہا ایک نرالی، منفرد، بے مثل اور عام سطح سے بالاتر زندگی گزار کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی اخلاقی برتری، کردار کی راستی اور معنوی تقدس کے آگے ماحول کی گردنیں جھکنے لگتی ہیں۔ اور بالآخر ایک دن وہ سارے قبائل کی نگاہوں کا مرکز عقیدت بن جاتا ہے۔

یہاں تک کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اچانک ایک پیغمبر کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ مجھے سجدہ کرو، میری عظمتوں کے آگے جھک جاؤ، وہ بار بار صرف یہ کہتا ہے کہ پتھر کے تراشے ہوئے بت تمہارے خدا نہیں ہیں۔ خدا وہ ہے، جو ان پتھروں، درختوں اور دریاؤں کا

خالق ہے۔ پرستش کا وہی مستحق ہے۔ پیشانی کے سجدے اسی کو زیب دیتے ہیں۔ اپنی انسانیت کا سب کو اونچا اعزاز رزائل کے قدموں میں رائیگاں مت کرو۔

بس اتنی سی بات پر ہر طرف آگ لگ جاتی ہے۔ سارا ماحول سلگنے لگتا ہے۔ جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اب گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ رات کی تنہائی کے سوا کوئی انیس زندگی نظر نہیں آتا۔ رفتہ رفتہ حالات کی برہمی نقطۂ انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ تلواریں اٹھتی ہیں، وار خالی جاتا ہے۔ قتل کی سازش ہوتی ہے، تار بکھر جاتے ہیں۔ قید کرتے ہیں، زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔

ہزار مخالفت، ہزار تصادم اور ہزار رکاوٹوں کے باوجود سیل نور کی طرح حقیقت کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ چڑھتے ہوئے سورج کا فروغ دیکھ کر جب مرعوب ہو جاتے ہیں، تو کفر کے نمائندے خوشامد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

محمد! تم اپنی ذات سے سارے قبیلوں میں ہر دل عزیز ہو۔ ہمارے معبودوں کے خلاف آواز اٹھا کر اپنی ہر دل عزیزی کو صدمہ مت پہنچاؤ۔ تم اگر حکومت کا اقتدار چاہتے ہو تو سارا عرب تمہیں بادشاہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ تمہیں اگر دولت کی خواہش ہے تو سارے قبائل کا سونا ہم تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے۔ اور اگر تم اجازت دو تو عرب کی سب سے حسین اور زہرہ جمال دوشیزہ تمہارے حرم سرا کی زینت بنادی جائے۔

محمد! یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو سکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تم اپنے دعویٰ پیغمبری سے دستبردار ہو جاؤ اور اپنے دین کی تبلیغ بند کر دو۔

پیغمبر ﷺ ناقابل شکست عزم ویقین کے تیور میں جواب دیتے ہیں: پیغمبر اپنے منصب کی دیانت کو کسی قیمت پر نہیں بیچتا۔ مجھے جادہ حق سے ہٹانے کے لیے جو معاوضہ تم نے پیش کیا ہے، اس کی تو وقعت ہی کیا ہے۔ تم اگر داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دو، جب بھی میں دین حق کی تبلیغ اور اپنے منصب کے فرائض سے قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ خدا میرے ساتھ ہے، میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری آواز پر فتح پانا انسانوں کے بس کی بات نہیں۔

رسالت محمدی کا عقلی ثبوت

چونکہ اس وقت میرا موضوع سخن تاریخ اسلام بیان کرنا نہیں ہے، اس لیے آگے کے واقعات کسی دوسرے لمحے پر چھوڑ تا ہوں۔ اس وقت مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ پوری داستان میں دراصل یہ نکتہ سب سے زیادہ قابل غور ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو شکست دینے کے لیے اہل مکہ نے ایک سے ایک حربہ استعمال کیا۔ بائیکاٹ کی مہم چلائی، وطن سے بے وطن کیا، ایذائیں دیں، پتھر برسائے، جنگ کیا، خون بہائے، خود بھی قتل ہوئے، دوسروں کو بھی شہید کیا۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن کسی مائی کے لال کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھری مجلس میں کہہ دیتا:

محمد! تمہاری پیغمبری کا یہ ڈھونگ ملک شام، فارس، اور ان دور دراز علاقوں میں تو چل سکتا ہے، جہاں کے لوگ تمہاری اخلاقی کمزوریوں، بشری فروگذاشتوں اور کردار کی خامیوں سے ناواقف ہیں، لیکن یہ مکہ ہے، یہاں تمہاری زندگی کا ایک ایک خدوخال نظر میں ہے۔ ہم تمہاری ان کمزوریوں سے پوری طرح باخبر ہیں، جن کا پیوند ایک پیغمبر کی زندگی کے ساتھ کسی طرح جوڑا نہیں جاسکتا ہے۔ ہم نہ بھی تمہیں جھٹلائیں، جب بھی تمہاری زندگی کے سیاہ دھبے بجائے خود تمہاری تکذیب کے لیے کافی ہیں۔

اور سن لیا جائے کہ اعتراف صداقت کی یہ آخری منزل نہیں ہے۔ اس کے آگے ایک اور منزل بھی ہے، جہاں جلالت حق کی ہیبت سے عقل کو پسینہ آنے لگتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دشمنی میں انسان صحیح اور غلط الزام کا فرق اٹھا دیتا ہے۔ مانا کہ میرے سرکار ﷺ کی زندگی ایک روشن آئینے کی طرح بالکل بے داغ و بے غبار تھی اور یہ بھی تسلیم کہ بشری کمزوریوں کا کوئی واقعہ دشمنوں کے علم میں نہیں تھا، لیکن اپنے حریف کو شکست دینے اور رسوا کرنے کے لیے دنیا میں کیا کوئی واقعہ تراشا نہیں جاتا؟ اور کیا من گھڑت الزامات نہیں لگائے جاتے؟ اور خاص کر ایسے حالات میں جب کہ ایک پیغمبر کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے الزام تراشنا تلوار اٹھانے سے زیادہ آسان تھا۔ عرب کے سخن وروں کا سارا گروہ، ہم زبان ہی تھا، آن کی آن میں پیغمبر کے خلاف فرضی داستانوں کا دفتر تصنیف ہو سکتا تھا۔

لیکن عظمت خداداد کو عقیدتوں کا خراج عقیدت پیش کرو کہ سید عربی ﷺ کی طیب وطاہر زندگی کا آفتاب اس نقطۂ عروج پر تھا کہ سیاہی کا پیوند جوڑنے کے لیے کہیں سے بھی کوئی گھنائی ہوئی کرن انہیں نہیں مل سکی۔ ویسے اڑانے کے لیے خاک اڑا سکتے تھے، لیکن دشمن اس کے لیے بھی کبھی تیار نہیں تھے کہ اپنی ہی آنکھیں غبار سے بھر جائیں۔

زندگی کا دوسرا رخ

سرکار دوعالم ﷺ کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے، جو سپرد قلم ہوا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ فطرت انسانی کے جس رخ سے دیکھو میرے سرکار کی زندگی اتنی جامع اور مکمل نظر آئے گی کہ ہر دور کے انسانوں کے لیے وہ بہترین نمونۂ عمل بن سکتی ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا، بلکہ زندگی کی نجات کے لیے اس کے سوا اور کوئی نمونہ ہی نہیں ہے ۔چودہ سو برس کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی انسانی زندگی کے لیے اس سے بہتر سانچہ نہ آج تک تیار ہو سکا ہے، نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

اور حیرت انگیز تماشہ یہ ہے کہ زمانے کے انقلابات نے ہزاروں کروٹیں بدلیں، طبیعتوں اور مزاجوں کے پیمانے بنتے اور بگڑتے رہے، خطہ ارضی مختلف رنگ وروپ، مختلف تہذیب وتمدن اور مختلف انداز معاشرت میں تقسیم ہوتا رہا، لیکن محمد ﷺ کی تنہا ایک زندگی سب کو راس آئی، سب کی ضرورتوں کی کفیل ہوئی، سب کے لیے سازگار رہی اور اپنی رہنمائی میں سب کو زندگی کی منزل مقصود تک پہنچا آئی۔

ایک گدا سے لے کر بادشاہ تک، سپاہی سے لے کر سالار تک، عورت سے لے کر مرد تک، بچے سے لے کر بوڑھے تک، غلام سے لے کر آقا تک، عربی سے لے کر عجمی تک، دہقانی سے لے کر شہری تک، اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک، سبھی اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے رہے کہ زندگی کا یہ پیمانہ میرے لیے تراشا گیا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا یہ نقشہ سامنے رکھ کر اب میں عقل سلیم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی محیر العقول اور جامع وکامل زندگی کیا خدا کے رسول کے سوا اور کسی عام بشر کی ہو سکتی ہے؟ کیا عالمی تاریخ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کسی کی ایسی زندگی پیش کی جا سکتی ہے؟

"میں جانتا ہوں کیا وہ کہے گی جواب میں"

رسول کی شناخت کادوسرا عقلی ذریعہ

رسول کی شناخت کادوسرا عقلی ذریعہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے تعلقات کی سطح عام انسانوں سے بہت اونچی ہوتی ہے۔ وہ کائنات میں خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عام بندوں کی طرح بے اختیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کارخانہ ہستی میں تصرفات کی قدرت بھی اپنے ہمراہ لے آتا ہے۔

تصرفات سے مسلح ہو کر آنا دو وجہوں سے ضروری ہے۔

پہلی وجہ

وجہ یہ ہے کہ اصول فطرت کے مطابق کوئی انسان اپنے برابر اور ہمسر کی اطاعت نہیں کرتا۔ اطاعت اسی کی کرتا ہے، جس میں برتری کی کوئی وجہ ہوتی ہے، یا جسے وہ اپنا بڑا سمجھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ رسول پاک کو ایسے کمالات اور قدرت واختیار سے مسلح کر کے بھیجا جائے کہ کوئی انسان اس کی ہمسری نہ کر سکے اور اس کے آگے جھک کر اس کی اطاعت کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو۔

دوسری وجہ

یہ ہے کہ خداشناسی کی راہ میں سب سے بڑا حجاب مادی طاقتوں سے مرعوبیت کا ہے۔ کیونکہ دنیا میں پہلے پہل انسان کی نظر انہیں طاقتوں سے روشناس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ کھولتے ہی انسان نے سورج کو دیکھا، دریاؤں کو دیکھا، پتھروں کی سخت چٹانوں کو دیکھا، قد آور اور گھنے درختوں کو دیکھا، آگ کے ہولناک شعلوں کو دیکھا، بادشاہوں کے جلال و جبروت کو دیکھا اور ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔ احساسِ کمتری میں انہیں طاقتوں کو کائنات کی اصل سمجھ بیٹھا اور بالآخر انہی کے آگے اپنا ماتھا ٹیک دیا۔

حالانکہ یہ تمام طاقتیں جس طاقت کی کرشمہ تھیں، وہ حجابات کے پیچھے تھیں، لیکن چونکہ وہ پیکر محسوس میں نہیں تھی، اس لیے انسان کی نظر اسے نہیں دیکھ سکی۔ ان حالات میں خدا کا رسول آتا ہے۔ آمد کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو مادی طاقتوں کی پرستش سے روک دے اور اس کا سر اس طاقت کے آگے جھکا دے، جو پس پردہ ان تمام طاقتوں کی خالق وپروردگار ہے۔

عقل کہتی ہے کہ جب تک ذہن کی غیر واقعی ہیبت اور دلوں کی غلط گرویدگی کا طلسم نہیں ٹوٹ جاتا، پیشانیوں کو کسی مانوس آستانۂ عقیدت سے ہٹانا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک رسول اپنے ساتھ ایسی کائنات گیر قدرت لے کر آئے، جس کے ذریعہ وہ ان مصنوعی خداؤں کی طاقت کا بھانڈا پھوڑ دے۔ جب چاہے ان کا طبعی نظام بدل دے، ان کی قوت تاثیر سلب کرلے اور انہیں اپنی مرضی کا غلام بنا کر رکھے۔

پرستار بھی اپنے خداؤں کی بے چارگی، بے بسی و بے طاقتی اور گھٹنا ٹھیک کر فرمان برداری کا تماشہ دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ جب رسول کی قدرت وطاقت کا یہ حال ہے، تو اس کے بھیجنے والے کی کیا شان ہو گی؟

اس لیے دراصل پرستش کے قابل وہی طاقت ہے، جس کی نمائندگی ایک رسول کر رہا ہے، کہ مغلوب طاقت پوجنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔

زندگی کا تیسرا رخ

اتنی تمہید کے بعد یہ حقیقت ہم ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ اس رخ سے بھی سرکار کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہم جائزہ لیتے ہیں، تو ان کی پیغمبرانہ طاقت و قدرت کے نہایت حیرت انگیز اور دلربا مناظر سامنے آتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اشارے پر ساری کائنات گردش کر رہی ہے۔۔ نگاہ اٹھ جاتی ہے تو مادی طاقتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔۔ کرۂ زمین پر کھڑے ہو کر انگلی کا اشارہ کرتے ہیں تو آسمان پر روشنی بکھیرتا ہوا ماہتاب دو ٹکڑے ہو جاتا ہے اور ابروئے خمدار کی خوشنودی کے لیے آفتاب ڈوبتے ہوئے واپس پلٹ آتا ہے۔۔ راہوں سے گزرتے ہیں تو پتھروں کی بے جان دنیا درود و سلام کا خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔۔ درختوں کو آواز دیتے ہیں تو وہ ایک اطاعت شعار خادم کی طرح دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں۔۔ اشارہ کر دیتے ہیں تو واپس ہو جاتے۔۔ چٹانوں پہ قدم رکھتے ہیں تو کف پا کا نقش اتر آتا ہے۔۔ پہاڑوں پر تشریف لے جاتے ہیں تو کہساروں کا دل خوشی سے جھومنے لگتا ہے۔۔ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ حملہ آور کے لیے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔۔ کھارے کنوؤں میں لعاب دہن ڈال دیتے ہیں تو وہ ہمیشہ کے لیے چشمہ شیریں بن جاتا ہے۔۔ سنگ ریزوں کو ہاتھ لگا دیتے ہیں تو جان پڑ جاتی ہے۔۔ اشارہ فرما دیتے ہیں تو کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ کبھی برہم ہو کر مشت غبار اڑا دیتے ہیں تو ہر طرف

طوفان امڈنے لگتا ہے۔۔ اور جب کبھی مائل بہ کرم ہوتے ہیں تو ایک قطرہ آب چشمۂ سیال بن جاتا ہے۔ مسکرا دیتے ہیں تو نور کی کرن پھوٹی ہے۔۔ چلتے ہیں تو راستوں میں عطر برستا ہے۔۔ کسی کو چھو دیتے ہیں تو مہکنے لگتا ہے۔۔ ہاتھ رکھ دیتے ہیں تو شفا ہو جاتی ہے۔۔ نظر پڑ جاتی ہے تو دلوں کے آئینے چمک اٹھتے ہیں۔۔ زبان حرکت میں آتی ہے، تو غیب کے اسرار کھلتے ہیں۔۔ رخ پھیر لیتے ہیں، تو حیات فانی اداس ہو جاتی ہے۔۔ نگاہوں سے دور ہوتے ہوئے بھی پیٹھ پیچھے کی خبر رکھتے ہیں۔۔ جو چاہتے ہیں، وہ ہو جاتا ہے۔۔ جو سوچتے ہیں، وہ ڈھل جاتا ہے۔۔ جس طرف اشارہ کر دیتے ہیں، اس پر مہر لگ جاتی ہے۔۔ جو کہہ دیتے ہیں، وہ دستور بن جاتا ہے۔۔۔۔ غرض یہ کہ جس کی ادا ادا سے، بات بات سے، ایک کائنات گیر اقتدار، ایک آسمانی بادشاہی، ایک بااختیار نمائندگی اور ایک محبوب و دل آویز شخصیت کا جلال و جمال ہمہ وقت برستا رہتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات کی یہ ناتمام فہرست جو ہم نے پیش کی ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایات ہیں اور روایات کا واقع کے مطابق ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ عقل انسانی کے پاس اگر کوئی کسوٹی ہے، جس پر وہ روایت کو پرکھتی ہے اور پورا اترنے کے صحت کا حکم لگاتی ہے، تو ہم یہ مرحلے طے کرنے کے لیے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ تیار ہیں۔ عقل پرکھے اور حکم لگائے۔ ہمیں فخر ہے کہ جن وسائل اور ذرائع سے ہم تک یہ روایت پہنچی ہیں، ان سے زیادہ قابل اعتماد اور ثقہ ذرائع آج تک دنیا کی کسی روایت یا کسی واقعہ کو میسر نہیں آیا۔ لیکن یہ دعویٰ بہر حال اپنی جگہ پر ناقابل تردید ہے کہ ان واقعات و روایات کو صحیح مان لینے کے بعد عقل یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گی کہ اس نشان کا آدمی سوائے رسول کے کوئی عام انسان ہرگز نہیں ہو سکتا۔

رسول کی شناخت کا تیسرا عقلی ذریعہ

رسول کی شناخت کا تیسرا عقلی ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ خدا کی کوئی "آسمانی کتاب" ہوتی ہے۔ رسول کے ساتھ آسمانی کتاب کا ہونا دو وجہوں سے ضروری ہے۔

پہلی وجہ: یہ ہے کہ رسول خدا کی طرف سے بندوں کی ہدایت کے لیے آتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس کے پاس ایک ہدایت نامہ کا ہونا ضروری ہے، جس کے مطابق وہ بندوں کی رہنمائی کرے، انہیں راہ راست پر چلائے اور خدا کے احکامات اور اس کی مرضی سے انہیں روشناس کرے۔

عقل کہتی ہے کہ آسمان سے نازل شدہ کسی بھی الہامی کتاب میں درج ذیل امور کا ہونا ضروری ہے۔

کیوں ضروری ہے، یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے، لیکن آنے والے مباحث کی روشنی میں ذرا بھی ذہن پر زور دیا جائے تو "کیوں" کا جواب بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

رسالت محمدی کا عقلی ثبوت

ان امور کی نشاندہی جن کا کسی بھی الہامی کتاب میں ہونا ضروری ہے:

1: عبادات اور جملہ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق احکام و قوانین اور مفید ہدایات، جن کا تعلق بدن اور جوارح سے ہے۔

2: عقائد، اصول اور ایمانیات، جن کا تعلق قلبی تصدیق سے ہے۔

3: خدا کی ذات وصفات سے متعلق واضح بیانات۔

4: عالم آخرت اور جزا وسزا کی تفصیلات۔

5: گزشتہ نبیوں، رسولوں، ان کی کتابوں اور قوموں کے تذکرے۔

6: جس رسول پر کتاب نازل ہوئی، اس کے متعلق ہدایات۔

7: خود اس نازل شدہ آسمانی کتاب کے متعلق تذکرہ۔

8: جس دور میں وہ کتاب نازل ہوئی ہے، اس دور کے لوگوں کے حوالے سے تذکرہ۔

9: آئندہ کے واقعات اور اسرار غیب کی اطلاع۔

10: کائنات کی تخلیق، آفرینش کی حکمت و مصلحت، آغاز وانجام اور درمیانی مراحل کا بیان۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ رسول اس ظاہری دنیا میں موجود نہ رہے، جب بھی بندوں کو ایک مستند ذریعہ سے اپنے

متعلق خدا کی مرضی اور اس کی ہدایت واحکامات کا علم ہوتا رہے اور خدا شناسی کے لیے بیک واسطہ اس کی زندہ نشانی کائنات کے ہر دور میں انسانوں کے درمیان موجود رہے۔

اتنی تمہید کے بعد مدعائے نگارش یہ ہے کہ اس رخ سے جب بھی ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں ان کے ہمراہ قرآن نامی ایک الہامی کتاب نظر آتی ہے۔

ایک جامع اور مکمل آسمانی کتاب کے لیے عقل جن امور کی نشاندہی کرتی ہے، وہ سارے امور قرآن میں واضح طور پر موجود ہیں۔ ان امور میں سے بعض امور تو وہ ہیں، جو ہدایات و قوانین کی کسی بھی کتاب کے لازمی اجزا کی حیثیت سے ضروری ہیں اور جن کے بغیر اس موضوع کی کوئی بھی کتاب جامع اور مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

اور بعض امور وہ ہیں، جو سوائے خدا کی کتاب کے کسی بھی انسانی کتاب میں نہیں مل سکتے اور جہاں کسی طرح بھی انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر آئندہ واقعات کی اطلاع اور اسرار غیب کی نقاب کشائی، زمانہ قبل تاریخ کی طرح تخمینی نہیں، چشم دید خبریں، کائنات کی کیفیت تخلیق و آفرینش کے رموز واسرار اور عالم ہستی کے آغاز وانجام کی تفصیلات، خدا کی ذات وصفات کے متعلق واضح اطلاعات، عالم آخرت کی مفصل نشاندہی، قدرتی بناوٹوں کی حقیقت کے حوالے سے قرآن کا انداز بیان۔

یہ ہیں وہ امور، جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور جن کا کسی انسانی کتاب میں ہونا تو درکنار، اس کے علم ہی کا انسان کے پاس سوائے خدا کے اور کوئی ذریعہ نہیں۔

واضح رہے کہ یہی وہ منزل تھی، جہاں سخنوران عرب کو پسینہ آگیا اور وہ سب مل کر بھی قرآن کی ایک مختصر سی صورت کی پیش کرنے سے قطعاً عاجز و قاصر ہے۔

قرآن انہیں چیلنج پہ چیلنج دیتا رہا کہ اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے کہ میں خدائے برتر کی کتاب نہیں، کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہوں، تو تم بھی انسان ہو، میری زبان بھی وہی ہے، جس میں تم بہت بڑے ادیب اور مانے ہوئے سخنور سمجھے جاتے ہو، بنالاؤ میری آیتوں کی طرح کوئی بھی عربی عبارت۔

انسان خدائی بناوٹوں کی نقل نہیں اتار سکتا، لیکن انسانی بناوٹوں کی نقل اتارنا اس کے لیے کیا مشکل ہے!

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہ اس وقت کے سخنوران عالم اس چیلنج کا جواب دے سکے، نہ چودہ سو برس کی طویل مدت میں روئے زمین پر کوئی جواب دینے والا پیدا ہوا۔

اور پھر نہ صرف یہ کہ "قرآن ثانی" پیش کرنے سے دنیا عاجز رہی، بلکہ قرآن کے حرم میں کہیں سے نقب لگانے کی بھی اسے کوئی گنجائش نہیں مل سکے گی، کیونکہ قرآن صرف سفینوں میں نہیں، سینوں میں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

ہزار محاسن، ہزار اوصاف اور ہزار معجزانہ کمالات کے باوجود، یہ عین ممکن ہے کہ کوئی قرآن پر ایمان نہ لائے، لیکن یہ قطعاناممکن ہے کہ اس کے معجزانہ کمالات، معجزانہ محاسن اور معجزانہ اوصاف کی موجودگی میں کوئی اس کے خدا کی کتاب ہونے سے انکار کردے۔

اسی طرح ازروئے عقل یہ بھی ذہن وفکر کا کھلا ہوا تضاد ہے کہ اتنی بات تسلیم کرلی جائے کہ دنیا کو خدا کی یہ کتاب محمد ﷺ کے ذریعہ ملی، لیکن محمد ﷺ کو خدا کا رسول تسلیم کرنے سے انکار کردیا جائے، حالانکہ دونوں باتیں قطعاایک ہیں، صاحب کتاب ہونے اور رسول ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

پھر میں ایک بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار آسان نہیں ہے۔ یا تو وہ ثابت کرے کہ قرآن جیسی کتاب انسان تصنیف کرسکتا ہے، یا یہ ثابت کرے کہ معاذ اللہ محمد ﷺ پر یہ کتاب نازل ہی نہیں ہوئی۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ عقل نہ وہ ثابت کرسکتی ہے اور نہ یہ ثابت کرسکتی ہے اور اگر وہ کچھ کرسکتی ہے، تو صرف یہ کہ رسالت محمدی ﷺ کی روشن حقیقت کے آگے اپنا سر نیاز خم کردے۔ (بحوالہ موسوعہ اسلامیہ)

دنیا و آخرت میں حضور کی سیادت

تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری صاحب رحمہ اللہ

علامہ خرپوتی نے آپ ﷺ کی سیادت دارین کا ذکر بہت ہی واضح انداز میں کیا ہے، فرماتے ہیں کہ حضور کی دنیا میں سیادت تو یہ ہے کہ حضور خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور معجزۂ معراج بھی صرف حضور ہی کا خاصہ ہے اور حضور کے ساتھ ہی مخصوص ہے، نہ کہ تمام انبیا کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنات اور ملائکہ کا بھی رسول بنایا اور آپ ﷺ کو تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، حتیٰ کہ عذاب میں تاخیر کے اعتبار سے آپ کی ذات کفار کے لیے بھی رحمت ہے۔

اسی طرح دنیا میں آپ کی سیادت یہ ہے کہ آپ کا شہر تمام شہروں سے افضل ہے، آپ کی مسجد تمام مسجدوں سے افضل ہے، اور وہ بقعۂ نور جس میں حضور ﷺ آرام فرما ہیں وہ کعبے سے افضل ہے، بلکہ عرش سے بھی افضل ہے، اور اسی طرح آپ ﷺ کی سیادت، روحانی نور ہونے کے اعتبار سے تمام اشیا سے افضل ہے۔ اور یہ فضیلت کثیر احادیث و آثار سے ثابت شدہ ہے، بلکہ آپ کا نور لطیف تمام انبیا کے انوار کی اصل ہے۔

مواہب میں ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا﴾

(آل عمران آیت نمبر 81-82)

حضرت علی اور حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ:

﴿ما بعث الله نبيا من الأنبياء إلا أخذ عليه الميثاق لئن بعث الله محمدا وهو حي ليؤمنن به وينصرنه﴾

ترجمہ: جو بھی نبی تشریف لائے، ہر ایک اللہ تعالیٰ نے عہد و میثاق لیا کہ اگر محمد ﷺ مبعوث ہوں، اور وہ نبی حیات ظاہری کے ساتھ دنیا میں ہو تو وہ ضرور حضور (ﷺ) پر ایمان لائے اور ضرور ان کی حمایت و تصدیق کرے۔

نیز المواھب میں حضرت عبد الرزق سے بروایت جابر حدیث مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جاننا چاہیے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کے نور کو پیدا فرمایا، پھر اس نور محمدی سے لوح و قلم، عرش و حاملین عرش، کرسی، ملائکہ، آسمانوں، زمینوں، جنت و دوزخ سب کو پیدا فرمایا، مومنین کی آنکھوں، دلوں اور اُن کی جانوں کے نور کو بھی نور محمدی ہی سے پیدا فرمایا۔

اور رہی حضور ﷺ کی آخرت میں سیادت، تو علامہ قرطبی نے اس کا یوں ذکر کیا ہے کہ قیامت کے دن فرشتوں کی ایک جماعت جہنم کو لائے گی اس حال میں کہ جہنم چار پایوں پر چل رہی ہو گی اور ستر ہزار لگاموں سے اسے کھینچا جا رہا ہو گا۔ ہر لگام میں ستر ہزار حلقے ہوں گے اور ہر حلقے پر ستر ہزار فرشتے ہوں گے کہ اچانک ان فرشتوں کے ہاتھوں سے جہنم کی لگام چھوٹ جائے گی اور وہ فرشتے جہنم کے اتنا بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو پکڑ نہیں پائیں گے۔ پھر اہل محشر جھک جائیں گے حتی کہ مرسلین عظام بھی اور حضرت ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم الصلوۃ والسلام عرش کے پایوں کو پکڑ لیں گے۔ اور حال یہ ہو گا کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل کو، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون کو، حضرت عیسیٰ، حضرت مریم کو بھول چکے ہوں گے، اور سب یہ کہتے ہوں گے کہ یا اللہ **نفسی نفسی**، اے اللہ میں آج اپنے سوا کچھ نہیں مانگتا جبکہ اس حالت اور اس عالم میں ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر **امتی امتی** ہو گا کہ اے میرے رب میری امت، میری امت کو سلامت رکھ نجات عطا فرما۔ پھر حضور علیہ الصلاۃ والسلام کھڑے ہوں گے اور جہنم کی نکیل پکڑ کر فرمائیں گے کہ اے جہنم واپس لوٹ جا، شکست خوردہ ہو کر۔ تو وہ کہے گی کہ آپ میرا راستہ چھوڑ دیں اس لیے کہ آپ اے محمد مجھ پر حرام ہیں۔ پھر عرش کے شامیانے سے آواز آئے گی کہ اے جہنم جو وہ کہہ رہے ہیں اسے سن اور ان کا کہا مان، پھر جہنم کو کھینچ کر عرش کی شمالی جانب کر دیا جائے گا۔ تب جا کر اہل محشر کا ڈر کچھ کم ہو گا۔ یہ علامہ خرپوتی کے کلام کی نقل تھی یہاں پر ان کا کلام مختصر سی تغیر کے ساتھ پذیر ہوا۔

علامہ خرپوتی نے اپنی عبارت میں لفظ "**فینادی**" استعمال کیا ہے اور ایسا ہی ہمارے پیش نظر نسخے میں ہے، لیکن میرے حساب سے زیادہ بہتر "**فینادی**" کے بجائے "**فتنادی**" ہو گا۔

شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے سید العرب والعجم ہونے پر حضور کا یہ فرمان دلیل ہے کہ میں بنی آدم کا سردار ہوں، لیکن مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

اور یہ آیت بھی دلیل ہے ﴿کنتم خیر امت﴾ اور حضور کا جن وانس سے افضل ہونا حضور کے اس فرمان سے مستفاد ہے کہ میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا خاص وقت ہوتا ہے کہ کسی بھی مقرب فرشتے اور کسی بھی رسول کی اس وقت میں گنجائش نہیں ہوتی۔

حضور اکرم ﷺ کی کونین (دنیاو آخرت) پر فضیلت یعنی سید الکونین ہونے کی معرفت اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں کہ آپ کا مقام وحدت میں تحقیق ہے اور آپ اثنینیت کو رفع کر کے اس سے فائق ہیں، اور آپ ﷺ لباس شربت کو اتار کر لباس نورانیت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مقام وحدت اور مقام رفع اثنینیت پر آپ اثنینیت کے فائز ہونے پر دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾

نیز یہ فرمان

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾

زبان حقیقت حال سے انہیں معانی ومفاہیم میں یہ اشعار کہے گئے ہیں۔

و انی و ان کنت ابن آدم صورة
فلی فیه معنی شاهد بأبوتی
و لو لای لم یوجد ولو لا ی لم یکن
شهود و لم یعهد عهود بذمتی

یعنی: گویا حضور خود بزبان حال فرماتے ہیں کہ میں اگرچہ صورتاً اور ظاہراً بنی آدم ہوں، لیکن حقیقتاً میرے لیے اس سلسلے میں ایک ایسا معنی ہے جو میری ابوت اور میرے باپ ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو ان کو بھی پیدا نہ کیا جاتا، اور اگر میں نہ ہوتا تو کوئی موجود نہ ہوتا اور نہ ہی کوئی مکلف وذمہ دار بنایا جاتا۔

(ماخوذ از الوردة فی شرح الفردة، مترجم حضرت علامہ مفتی محمد ارسلان رضا خاں قادری صاحب حفظہ اللہ)

پیغمبر خدا قانون داں بھی قانون ساز بھی

شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی صاحب رحمہ اللہ

قانون ساز اور قانون دان یہ دو لفظ عرف میں الگ الگ معنی کے لیے آتے ہیں۔ قانون داں کے معنی ہیں۔ قانون جاننے والا، جس کی حیثیت صرف قانون کے کلیات و جزئیات کے معتد بہ حصہ پر عبور کی ہوتی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر اتنی مہارت ضروری ہے کہ وہ ہر نئے پیش آنے والے حادثہ کا حکم قانون کی کلیات سے یا اس کے مثل و نظیر دوسری جزئی سے قیاس کر کے نکال سکے جس کی مثال وکیل اور بیرسٹر ہیں کہ یہ لوگ صرف قانون داں ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل، ذہین، فطین ہوں یہ لوگ قانون کی دفعات یا اس کی عبارت میں کوئی ادنی رد و بدل نہیں کر سکتے۔ قانون کے اصطلاحی معنوں میں کوئی تغیر نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نئے مقدمات کے لیے قانون کی دفعات سے احکام نکال لیتے ہیں اور اسے اپنے دعویٰ کے مطابق کرنے کے لیے ہفتوں، مہینوں بحث و تمحیص کر سکتے ہیں، مگر قانون میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ میں ان کی نظیر علمائے دین ہیں جو شریعت کے اصول و فروع پر حاوی ہوتے ہیں۔ اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ کوئی نیا واقعہ رونما ہو تو اس کا حکم استخراج کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسائل شرعیہ پر اعتراض کرنے والوں کو دندان شکن جواب دے لیتے ہیں، مگر شریعت کے کسی حکم کو بدل نہیں سکتے اس میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے اس کے الفاظ کو نیا معنی نہیں پہنا سکتے۔

رہ گیا قانون ساز تو یہ لفظ اس اختیار ہستی پر اطلاق کیا جاتا ہے جو جب چاہے خواہ باختیار خود یا باذن مختار مطلق قانون کی جس دفعہ کو چاہے منسوخ کر دے، اس میں رد و بدل کر دے۔ الفاظ کے نئے معنی معین کر دے، جن

افراد کو چاہے جس قانون سے چاہے مستثنیٰ کر دے۔ اس کی ایک مثال ہمارے معاشرے میں شہنشاہ کی ہے کہ وہ اپنی مملکت کا آمر مطلق ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو قانون چاہتا ہے ختم کر دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے جس قانون سے چاہتا ہے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ دوسری مثال وزیر قانون کی ہے کہ وہ شہنشاہ کے اذن واختیار سے قانون بناتا ہے، اس میں ترمیم و تبدیل کرتا ہے۔

اب جب قانون داں اور قانون ساز دونوں الفاظ کے معانی ذہن نشین ہو گئے تو اب آیئے شریعت اسلامیہ کی تاسیس کا ایک تحقیقی جائزہ لیں اور یہ تلاش کریں کہ حضور سید عالم ﷺ کی حیثیت صرف قانون داں کی تھی یا یہ کہ آنحضور ﷺ باذن اللہ قانون ساز بھی تھے۔

۱۔ اس بحث کے چند پہلو ہیں ایک یہ کہ آنحضور ﷺ باذن اللہ قانون ساز تھے قرآن کی روشنی میں۔

۲۔ آنحضور ﷺ قانون ساز ہیں احادیث کی روشنی میں۔

۳۔ آنحضور ﷺ قانون ساز ہیں شواہد کی روشنی میں۔

۴۔ اس بارے میں امت کا عقیدہ آج سے پہلے کیا رہا اور کیا ہے؟

(1) آیات:

آیات قرآن کریم پر اگر کوئی تحقیقی نظر ڈالے تو اسے اس بارے میں صدہا نصوص مل جائیں گی۔ سرسری نظر ڈالنے پر بھی جو نصوص سامنے ہیں وہ کم نہیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں، جگہ جگہ ملے گا اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ جس نے اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی وہ فاسق و ظالم ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ عزوجل کے مختار مطلق ہونے کے بارے میں کسی مدعی اسلام کو ادنیٰ شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی شان ہے ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ ہے۔ اللہ عزوجل کی اطاعت و عصیان کے موازی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم اور عصیاں کی ممانعت اس کی دلیل ہے کہ اس باب میں مختار وماذون، عطائی وذاتی ووجوب وامکان، حدوث وقدم وغیرہ کا فرق تو ہے مگر واجب الاتباع و مطاع دونوں ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ جس طرح اللہ عزوجل شریعت میں نسخ، ترمیم، تبدیل،

تخصیص، تقیید کر سکتا ہے، اس کے اذن سے اس کے رسول ﷺ بھی یہ سب اختیار رکھتے ہیں، اور یہی معنی قانون ساز کے ہیں۔ ان عمومی ارشادات کے علاوہ آیئے چند خصوصی ارشادات ملاحظہ کریں، ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾

(آل عمران: پ۳، ع۱۲، آیت ۳۱)

ترجمہ فرمادو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنالے گا۔

اور ہر شخص جانتا ہے کہ اتباع کا یہی مطلب ہے کہ جو حکم دیا جائے اس کو مانا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ رسول جو حکم دیں اس کا ماننا لازم ہے تو ثابت ہو گیا کہ رسول کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امت کو جو چاہیں حکم دیں، یہی قانون ساز کے معنی ہیں، اور فرمایا گیا:

﴿وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَؕ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا﴾ (سورہ نساء: پ۵، ع۱۳، آیت ۱۱۵)

ترجمہ: حق ظاہر ہو جانے کے بعد جو بھی رسول کے خلاف کرے، اور مومنوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ پکڑے ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ مڑا اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور یہ برا ٹھکانا ہے۔

رسول کا خلاف یہی ہے کہ وہ جو فرمائیں نہ مانا جائے، اس پر عمل نہ کیا جائے یہ اسی بنا پر ہے کہ ان کا ہر حکم قانون شریعت ہے اور جس کا ہر حکم قانون شریعت ہوتا ہے، وہ قانون ساز ہوتا ہے، صرف قانون داں نہیں۔ اور سنیے سورۂ نور میں ہے:

﴿فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾

(سورہ نور: پ۱۸، ع۱۵، آیت ۶۳)

ترجمہ: جو لوگ رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں وہ ڈریں کہیں ان کو فتنہ نہ آئے یا دردناک عذاب نہ پہنچے۔

رسول کے حکم کے خلاف کرنے والے پر یہ وعید اسی لیے ہے کہ ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی شریعت کی خلاف ورزی ہے، اور یہ حیثیت شریعت ساز کی ہو سکتی ہے صرف شریعت دان کی نہیں۔ لیجیے سورۂ احزاب کی آیت ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (سورہ احزاب: پ ۲۲، ع ۲، آیت ۳۶)

ترجمہ: کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کی مجال نہیں کہ اللہ ورسول کوئی حکم فرمائیں تو انہیں اپنے معاملہ کا اختیار رہے اور جو اللہ ورسول کا حکم نہ مانے وہ بلاشبہ کھلے بند گمراہ ہوگا۔

اس آیت کریمہ کی مراد کی توضیح کے لیے اس کا شان نزول بھی سنتے چلیے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنیٰ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح کا پیام زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بھائی کو دیا، ان لوگوں نے نامنظور کیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ غور کیجیے! زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت زینب کا نکاح ہونا حضور ﷺ ہی نے بہ نفس نفیس طے فرمایا۔ خود ہی پیام دیا، اس بارے میں کوئی آیت نہیں اتری تھی، مگر اسے نامنظور کرنے پر اتنی سخت وعید آئی اور اسے اللہ کا بھی حکم فرمایا گیا، اس کی نافرمانی اللہ کے حکم کی نافرمانی قرار دی گئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آں حضور ﷺ کی حیثیت صرف قانون داں کی نہیں قانون ساز کی بھی ہے۔

احادیث:

(۱) ﴿ترکت فیکم امرین لن تضلوا اما ان تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ﴾

ترجمہ: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان دونوں کے پابند رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔

کتاب اللہ کے قانون شریعت ہونے میں کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ اس کے موازی آنحضور ﷺ نے سنت رسول اللہ کو بھی رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سنت رسول اللہ بھی قانون شریعت ہے اور یہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ حضور سید عالم ﷺ کو قانون ساز تسلیم کیا جائے، جن کے ارشاد، کردار، اور تقریر کا نام سنت ہے۔

(۲) حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جسے ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی نے نقل فرمایا۔ ارشاد ہے:

﴿الا یوشك رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بھذا القرآن،فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه ،وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ۔﴾

ترجمہ: کوئی پیٹ بھرا اپنی مسند پر بیٹھا یہ نہ کہنے لگے: تم صرف قرآن کے پابند رہو اس میں جو حلال پاؤ اسے حلال جانو، اور اس میں جو حرام پاؤ اسے حرام جانو۔ حالاں کہ رسول اللہ نے جسے حرام فرمایا وہ اسی کے مثل ہے جسے اللہ نے حرام فرمایا۔

(۳) امام ابو داؤد نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے اسی کے ہم معنی روایت کی، اس میں یہ ارشاد فرمایا: ﴿الا وانی واللہ قد امرت و نھیت عن اشیاء انھا لمثل القرآن۔﴾

ترجمہ: سنو! قسم خدا کی میں نے کچھ چیزوں کا حکم فرمایا ہے اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے، بے شک وہ قرآن کے مثل ہے۔

(۴) امام ترمذی، ابو داؤد و ابن ماجہ اور امام احمد و بیہقی نے حضرت ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کے مثل روایت فرمائی، اس میں ارشاد ہے:

﴿لا الفین احد کم متکئا علی اریکته، یاتیه الامر من امری مما امرت به او نھیت عنه فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ۔﴾

ترجمہ: اپنی مسند پر ٹیک لگائے کسی کو یہ کہتے نہ پاؤں کہ جب اس کے پاس کوئی چیز میری فرمودہ یا میری منع کردہ آئے تو یہ کہہ دے میں نہیں جانتا۔ ہم نے جو کتاب اللہ میں پایا اس کی اتباع کی۔

ان احادیث کو پڑھیے اور دیکھیے جن لوگوں نے صرف اللہ کے حلال کیے ہوئے کو حلال جانا اور اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حرام اور رسول ﷺ کے حلال کیے ہوئے کو حلال، اور حرام کیے ہوئے کو حرام نہیں جانا ان پر کتنا شدید غضب فرمایا۔ اور بلا کسی اشتباہ کے فرمایا کہ میری حلال کردہ اشیا اور حرام کردہ اشیا اسی کے مثل ہیں جنہیں اللہ نے حلال یا حرام فرمایا۔ کیا کسی قانون داں کا قول، قانون ساز کے قول کے مثل ہو سکتا ہے؟ کیا جو قانون داں اور قانون ساز کے اقوال میں تفریق کرے وہ اس شدید غضب کا مستحق ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور

ضرور نفی میں ہے تو جو لوگ اللہ عزوجل کو قانون ساز مانتے ہیں انہیں ماننا پڑے گا کہ حضور سید عالم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بھی ضرور بالضرور قانون ساز ہیں۔

(۵) امام مالک، احمد و بخاری و مسلم و نسائی و ابن ماجہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ ارشاد فرمایا:

﴿لو لا ان اشق علی امتی لامرھم بالسواك عند کل صلوۃ۔﴾

ترجمہ: اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم فرما دیتا۔

تیسیر وغیرہ میں اس حدیث کو متواتر بتایا ہے، انہیں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام احمد و نسائی نے یوں روایت فرمائی کہ ارشاد ہوا:

﴿لو لا ان اشق علی امتی لامرھم عند کل صلوۃ بوضوء و مع کل وضوء بسواك۔﴾

ترجمہ: اگر اس کا لحاظ نہ ہوتا کہ میری امت پر شاق ہوگا تو انہیں حکم دیتا کہ ہر نماز کے وقت وضو کریں اور ہر وضو کے ساتھ مسواک کریں۔

(٦) ابن ماجہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ یوں ارشاد ہوا:

﴿لو لا ان اشق علی امتی لفرضتہ علیھم۔﴾

ترجمہ: اگر میری امت کی مشقت کا خوف نہ ہوتا تو مسواک ان پر فرض کر دیتا۔

(۷) امام ابو نعیم حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی کہ ارشاد فرمایا:

﴿لو لا ان اشق علی امتی لامرھم ان یستا کوا بالاسحار۔﴾

ترجمہ: اس کا لحاظ نہ ہوتا کہ میری امت پر شاق ہو تو میں حکم فرما دیتا کہ ہر پچھلے پہر مسواک کیا کریں۔

(۸) امام بخاری و مسلم و نسائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

﴿لو لا ان اشق علی امتی لامرھم ان یصلوھا ھکذا یعنی العشا نصف اللیل۔﴾

ترجمہ: اگر میری امت پر شاق ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں حکم دیتا کہ اسے یعنی عشا کو اس وقت یعنی آدھی رات کو پڑھیں۔

غور کیجیے! ہر نماز کے وقت وضو یا مسواک یا ہر وضو کے ساتھ مسواک یا ہر صبح کو مسواک یا نماز عشا کا نصف لیل تک موخر کرنا فرض نہیں، مگر حضور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا لحاظ ہے کہ ان چیزوں کے فرض فرمادینے سے امت مشقت میں پڑ جائے گی ورنہ ان چیزوں کو فرض کر دیتا، مگر چوں کہ ان کے فرض کر دینے سے امت مشقت میں پڑ جائے گی، اس لیے میں نے ان کو فرض نہیں فرمایا۔

(۹) یہ قول کسی قانون داں کا نہیں ہو سکتا یہ قول صرف قانون ساز کا ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

﴿انی احرم علیم حق الضعیفین الیتم والمرأۃ.﴾

ترجمہ: میں دو کمزوروں کی حق تلفی تم پر حرام کرتا ہوں: یتیم اور عورت۔ متفق علیہ

(۱۰) ارشاد ہے:

﴿لا تشرب مسکر افانی حرمت کل مسکر .﴾

ترجمہ: نشہ کی کوئی چیز نہ پی، میں نے ہر نشہ آور حرام فرمادیا۔

(۳) شواھد:

شواہد و نظائر بھی اس باب میں اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا احاطہ دشوار ہے۔ بلکہ جو فقیر کے علم میں اس وقت ہیں ان سب کا بھی کہ یہ نمبر متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ایک صاحب حاضر ہوئے، عرض کی: میں ہلاک ہو گیا۔ فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کی، میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی ہے۔ فرمایا: ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا: کیا اتنی طاقت ہے کہ مسلسل ساٹھ روزے رکھے، عرض کی نہیں۔ فرمایا: کیا اتنی استطاعت ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ عرض کی، نہیں۔ اتنے میں سوا دو من خرما کسی نے پیش کیے۔ فرمایا: انہیں خیرات کر دے۔ عرض کی: اپنے سے زیادہ محتاج پر نہ؟ مدینہ بھر میں کوئی گھر ہمارے برابر محتاج نہیں۔ یہ سن کر حضور سید عالم ﷺ اتنا ہنسے کی دندان مبارک ظاہر ہو گئے، فرمایا: جا، اپنے گھر والوں کو کھلا دے۔

(۲) اسی کے مثل کفارہ ظہار میں بھی وارد ہے:

ظہار اور روزے کا کفارہ یہ مقرر ہے کہ وہ غلام آزاد کرے، اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے میں لگاتار روزے رکھے۔ اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کھانا کھلائے۔ مگر یہ حضور سید عالم ﷺ کی شان قانون سازی ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو اس کفارہ سے مستثنیٰ فرما دیا، نہ صرف یہ کے مستثنیٰ فرما دیا، بلکہ انہیں اتنے کثیر خرمے عطا فرمائے۔

(۳) امام احمد مسند میں ثقات رجال صحیح مسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص آئے اور اس شرط پر اسلام لائے کہ صرف دو ہی نماز پڑھوں گا، نبی کریم ﷺ نے قبول فرمالیا۔ کیا صرف قانون داں کی حیثیت ہے کہ وہ اللہ کی فرض کی ہوئی تین نمازوں کو معاف کر دے۔ یہ صرف قانون ساز کا عہدہ ہے۔

(۴) حارث بن اسامہ بن نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور خود حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، مصنف ابن ابی شیبہ و تاریخ بخاری و مسند ابو یعلی و ابن خزیمہ اور معجم کبیر طبرانی میں مروی ہے کہ فرمایا:

﴿من شهد له خزيمة او شهد عليه فهو حسبه.﴾

ترجمہ: خزیمہ کسی کے موافق یا مخالف گواہی دیں ان کی تنہا گواہی کافی ہے حالاں کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ.﴾

(طلاق: پ۲۸، ع۷، آیت ۲)

ترجمہ: تم میں سے دو عادل گواہی دیں۔

مگر آں حضور ﷺ نے حضرت خزیمہ کی تنہا شہادت کو دو کے برابر فرما دیا، یہ دلیل ہے کہ آں حضور ﷺ قانون ساز ہیں۔

(۵) سونا اور ریشمی کپڑا مردوں کے لیے حرام ہے۔ مگر حضور ﷺ نے حضرت براء کے لیے سونے کی انگوٹھی اور حضرت سراقۃ کے لیے کسریٰ کے زریں کنگن اور حضرت عبد الرحمن بن عوف و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے خارش کے وقت ریشمی لباس حلال فرمایا۔

(۶) حکام کے لیے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، مگر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے حلال فرمایا۔

(سیف فی کتاب المفتوح)

(۷) فرماتے ہیں:

﴿قد عفوت عن الخیل والرقیق فهاتو اصدقة الرقة من کل اربعین درهما درهم. ﴾

ترجمہ: میں نے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کردی، روپیوں کی زکوٰۃ دو ہر چالیس درہم میں ایک درہم ہے۔

صحیحین اور مسند امام احمد اور شرح معانی الآثار میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا:

﴿اللھم ان ابراھیم حرم مکۃ و انی احرم ما بین لابتیھا. ﴾

ترجمہ: اے اللہ! ابراہیم نے مکہ کو حرم کردیا اور میں (مدینہ کی) دونوں پہاڑیوں کے درمیان کو حرم بناتا ہوں۔ "یعنی مدینہ طیبہ کو"۔

(۸) حجۃ الوداع کا موقع ہے، حرم مکہ کے احکام بیان فرمارہے ہیں، ارشاد ہوا اس کا میدان نہ صاف کیا جائے یعنی گھاس نہ چھیلی جائے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہوکر عرض کی:

﴿یا رَسولَ اللّٰہِ، إلّا الإذخِرَ؛ فإنَّہ لقَینِھم ولِبُیوتِھم﴾

ترجمہ: سوائے اذخر کے یا رسول اللہ! اس لیے کی یہ ان کی بھٹی کے لیے ہے اور ان کے گھروں کے لیے ہے۔

فوراً بلا تاخیر اس کا استثنا فرمادیا۔

(۹) حجۃ الوداع کا موقع ہے۔ حضور سید عالم ﷺ حج کی فرضیت بیان فرمارہے ہیں کہ اقرع بن حابس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے عرض کیا:

﴿العامنا ھذا أم للأبد﴾

کیا اسی سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔

فرمایا: اسی سال کے لیے۔ اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال کے لیے واجب ہوجائے۔

ان شواہد کو دیکھیے کیا یہ سب پکار پکار کر نہیں بتارہے ہیں کہ آنحضور ﷺ قانون ساز ہیں، صرف قانون داں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک حدیث سے قرآن مجید کا نسخ جائز ہے۔ مرقات میں ہے:

﴿قد اثبت عند الحنفیۃ ان الحدیث یکون ناسخا للکتاب. ﴾

ترجمہ: حنفیہ کے نزدیک ثابت ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی ناسخ ہوسکتی ہے۔

اور یہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ ارشاد فرمایا:

﴿کلامی ینسخ بعضھا بعضا کنسخ القرآن. ﴾

میرا کلام بعض بعض کو منسوخ فرما دیتا ہے جیسے قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔

امت کا عقیدہ:

حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں۔ اس بارے میں امت کا عقیدہ عہد صحابہ سے لے کر یہی رہا ہے کہ حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں، صرف قانون داں نہیں۔

(۱) سنن ابی داؤد و ابن ماجہ و مسند امام طحاوی و معجم طبرانی و بیہقی وغیرہ میں حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

﴿جعل رسول اللہ ﷺ للمسافر ثلاثا و لو مضی السائل علی مسألته لجعلها خمسا.﴾

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لیے موزوں پر مسح کی مدت تین دن مقرر فرمائی۔ اگر مانگنے والا مانگے جاتا تو ضرور پانچ دن کر دیتے۔

(۲) بخاری میں زید بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

"میں نے یہ آیت خزیمہ کے پاس پائی، جن کی شہادت رسول اللہ ﷺ نے دو گواہوں کے برابر فرمائی۔"

(۳) حرم مدینہ کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

﴿نهی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم ان یعضد شجرها او یخبط او یؤخذ طیرها.﴾

ترجمہ: نبی ﷺ نے منع فرمایا کہ مدینے کے درخت کاٹے جائیں یا پتے جھاڑے جائیں یا چڑیا پکڑی جائے۔

ان کے علاوہ خود یہی حضرت ابو ہریرہ، انس بن مالک، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، ابو سعید خدری، عبد الرحمن بن عوف، صعب بن جثامہ، رافع بن خدیج، خبیب بن ہذلی، اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا: "مدینہ کے دونوں پہاڑیوں کے مابین حرم بنایا۔ اس کے درخت کاٹنا یا پتے جھاڑنا حرام فرمایا، اس کا شکار حرام فرمایا، بقیع کو حرم بنایا۔"

یہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ارشادات ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کو حرم بنایا، اس کے درخت کاٹنا، پتے جھاڑنا، اس کی چڑیا پکڑنا حرام فرمایا۔ حرام کرنے کی اسناد حضور ﷺ کی طرف کرنی اس کی دلیل ہے کہ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ حضور ﷺ کو اس کا اختیار تھا کہ جس چیز کو چاہیں حلال فرمادیں، جسے چاہیں حرام فرمادیں۔ اسناد میں اصل حقیقی ہے جب تک کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو، جو یہاں منفی ہے تو ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا عقیدہ یہی تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قانون ساز ہیں۔

۴۔حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

﴿نهانا رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم عن خاتم الذهب.﴾

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا

۵۔حضرت جیش بن اویس نخعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خدمت اقدس میں حاضر ہوکر ایک قصیدہ مدیحہ عرض کیا، جس میں ہے:

شرعت لنا دين الحنيفة بعد ما
عبدنا كأمثال الحمير طواغيا

ہمارے لیے دین حنفیہ کی آپ نے تشریح فرمائی اس کے بعد کہ ہم گدھوں کی طرح بتوں کو پوجتے تھے۔

٦۔امام قدوری فرماتے ہیں:

﴿سن رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم الغسل للجمعة والعيدين والاحرام وعرفة﴾

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسنون فرمایا غسل جمعہ اور عیدین اور احرام اور عرفہ کے دن۔

سنّ کی اسناد حضور سید عالم ﷺ کی طرف کرنی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں۔

۷۔امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں:

﴿كان الحق تعالى جعل له صلى الله تعالى عليه وسلم ان يشرع من قبل نفسه ما شاء.﴾

اللہ عزوجل نے رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ اپنی طرف سے جو چاہیں مشروع فرمادیں۔

۸۔امام احمد خطیب قسطلانی مواہب میں فرماتے ہیں:

﴿من خصائصه صلى الله تعالى عليه وسلم انه كان يخص من شاء من الاحكام.﴾

سید عالم ﷺ کے خصائص میں سے یہ ہے کہ شریعت کے احکام میں جسے چاہیں جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔

۹۔علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں اضافہ فرمایا:

﴿من الاحكام وغيرها﴾

احکام کی تخصیص نہیں جس چیز سے چاہیں جسے چاہیں خاص فرمادیں۔

۱۰۔علامہ اجل سیوطی قدس سرہ نے خصائص کبریٰ میں اس مضمون کا ایک باب منعقد فرمایا:

﴿باب اختصاصه صلى الله تعالى عليه وسلم بانه يخص من شاء بما شاء من الاحكام.﴾

اس کا بیان کہ نبی ﷺ اس منصب کے ساتھ خاص ہیں کہ جسے چاہیں جس حکم سے چاہیں خاص فرمادیں۔

۱۱۔علامہ محمد بن عبد الباقی زرقانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں:

﴿قد اشتهر اطلاقه عليه صلى الله تعالى عليه وسلم لانه شرع الدين والاحكام.﴾

حضور ﷺ کو شارع کہنا مشہور ہے اس لیے کہ حضور نے دین اور احکام کی تشریح فرمائی۔

۱۲۔قصیدہ بردہ شریف میں ہے:

نبينا الآمر الناهي فلا احد
ابر في قول لا منه ولا نعم

ہمارے نبی آمر اور ناہی ہیں۔"ہاں" اور "نہیں" کہنے میں ان سے زیادہ کوئی سچا نہیں۔

۱۳۔علامہ شہاب خفاجی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں:

﴿معنى نبينا الآمر الخ انه لا حاكم سواه صلى الله تعالى عليه وسلم فهو حاكم غير محكوم﴾

نبی ﷺ کے آمر و ناہی ہونے کے معنی یہ ہیں حضور حاکم ہیں، حضور کے سوا عالم میں کوئی حاکم نہیں، وہ کسی کے محکوم نہیں۔

اور آج اس بارے میں امت کا کیا عقیدہ ہے یہ معلوم کرنا ہو تو ترجمان ملت مجدد وقت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا رسالۂ مبارکہ "منبه اللبيب" اور "الامن والعلیٰ" کا مطالعہ کریں۔(ماخوذ از مقالات شارح بخاری)

مولود میں ماتم

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی صاحب رحمہ اللہ

بات آج کل کی نہیں، دسیوں صدی پہلے کی ہے اور ذکر کسی خاص جماعت کا نہیں پوری کائنات کا ہے جب کہ اس عالم کی ریت ہی نرالی تھی ایسا نہیں کہ آفتاب نہ طلوع ہوتا تھا۔ آفتاب چمکتا ضرور تھا لیکن اس کی ایک ایک کرن دنیاوالوں سے اپنی مجبور خدائی کی شکایت کرتی تھی۔ اس وقت کی راتیں بے نور نہ تھیں لیکن چادر شہاب ہر شب گھناؤنے تقدس اور مکروہ سجدوں سے آلودہ کی جاتی تھی، ہوا باغ وراغ میں مستانہ خرامی ضرور کرتی تھی لیکن اشرف المخلوقات سے خراج الوہیت وصول کرنے کے لیے، اور ندیاں نالے ترنم ریز ضرور ہوتے تھے لیکن نذرانۂ عقیدت قبول کرنے کے لیے۔ مختصراً یہ کہ گل کدۂ عالم آج ہی کی طرح سرسبز وشاداب ضرور تھا لیکن صرف دیدہ ورنہ تھا جو کلیوں کی سرگوشیوں کو سن سکے، چشمے کا ترنم سمجھ سکے، گلوں کا تبسم پڑھ سکے، چادر مہتاب کی دعوت نظر قبول کرے اور آفتاب کی کرنوں سے کھیل سکے، یا نسیم صبح کی مستانہ روی کی داد دے سکے، اور ساری کائنات ایک دیدہ ور کا سوگ منا رہی تھی۔ ایک نگاہ نکتہ رس کو ترس رہی تھی۔ ادھر سارے عالم کی خدائی تقسیم کرنے والا انسان خود اپنی بنی نوع کو امن نہ دے سکتا تھا، روح کو شانتی نہ عطا کرتا تھا، اور دن بدن قتل و غارت گری، فسق وفجور، ظلم وعصیاں بڑھتا ہی رہا، زور پکڑتا ہی رہا، یونہی صدیاں گزر گئیں، نرگس اپنی بے نوری پر روتی رہی، پھول دامن پھاڑتا رہا، کلیاں کراہتی رہیں، ہوا چنگھاڑیں مارتی رہی، مظلوموں کے نالے بلند ہوتے رہے، بیواؤں کا درد جگر پھیلتا ہی رہا، یتیموں کے آنسو ریت میں جذب ہوتے رہے اور روح کی بے قراری بڑھتی

رہی کہ ایک مقدس رات میں کائنات ایک نشاط انگیز انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور جب صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تو سورج انہیں ہنس رہا تھا اور صبح کی ہوا آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

خراباتیاں مے پرستی کنید
محمد بگوئید و مستی کنید

اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے ترستی دنیا کے لاتعداد ناسوروں پر بیک جنبشِ نگہ مرہم سا رکھ دیا۔ نرگس کا رونا تھم گیا، پھول قہقہہ بھرنے لگا، کلی مسکرانے لگی، مظلوموں کے نالے کم ہو گئے اور روح کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پوری چودہ صدیاں انسانیت کے سر پر سے گزر گئیں لیکن سال میں جب بھی ربیع الاول کا مہینہ آتا ہے ساری کائنات میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، ستاروں کے مدھم چراغ روشن کر دیے جاتے ہیں، چاند مسکراتا ہے اور عالم بالا بقعہ نور بن جاتا ہے، بلبل پھول سے، قمر سرو سے، ابر قطروں سے، قطرے دریا سے، دریا جانور سے، جانور صحرا سے، صحرا پہاڑوں سے، پہاڑ سمندروں سے، سمندر ہواؤں سے اور ہوائیں انسانوں سے گلے مل کر اپنے نجات دہندہ، باعث ایجاد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کے میلاد سعید کے مژدۂ روح پرور سناتی ہے اور انسانوں کو تو مت پوچھو جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں اور مسلمان مختلف طریقوں سے اپنے اس قومی دن کی یادگار مناتے ہیں، گویا ساری خدائی مل کر یہ ثابت کر دیتی ہے۔

ایک چرا نیست دریں خانہ کہ از پر تو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

لیکن میں اپنے دل کی پریشانی کے المناکیوں کو کیا کہوں کہ یہ سب ہنگامہائے مسرت مجھے اور سوگوار کر دیتے ہیں اور اس ہنگام سعید کی یاد کی ایک ایک کھٹک اور تیز ہو جاتی ہے۔ درد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور کراہیں بڑھ جاتی ہیں، نالے وحشت ناک ہو جاتے ہیں اور میں چاہنے لگتا ہوں کہ رب کائنات میرا درد دل تھوڑا تھوڑا دنیا کے سارے مسلمانوں کے دل میں ڈال دے اور پھر وہ سب مل کر میرے ساتھ چیخنے لگیں اور یہ ہنگامۂ آہ و فغاں اس وقت بند ہو جب کہ خوابِ غفلت کے متوالے انسانوں کی آنکھیں کھل جائیں، یا پھر یہ دنیا پارہ پارہ ہو جائے، کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ جب وہ نجات دہندہ کائنات میں جلوہ فرما ہوا تھا تو بے گناہ بچیوں کی زندہ در گوری سے انسانیت کا

دامن داغدار تھا مگر اس دست مظلوم نواز نے اس مکروہ رسم کو قطعاً بند کر دیا اور اپنے ماننے والوں کے دل میں وہ سوز و گداز بھر دیا کہ ان کا آبلۂ دل ہر مظلوم کے درد پر ٹپک پڑتا تھا۔

ایک دفعہ بارگاہ نبوی میں لوگوں نے عاصم بن قیس سے زندہ در گور کی ہوئی بچیوں کا قصہ پوچھا وہ کہنے لگے، میں نے اپنی ایک بچی بھی زندہ نہ چھوڑی سب کو دفن کر دیا، لیکن ایک کی یاد اب تک میرے دل سے نہ گئی، وہ بچی جب میں سفر میں تھا تو پیدا ہوئی، اسے میری بی بی نے میرے خوف سے اپنی بہن کے پاس بھجوا دیا۔ واپسی پر میں نے حمل کے بارے میں پوچھا تو بہانہ بنا دیا کہ میرے بچہ پیدا ہوا تھا لیکن مر گیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کے پاس انتہائی خوبصورت لڑکی دیکھی جسے میری بیوی سنوار رہی تھی، میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو رونے لگی اور کہا کہ یہ تمہاری ہی بچی ہے، میں نے تو اس دن کچھ نہ کہا لیکن ایک دن مہلت پا کر اس لڑکی کو اٹھا لے گیا، ایک گڑھا کھود کر بچی کو اس میں ڈال دیا اور اوپر سے مٹی چھوڑنے لگا وہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی۔ ابا جان تمہیں خدا کی قسم بتاؤ تو میرے ساتھ یہ کیا کر رہے ہو، کیا تم مجھے مٹی میں ڈھانک دوگے، کیا مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور میں مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اس کی آواز موقوف ہو گئی۔ اس وقت مجلس کا یہ عالم تھا کہ ساون بھادوں آنکھوں سے برس رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ:

﴿ان ھذہ لقسوۃ من لا یرحم لا یرحم﴾

یہ تو بڑی سنگ دلی ہے جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

کتنا سوز و گداز پیدا کر دیا تھا نبی مکرم نے اپنے ماننے والوں میں، لیکن آج آپ کے ہی ماننے والوں میں وہ مکروہ رسم چولا بدل کر پھر زندہ ہو رہی ہے۔ ڈیڑھ سال کا ذکر ہے، ایک شخص کی یتیم بچی کو میعادی بخار ہوا اس کے چچا اور چچی جن کے تربیت میں وہ تھی اور جو اس کے مجازی باپ تھے اس کی تیمارداری اور علاج کیا کرتے تھے۔ اسے گھر کے غیر محفوظ حصہ میں ڈال دیا اور خود عیش کی میٹھی نیند میں غرق ہو گئے، رات میں گیدڑ آیا جس نے مجبور اور لاچار بچی کو کاٹنا اور بھنبھوڑنا شروع کیا، جب اس کی چیخیں بلند ہوئیں تو یہ لوگ بیدار ہو کر اس گیدڑ کو ہانک آئے اور بس، یہاں تک کہ پھر دوسری رات وہی گیدڑ آیا اور اس نے پھر نوچنا شروع کیا، نوچتا رہا اور اس بے گناہ کی جان قفس

عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ ہیں رحمت للعالمین کے رحیم امت کے کارنامے، اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو بھی اپنے آس پاس سیکڑوں ماں باپ ایسے ہی ملیں گے جو رات دن معنوی اولاد کشی میں مصروف ہیں۔

یوں ہی رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی نورانی تعلیم پھیلانی شروع کی تو سارا عرب شراب میں غرق اور بدمست تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ ایک دن جب مدینہ میں منادی رسول یہ آواز دیتا ہے:

﴿لقد حرمت الخمر﴾

لوگو! شراب حرام کر دی گئی۔

تو اسی دم ہاتھوں میں اٹھے ہوئے جام توڑ دیے گئے، لب سے لگے ہوئے پیالے پٹک دیے گئے اور شراب کا چلتا ہوا دور تھم گیا، اور اس دن اس کثرت سے شراب کے مٹکے توڑے گئے کہ خیال ہو تا شاید آج مدینہ میں شراب کی ہی بارش ہوئی ہے۔ مگر آج وہ مسلمان جن کی صدیاں اسلام کی آغوش میں گزر گئی ہیں، اور جن کی رگوں میں مسلمان ماں باپ کا خون دوڑ رہا ہے وہ آج اس دھڑلے سے شراب اور منشیات استعمال کرتے ہیں گویا اسلام نے اس کا حکم دے دیا ہے۔ معاذ اللہ ایک قصبہ کی آبادی تقریباً ۲۰ ہزار مسلمانوں پر مشتمل ہے جہاں ہر سال لاکھوں کا شراب کا ٹھیکہ ہوتا ہے، جس سے پیاسے مسلمان سیراب ہوتے ہیں تو دوسری جگہ کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہاں کے زاہدان مرتاض ماہ صیام میں اس آتشی سیال سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ بعض جگہوں کے بارے میں خبر ہے کہ جہاں عورتیں جب تک تاڑی نوشی نہ کر لیں دن کے کام کا خمار نہیں اترتا اور اگر تلاش کی جائے تو پورے ہندوستان کے ہر شہر قصبے اور دیہات میں ان گنت مسلمان ایسے ملیں گے جو بڑی بے تکلفی سے روز منھ کا مزہ بدلتے ہیں۔

اس طرح مصلح اعظم ﷺ نے لعنت زنا سے عالم انسانیت کو پاک کر دیا تھا اور اعتراف جرم کا جذبہ اتنا زیادہ اجاگر کر دیا تھا کہ اگر کبھی کبھار کسی سے یہ جرم سرزد ہو گیا تو اس نے اپنی ذات کو اسلامی قانون، احتساب کے سامنے پیش کر دیا۔ ﴿یا رسول اللہ انی زنیت﴾

حضور میں مجرم ہوں، مجھ پر اسلامی قانون نافذ فرمائیے، حضور نے منہ پھیر لیا، تو دوسری طرف جا کر یہی کہا اور اس وقت تک کہتے رہے جب تک کہ رجم کے لیے ہاتھ میں پتھر نہ اٹھا لیے گئے۔

آج افسوس کہ صبح وشام قرآن عظیم کی تلاوت کرنے والے ساری رنگینیٔ حیات کا نشیمن بالاخانوں اور اسی ننگ انسانیت فعل کو سمجھتے ہیں۔

اور جب اس آفتاب ہدایت نے جزیرۂ عرب کو اپنی نورانی کرنوں سے منور کیا تھا۔ جنگ جو عرب صلح واتفاق کی دولت سے مالا مال ہو گئے تھے اور جن کو کسی کی سخت بات سننا گوارا تھی بے حد نرم دل ہو گئے تھے۔

ایک دفعہ ربیعہ اسلمی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما میں بات چیت ہونے لگی، کوئی سخت کلمہ حضرت ابو بکر کی زبان سے نکل گیا اور ربیعہ اسلمی کو ناگوار گزرا۔ حضرت ابو بکر فرمانے لگے تم مجھے بھی اس قسم کا کلمہ کہو تا کہ بدلہ پورا ہو جائے، حضرت ربیعہ نے انکار کیا تو حضرت ابو بکر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں شکایت لے گئے کہ ربیع میری سخت کلامی کا بدلہ مجھ سے نہیں لیتے۔ آپ ان سے بدلہ لینے کے لیے کہہ دیجیے، حضور نے معاملہ دریافت کرنے کے بعد فرمایا: اگر ربیعہ بدلہ نہیں لیتے تو انہوں نے تمہاری زیادتی معاف کر دی۔

لیکن افسوس ہے کہ آج ایک مسلمان بھائی کا بننا دوسرے کو گوارا نہیں ہے۔ اور ایک کو کھاتے پیتے دوسرا نہیں دیکھ سکتا اور ہر معاملے میں ہر شخص اپنے کو حق پر ہی سمجھتا ہے۔ چاہے کتنا ہی ظلم کر رہا ہو۔

الغرض! کہاں تک ایک ایک زخم کا ماتم کیا جائے، ملت اسلامیہ کا پورا جسم ایسے بے شمار زخموں سے پامال ہو گیا ہے اور بڑا الم تو یہ ہے کہ اس کا یہ حال اپنوں نے کیا ہے اسلام کو یہ دھچکا مسلمانوں کی طرف سے پہنچا ہے۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند
سعدی از دست خویشتن فریاد

ایسے وقت میں میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے جلسے اور جلوس کرنے والا مسلمان، حضور کی بڑائی کا دنیا کے سامنے گن گانے والا مسلمان، کاش کہ اس کا دل بھی اس کی زبان کی طرح مسلمان ہوتا، یہ جن کی زبانیں محمد رسول اللہ ﷺ کی عفت وپارسائی کی توصیف میں نہیں تھکتیں خود بھی پارسا ہوئے، سرور عالم ﷺ کی امانت و دیانت کا طویل خطبہ پڑھنے والے خود بھی امین و پارسا ہوتے۔ جو نبی عربی کی خوش معاملگی و وعدہ وفائی کے سامنے ساری دنیا کو چیلنج کرتے ہیں خود بھی ان کے نقش قدم پر چلتے۔ جو رحمۃ للعالمین کی خوش کلامی و نرمی، رحمت ورافت کا بڑا بڑا قصیدہ پڑھتے ہیں ایک شمہ خوش کلام و نرم دل اور رحیم ہو جاتے۔ مختصر یہ کہ جو اسلام کے ایک گلدستہ کی صورت، ایک حسین کھلونے کی طرح دور سے ہی تعریف کرتے ہیں اور پاس جاتے ڈرتے ہیں کہ رنگ و نور کا مرقع جمیل ہاتھ لگاتے ہی کہیں پگھل نہ جائے۔ اسلام کو اپنی زندگی میں برتتے۔ (مضامین بحر العلوم)

اختیارات مصطفی ﷺ

محدث کبیر حضرت علامہ مفتی ضیاء المصطفی قادری صاحب قبلہ مدظلہ العالی

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

ترجمہ: رسول جو دیدیں وہ لے لو، رسول جس چیز سے روک دیں باز آجاؤ۔

نبی کے وہ اختیارات ہیں کہ اللہ نے اس طرح سے نہ فرمایا کہ رسول کے روکنے اور رسول کے حکم دینے کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جب میری طرف سے میرا حوالہ دے کر میرا حکم دیں تو مانا جائے گا، بلکہ ڈائریکٹ اس طرح کی بات کی گئی کہ رسول جو دیدیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے باز آجاؤ۔

اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو دین کے معاملے میں اپنا خلیفۂ مطلق بنایا، اپنا نائب اعظم بنا دیا۔ اب رسول جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری شریف، مسلم شریف اور حدیث کی دوسری کتابوں میں صراحت ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر دین میں اختیارات کا اعلان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے مکہ کو حرم بنایا ہے۔

﴿"لَا يُعْضَدُ شَوْكُهَا وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا وَلَا يَلْتَقِطُ لُقَطَتُهَا إِلا مَنْ عَرَّفَهَا وَلَا يُخْتَلِي خَلَاهَا" فقال له العباس يا رسول الله إلا الإِذْخِرَ فإنه لقينهم ولبيوتهم فقال "إِلا الإِذْخِرَ"﴾

اللہ نے مکہ کو حرم بنایا ہے کہ یہاں کا کوئی کانٹا نہ توڑا جائے، یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں اور یہاں کی گھاس نہ اکھیڑی جائے۔ تو حضرت سیدنا عباس بن عبد المطلب (یعنی رسول اکرم ﷺ کے چچا) کھڑے ہو گئے، عرض کرتے ہیں: ﴿یا رسول اللہ! الا الاذخر فانہ لبیوتنا ولقبورنا ولصاغتنا﴾

(یا رسول اللہ! اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت دیدی جائے، اس لیے کہ وہ ہمارے گھروں کے چھپر بنانے کے کام آتی ہے اور قبروں میں جب مردوں کو لٹایا جاتا ہے تو تختے پر اس کو لگایا جاتا ہے۔ اور جب کوئی سونے کا کاروبار کرنے والا سنار اپنا سونا پگھلاتا ہے تو اس میں استعمال کرتا ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت دیدی جائے۔ آقا ﷺ نے فرمایا: ﴿إلا الاذخر الا الاذخر﴾

(ہاں اجازت ہے اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت ہے)

غور کیجیے کہ ایک طرف تو آقا ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ کوئی کانٹا یہاں کا نہ توڑا جائے، کوئی درخت نہ کاٹا جائے، کوئی گھاس نہ اکھیڑی جائے، گویا ہر خود رو درخت، گھاس وغیرہ کاٹنا حرام فرما دیا، مگر دوسری طرف جب حضرت عباس نے حضور ﷺ سے اذخر گھاس کاٹنے کو حلال کرنے کی درخواست کی تو آقا ﷺ نے یہ نہ کہا کہ یہاں پر میرا اختیار سلب ہو گیا، میرا کوئی اختیار کام نہیں کرتا، اللہ کا یہی حکم ہے۔ اسی نے مکہ کو حرم بنایا ہے، وہ اگر جائز کرے گا تو جائز ہو گا، ورنہ نہیں، بلکہ آقا کریم ﷺ نے فرمایا:

"جاؤ اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت ہے۔" اس سے یہ سمجھ میں آگیا کہ آقا رسول اکرم سید عالم ﷺ کو اللہ نے حلال و حرام کے بارے میں یہ اختیار دیدیا ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام فرما دیں۔

ایک موقع پر آقا کریم ﷺ نے حج کی فرضیت کا اعلان کیا۔ مشکوۃ شریف کتاب المناسک، مسلم شریف کتاب الحج اور نسائی شریف کی حدیث ہے۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

﴿"یا أیها الناس إن الله قد فرض علیکم الحج﴾

ترجمہ: اے لوگو! اللہ تعالی نے تمہارے اوپر حج فرض کر دیا ہے، جو حج کی استطاعت رکھتا ہے اس کے اوپر حج فرض ہے۔

یہ اعلان ہوا تو رسول اکرم سید عالم ﷺ کے ایک صحابی حضرت اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور عرض کرتے ہیں: ﴿یا رسول الله! أفي كل عام﴾

یعنی: یا رسول اللہ! کیا حج ہر سال کرنا پڑے گا؟ جیسے ہر سال ہمیں زکوٰۃ دینی پڑتی ہے، ہر سال ہمیں قربانی کرنی ہوتی ہے، کیا یا رسول اللہ اسی طرح سے حج بھی ہر سال کرنا پڑے گا؟ آقا ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لو قلت نعم لوجبت في كل سنة و ما استطعتم﴾

اگر میں کہہ دیتا ہاں تو ہر سال کے لیے فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہیں رکھ پاتے کہ ہر سال اس حج کو ادا کر سکو۔

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ سرکار ﷺ ایک طرف تو یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر حج کو فرض کیا ہے، اور دوسری طرف یہ بھی فرما رہے ہیں کہ تم نے ہر سال کے حج کی فرضیت کا سوال کیا ہے تو اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال فرض ہو جائے گا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ حج کو اللہ نے فرض کیا ہے مگر اس کی فرضیت کس انداز کی ہوگی؟ ہر سال کے لیے رہے گی یا زندگی میں ایک سال کے لیے رہے گی یہ اختیار پیارے مصطفیٰ ﷺ کو عطا کر دیا ہے۔ اس لیے آقا ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر میں کہہ دیتا ہاں تو ہر سال فرض ہو جاتا۔ یہ نہیں فرماتے ہیں کہ اللہ نے جیسا فرض کیا ہے ویسا ہی فرض رہے گا۔ اس نے ایک سال کا فرض کیا ہے یا ہر سال کا فرض کیا ہے۔ اس لیے ویسا ہی رہے گا بلکہ اپنی بات کی طرف اشارہ کر کے یہ بتا رہے ہیں کہ اللہ نے دین کے اس مسئلہ میں مجھ کو صاحب اختیار بنایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اختیارات کے ثبوت میں کثیر روایات پیش کی جا سکتی ہیں میں یہاں اجمالاً چند باتوں کو ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ دو حدیثیں میں نے آپ کے سامنے ذکر کیں انھیں ذکر کر کے یہ میں نے واضح کر دیا کہ ان حدیثوں میں آقا کریم ﷺ نے پوری امت کے لیے ایک آسانی اپنی طرف سے عطا فرمائی مگر میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے اتنا ہی اختیار نہ دیا تھا کہ حکم میں جو چاہیں چھوٹ دیدیں یا اس میں فرضیت کا حکم لگا دیں تو یہ ساری امت کے لیے برابر ہوا کرے گا بلکہ سرکار ﷺ کو یہ بھی اختیار ہے کہ ایک امتی کے لیے ایک حکم اور دوسرے کے لیے الگ حکم بھی رکھیں اس شان کی خصوصیت میرے نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہے، اور ایسا اس لیے ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے آقا ﷺ کو دین میں مکمل با اختیار بنا کر بھیجا تھا چنانچہ حضرت براء

بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث بخاری، مسلم اور صحاح ستہ کی دیگر کتابوں میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھ کر خطبہ دیا، خطبے میں فرمایا جن لوگوں نے ہمارے طریقے پر نماز پڑھ کر نماز کے بعد قربانی کی تو اس کی قربانی ٹھیک ہوگئی ﴿فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهُ وَأَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِينَ﴾ اور فرمایا کہ جس شخص نے پہلے قربانی کر دی اور بعد میں نماز پڑھی ﴿تِلْكَ شَاةُ لَحْمٍ﴾ کھانے کی ایک بکری ہوئی قربانی نہ ہو سکی۔ حضرت سیدنا ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ فوراً کھڑے ہوگئے۔ عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آج کھانے پینے کا دن ہے۔ اللہ کی طرف سے ہم بندوں کی مہمان نوازی کا دن ہے اس لیے میں نے پہلے ہی قربانی کر دی اور میں نے اپنے بھوکے پڑوسیوں کو بھی گوشت کھلا دیا اور اپنے گھر میں بال بچوں کو بھی کھلا دیا اور خود بھی کھا کر کے نماز پڑھنے کے لیے آرہا ہوں۔ سرکار ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ شَاةُ لَحْمٍ﴾

اے ابو بردہ بن نیار تمہاری قربانی نہ ہوئی وہ گوشت کھانے کی ایک بکری ہوگئی۔ وہ عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ اب تو میرے پاس قربانی کے لائق کوئی جانور نہیں ایک بکری کا چھ مہینے کا بچہ ہے موٹا اور فربہ ہے مگر یا رسول اللہ صرف چھ مہینے کا بچہ ہے۔ اب میں کیا کروں؟ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

﴿فَضَحِّ بِهَا وَلَا تُجْزِي جذعة عن احدٍ بَعْدَكَ﴾

جاؤ تم اسکی قربانی کر دو۔ تمہاری قربانی تو اس سے ہو جائے گی اور کوئی دوسرا شخص اس عمر کے جانور کی قربانی کرے تو نہ ہوگی۔

آقا کریم ﷺ جب نوازنے پر آتے ہیں تو اپنے ایک صحابی کو جو سب سے اونچے درجے کے صحابی نہیں مگر جب ان کو نوازنے پر آگئے تو خصوصیت عطا کر دی کہ چھ مہینے کے بکری کے بچے کو آپ قربانی کرنا چاہو تو کر لو مگر دوسرا کوئی کرے گا تو قربانی نہ ہوگی اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ نے آقا کریم سید عالم ﷺ کو دین کے معاملے میں وہ اختیار عطا کیا ہے کہ اگر چاہیں تو ایک حکم اپنے ایک امتی کے لیے خاص کر دیں اور ساری امت کے لیے الگ طرح کا حکم رکھیں۔ اسی لیے چھ مہینے کے بکری کے بچے کی اگر کوئی آدمی قربانی کرے تو اس کی قربانی نہ ہوگی، امت کا کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو مگر یہ خصوصیت آقا کریم ﷺ نے ابو بردہ کو عطا فرما دی۔

ذرا سوچو دین کے معاملے میں جب آقا کریم ﷺ کا یہ اختیار ہے تو دنیا کے معاملے میں کتنا عظیم اختیار ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے دین میں تصرف کرنے کے معاملے میں ساری دنیا کو مفلوج اور بے اختیار کر کے یہ بتا دیا ہے کہ میرے پیارے محبوب کے اختیارات کو سمجھنا ہو تو دین کے معاملے میں ذرا غوطہ زنی کر کے دیکھو، میرے پیارے حبیب کے اختیارات کھل کر سامنے آئیں گے پھر تم کو یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ جس جگہ تمہارے اختیارات مفلوج اور بے بس نظر آتے ہیں جب وہاں ان کے اختیار کی یہ شان ہے تو جہاں تم با ختیار نظر آتے ہو گے وہاں پر میرے محبوب کے اخیتارات کی کیا شان ہو گی اس کا تم اندازہ کر سکتے ہو؟۔(خطبات محدث کبیر)

معراجِ مصطفیٰ ﷺ

مفکر اسلام حضرت علامہ قمر الزماں خاں اعظمی صاحب قبلہ مدظلہ العالی

اللہ کے رسول ﷺ کا سفر معراج اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ، معجزات مصطفیٰ ﷺ میں ایک اہم ترین معجزہ اور خصائصِ رسولِ عربی ﷺ میں ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔ اس سفر پاک میں اللہ تبارک و تعالی نے رسولِ پاک ﷺ کو اپنے قرب سے نوازا، آسمان وزمین کی سیر کرائی، جنت ودوزخ، لوح وقلم، عرش وکرسی اور بے شمار آیات الٰہیہ کا مشاہدہ کرایا، تاکہ رسول پاک ﷺ حقائق اور اُمورِ غیبیہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں اُن کو بچشم خود ملاحظہ فرمالیں۔ اُمّت مسلمہ کو جن راہوں سے گزرنے کی اطلاع دیتے ہیں اُن گزر گاہوں سے پہلے خود ان کا گزر ہو جائے تاکہ لوگ علم مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ساتھ، نگہِ مصطفیٰ ﷺ پر بھی ایمان لائیں۔ اور آخرت کے تمام اُمور کی حیثیت صرف خبر ہی کی نہ ہو، بلکہ رسول پاک ﷺ کا مشاہدہ اور ان کا سفر معراج ان تمام اُمورِ غیبیہ پر جن کی اطلاع بذریعہ وحی دی گئی تھی، گواہ ہو جائے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُس دور میں جلوہ گر ہوئے جب کہ تاریخ انسانی ایک نئے باب کا آغاز کرنے والی تھی، جہل کا لباس اتارنے والی تھی اور علم و تحقیق کی راہوں میں قدم رکھنے والی تھی۔ انبیائے کرام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پروردگار عالم جب کبھی کسی نبی کو کسی قوم کی جانب مبعوث فرماتا ہے تو اس کو ایسے معجزات باہرہ سے نوازتا ہے جن کے سامنے اُس قوم کو اعتراف شکست کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر و طلسم کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصائے کلیمی سے نوازا گیا، اور طب و حکمت کے دور میں

جناب عیسیٰ علیہ السلام کو مسیحا بنا کر مبعوث کیا گیا، تاکہ دنیا کا کوئی علم، کوئی فلسفہ نبی مبعوث کی مقدس عظمت کو چیلنج نہ کر سکے۔

چوں کہ رسول گرامی قدر ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر مبعوث کیا گیا ہے، قیامت تک ان کے بعد کوئی اور نبی تشریف لانے والا نہیں ہے۔ اس لیے ان کی ذات اقدس کو مجموعۂ صفات جلیلہ بنا دیا گیا—وہ تمام معجزات جو دوسرے انبیائے کرام کو الگ الگ عطا ہوئے تھے، حضور ﷺ کی ذات اطہر میں جمع فرما دیے گئے۔ دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقین علیہم السلام کو معجزات دے کر بھیجا گیا تھا، مگر رحمتِ عالَم ﷺ کو سراپا معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔

حُسنِ یُوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور یہی وجہ ہے کہ قیامت تک جتنی بھی طاقتیں عالَمِ وجود میں آنے والی تھیں جن کی بنا پر انسان خدا کی بندگی کا انکار کر دیتا، حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کو ہر ایک کا جواب بنا کر مبعوث کیا گیا تاکہ انسان کسی بھی دور میں ان کی رسالت سے انحراف نہ کر سکے۔ خدائے شہید و بصیر کے علم پاک میں یہ بات ازل ہی سے تھی کہ محمد عربی ﷺ کے زمانۂ نبوت ہی میں لوگ چاند پر کمندیں ڈالیں گے، سیاروں سے آنکھ مچولی کھیلیں گے، کائنات کے پورے نظامِ کشش سے متعارف ہو کر سیاروں میں زندگی کے امکانات پر غور کریں گے۔ اسی لیے رسول پاک ﷺ کو معراج کے مقدس سفر میں عالَمِ بالا کی سیر کرائی گئی تاکہ بیسویں صدی یا اس کے بعد کا ترقی یافتہ انسان اگر خلاؤں میں پرواز کر کے کہکشاؤں کے رازہائے سربستہ معلوم کرے اور سیاروں میں زندگی بسر کرنے کے اقدامات کرے تو اسے آقائے دوجہاں ﷺ کے نقوشِ پا پہلے ہی سے دکھائی دیں اور حدیث معراج ان کو آگاہ کرے کہ تم جن منزلوں کی گردِ راہ ہو، حضور اکرم ﷺ کا کارواں بہار اب سے چودہ سو برس پہلے گزر چکا ہے۔

کہکشاں جلوہ فشاں ہے کہ اسی رستے سے
ہونے والا ہے محمد کا گزر آج کی رات

سرور کونین ﷺ نے انسانوں کو اسی منصب بلند کا حق قرار دیا جس سے وہ صدیوں پہلے اپنی بد اعمالیوں کی بنیاد پر اتار دیا گیا تھا اور اس نے انبیائے کرام کی مقدس تعلیمات سے گریز کر کے خود کو اسفل السافلین کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ انسان کی با عظمت پیشانی مظاہرِ فطرت کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک ہر شے اس کا معبود بن چکی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے بندگی کا حقیقی مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا اور ارشاد فرمایا کہ: تمہارا معبود صرف خدا ہے برتر و بالا ہے، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ انہوں نے انسانوں کو ایک سجدے کا پابند بنا کر ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دی۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے آدمی کو نجات

انہوں نے اپنے سفر معراج کے ذریعے انسانوں کو یقین دلایا کہ اس پوری کائنات میں انسان سب سے بلند ہے۔ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور عالمِ امکان اس ممکن الوجود کی گردِ راہ ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالَمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج پاک کے مقدس سفر میں لباسِ بشری میں تشریف لے جا کر آپ نے نوعِ بشر کو عزت و سربلندی کے اُس مقامِ بلند تک پہنچا دیا کہ بغیر آپ کے انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دلیلِ عظمتِ انسانیت ہیں
محمد مصطفیٰ انسانِ کامل

آپ نے اپنے سفر معراج میں عبودیتِ کاملہ کے اس ارفع اور بلند ترین تصور سے ذہنِ انسانی کو آراستہ کیا جس کے پیشِ نظر انسان خدائے قدیر و جبار کی ہیبت و جلال کے سامنے ہمیشہ سرنگوں رہے گا۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے دستِ پاک سے چند مریضوں کو شفایاب ہوتے ہوئے اور چند مُردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک طبقے نے انہیں خدا بنا لیا تھا۔ مگر حریمِ نور میں خرام ناز فرمانے والے مقامِ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ پر سرفراز ہونے والے

جلوت کدۂ محبوب میں اپنے محبوب حقیقی کو سر کی آنکھوں سے دیکھنے والے رسولِ عالی وقار ﷺ وہاں بھی بہ ہمہ صفت محبوب بشانِ بندگی ہی تشریف لے گئے۔ چنانچہ قرآن عظیم نے اس سفر عظیم کی حکایت ان الفاظ میں کی ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾

(بنی اسرائیل: آیت 1)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرایا اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصی تک۔

ثابت ہوا کہ یہ کائنات بلند و رفیع جس کے سفر عظمت کی گرد راہ ہے جب وہ بھی بندے ہی ہیں تو پھر تو کائنات کی کوئی اور شے معبود کیوں ہو سکتی ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے اور ان کے فرائض نبوت میں سے ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ جو جملہ انبیائے سابقین کی اُمّتوں نیز اپنی اُمّت کے اعمال و کردار کی گواہی دیں۔ چنانچہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے: ترجمہ: ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ اور سراج منیر بنا کر بھیجا۔

(لاحزاب: آیت 25-26)

ان کے منصب جلیل کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام انبیا کو اور ان کی اُمتوں کو بچشمِ خود ملاحظہ فرمالیں، ان کے احوال کا جائزہ لے لیں۔ تاکہ خدائے وحدہ قدوس کی بارگاہ میں گواہی دے سکیں۔ چنانچہ معراج مقدس کے سفر میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام تا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام انبیائے کرام سے ملاقات کی، اُن کی اُمّتوں اور ان کے جملہ اعمال کا مشاہدہ فرمایا۔

سید عالَم ﷺ کو امام الاولین والآخرین بنا کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ زمانے کے اعتبار سے تو سب کے بعد میں تشریف لائے لیکن اپنے منصب و مرتبے کے اعتبار سے آپ تمام انبیا کے سردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ واجب الوجود جل جلالہ نے شاہ کارِ عالَمِ ایجاد ﷺ کے متعلق روزِ ازل ہی تمام انبیائے کرام سے وعدہ لیا تھا۔

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴾[آل عمران: آیت 81]

”اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا؟ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔“

یہی وہ میثاقِ ازلی تھا جس کے پابند تمام انبیائے کرام تھے۔ چنانچہ شب معراج مسجد اقصی میں تمام انبیائے کرام؛ حضور ﷺ کے استقبال کے لیے موجود تھے اور جب نماز کا وقت آیا تو انبیائے کرام نے حضور ﷺ کو اپنا امام بنایا، تاکہ ان کا سید المرسلین اور امام الانبیاء ہونا ایک امر مشاہد بن جائے اور کائنات مشاہدہ کرلے کہ سب سے بعد میں تشریف لانے والے آج سب رسولوں کے امام ہیں۔

جملہ انبیائے کرام کے فرائض نبوت میں سے ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی بشارت دیں اور اپنے اپنے عصر نبوت میں اپنی اُمّتوں کو نبی اُمّی ﷺ کے عصر رحمت کے بارے میں بتائیں۔ چنانچہ قرآن عظیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقصد بعث کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ﴾[الصف: آیت 6]

”اور جب فرمایا عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے اے بنی اسرائیل میں تمہاری جانب اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ میں اس توریت کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے ہاتھوں میں ہے اور اُس رسول کی بشارت دے رہا ہوں جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہو گا۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرائض نبوت میں دو اہم ترین فرض تھے؛ اول توریت کی تصدیق اور دوم سید المرسلین ﷺ کی بشارت تاکہ دنیا ان کی آمد سے پہلے ہی ان کے لیے دیدۂ انتظار

بنی رہے اور جب نبی آخر الزماں ﷺ تشریف لائیں تو لوگ ان کے روئے زیبا کو توریت و انجیل کے آئینے میں دیکھ کر ایمان لائیں۔ دوسرے لفظوں میں تمام انبیائے کرام کی ذمہ داری تھی کہ کائنات انسانی کو رسولِ عالم پناہ ﷺ کے قدموں میں پہنچادیں اور حضور اکرم ﷺ کا منصب یہ تھا کہ وہ کائنات کو خدائے وحدہٗ قدوس کے قربِ خاص میں لے جائیں۔ اسی لیے صرف رسولِ پاک ﷺ کو معراج کرائی گئی کہ بالآخر کائنات انہیں کے آستانے سے خدائے پاک کے جلوؤں سے آشنا ہوگی۔

جب خدائے قدیر کو منظور ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت جیسی عظیم الشان کتاب زندگی عطا فرمائے تو اس نے انہیں کو طور پر جانے کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حضور میں کلام خدا کے ساتھ جمالِ خداوندی کی بھی تمنا کی مگر ان کے عشق، ان کے درد اور ان کے سوزِ دروں کے جواب میں ہمیشہ ﴿لَن تَرَانِي﴾ کا مقدس جملہ سنائی دیتا رہا لیکن فخر انبیا ﷺ کو رب العزت نے اس عزت و شان کے ساتھ اپنے قربِ خاص سے نوازا کہ جناب جبرئیل بارگاہِ رسول ﷺ میں حاضر ہوئے۔ عرش سے لے کر فرش تک ملائکہ قطار اندر قطار پیشوائی کے لیے ایستادہ ہوئے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیائے کرام اپنے قلوبِ مبارک میں اشتیاقِ ملاقات لیے سراپا انتظار بنے رہے۔ آسمانوں کی رفعتوں کو صدیوں کے انتظار کے بعد نبی رحمت پیغمبر اعظم ﷺ کے قدم چومنے کا موقع ملا اور اس طرح سید المرسلین ﷺ کے ساتھ کون ومکاں کی وسعتوں کو بھی معراج ملی۔

تیری معراج محمد تو ہے قُربِ معبود
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

اور جب واپس تشریف لائے تو اپنی گنہگار اُمّت کو بھی لذتِ معراج اور کیفِ قُربِ خداوندی سے آشنا کرنے کے لیے نماز کا تحفہ لے کر آئے۔

﴿اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِینَ﴾

نماز مومنوں کی معراج ہے۔

(مقالات خطیب اعظم)

وصیت آدم، دعائے خلیل، بشارت عیسی کے مجموعۂ عطر بیز ہیں ہمارے آقا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

افتخار العلماء حضرت علامہ افتخار احمد قادری مدنی صاحب قبلہ مدظلہ العالی

عالم کے سارے اربابِ عقل و دانش اولیتِ آدم علیہ السلام پر متفق ہیں؛ خواہ عیسائی ہوں، یہودی ہوں، مجوسی ہوں یا کسی اور مذہب کے فالوور ہوں۔ سب کا اتفاق ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سب کے پہلے باپ ہیں۔ دنیا بھر کے سبھی انسان حضرت آدم کو اپنا پہلا باپ مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی کا ادنیٰ بھی اختلاف نہیں، یعنی حضرت آدم دنیا کے پہلے انسان ہیں۔ انہی سے سارے انسانوں کو وجود ملا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دنیا میں جلوہ گر ہونے پر ہزارہا ہزار سال اور بے شمار صدیاں بیت چکی ہیں۔ اس عہدِ قدیم سے ہمارے آقا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ذکر جمیل حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی زبانوں پر جاری و ساری رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام آسمانی دنیا سے آقا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ذکر جمیل اپنے ساتھ لے کر اس خاکدان گیتی میں جلوہ نما ہوئے تھے کیونکہ آسمانوں میں انہوں نے سرکار کا ذکر جابجا دیکھا تھا، بلکہ اپنے رب کی بارگاہ میں برسہا برس تک توبہ کرتے رہے مگر قبول توبہ کا دروازہ نہ کھل سکا۔ مگر جب آپ کو نام "محمد" یاد آیا جسے آپ نے عرش کے ستونوں اور جنت کے دروازوں اور دیگر مقامات پر دیکھا تھا اور اب جب اس نام مقدس کے وسیلے سے آپ نے بارگاہِ رب میں توبہ عرض کی تو اب بابِ اجابت کھل گیا۔ (موطا امام مالک)

اور ایک مدتِ دراز سے جو اضطرابی کیفیت تھی وہ ختم ہو گئی۔

یہ ہے اسم محمد کا جلوہ، عز و عظمت اور وقارِ اعزاز کہ حضرت آدم باپ کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی اپنے فرزندِ ارجمند کے نامِ نامی سے باب اجابت وا فرماتے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ہمارے نبی مکرم ﷺ کا ذکرِ جمیل ابتدائے آفرینش سے جاری ہے۔ اب آئیں نگاہِ فرح سے درج ذیل حدیث پڑھیں اور اپنی آنکھوں کو جلا بخشیں۔

اس حدیث کے راوی بھی سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب سیدنا آدم سے لغزش ہوئی تو انہوں نے اس طرح عرض کیا: اے میرے رب! محمد ﷺ کے وسیلے سے مجھے بخش دے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: تم نے محمد کو کیسے پہچانا؟ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! جب تو نے مجھے اپنے دستِ اقدس سے پیدا فرمایا اور مجھ میں اپنی روح پھونکی، میں نے اپنا سر اٹھایا تو عرش کے ستونوں پر ﴿لا إله إلا الله محمد رسول الله﴾ لکھا دیکھا۔ تب میں نے جانا کہ تو نے جس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملایا ہے، یقیناً وہ ذات خلائق میں تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم نے سچ کہا۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا۔

(الخصائص الکبری، صفحہ 12، جلد 1، باحوالہ حاکم، بیہقی و طبرانی سخی)

کیسی خوبصورت، ایمان کو جلا بخشنے والی اور روح کو تازگی دینے والی حدیث ہے! ایک اور ایمان افروز حدیث ملاحظہ ہو: حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے شیث کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: اے بیٹے! تم میرے بعد میرے خلیفہ و نائب ہوگے۔ میری وصیت کو تقویٰ کی عمارت اور مضبوط رسی سے تھام لو، (یعنی پوری قوت سے میری وصیت کو پکڑو) جب بھی تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اسی دم اسمِ محمد کو بھی یاد کرو۔ اس لیے کہ ان کا نام نامی میں نے عرش کے ستونوں پر لکھا دیکھا ہے۔ پھر میں نے آسمانوں کی سیر کی تو میں نے دیکھا کہ آسمانوں میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں نامِ محمد لکھا نہ ہو۔ پھر میرے رب نے مجھے جنت میں سکونت عطا فرمائی تو کیا دیکھا کہ جنت میں کوئی محل اور کوئی ایسا کمرہ نہیں جہاں نامِ محمد لکھا نہ ہو۔ حورانِ بہشت کے سینوں پر میں نے نامِ محمد لکھا پایا۔ جنت کی جھاڑیوں کے پتوں پر، شجرِ طوبیٰ کے پتوں پر، سدرۃ المنتہیٰ کے پتوں پر، حجابات کے اطراف پر اور فرشتوں کی آنکھوں کے درمیان اسمِ محمد لکھا دیکھا۔ اس لیے اے بیٹے! ان کا خوب چرچا کرو، کیونکہ سارے ملائکہ ہر ساعت ان کے ذکرِ جمیل میں مصروف ہیں۔ (الخصائص الکبری، صفحہ 12، باحوالہ ابن عساکر)

اس حدیث میں ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ کی کیسی جلوہ سامانی ہے اور رفعت ذکر مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثّناء کے کیسے حسین اور جمیل ہیں! یہ مناظر چشمِ محبت سے دیکھیں تو دیکھتی ہی جائیں اور اپنی آنکھوں میں نور بھرتی چلی جائیں اور نورِ ایمان میں اضافہ کرتی چلی جائیں۔

ورفعنا لک ذکر کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے تیرا، ذکر ہے اونچا تیرا

ابھی دنیا میں انسانوں کا وجود نہیں ہوا ہے، کوئی متنفس انسان اس دنیا میں موجود نہیں، اس وقت بھی ذکرِ مصطفیٰ ان مقاماتِ عالیہ میں، عرش کی رفعتوں میں، سدرہ کی بلندیوں پر جلوہ گر ہے۔ **فسبحان ما أعظم شأنه حبيبُ الاجمل۔**

تیری خلق کو حق نے عظیم کہا، تیری خلق کو حق نے جمیل کہا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہو گا شاہ، تیرے خالق کے حسن و ادا کی قسم
تیرا مسندِ ناز ہے عرشِ بریں، تیرا محرمِ راز ہے روحِ امیں
تو ہی سرورِ ہر دو جہاں ہے شاہ، تیرا مثل نہیں ہے خدا کی قسم

دعائے خلیل:

سیدنا ابراہیم و سیدنا اسماعیل علیہما السلام دونوں مقدس ہستیاں اللہ کے گھر کی تعمیر میں مصروف ہیں اور دونوں کی زبانوں پر یہ دعا جاری ہے:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ (بقرہ:127)

اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ عمل قبول فرما، بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

اسی دعا کے تسلسل میں سیدنا ابراہیم خلیل علیہ السلام نے عرض کیا:

﴿رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ (بقرہ:129)

اے ہمارے رب! ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے مبعوث فرما جو ان کو پڑھ کر سنائے تیری آیتوں کو، سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور انہیں پاک صاف کرے، بے شک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

حضرت خلیل علیہ السلام اپنے ربُّ العزت سے التجا کر رہے ہیں ایسے جلیلُ القدر رسول کی بعثت کی جس کا دامنِ رحمت اتنا کشادہ اور مائدۂ کرم اتنا وسیع ہو کہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکے اور نور کا اکتساب کر سکے۔

سیدنا خلیل کی یہ التجا شرفِ قبولیت سے باریاب ہوئی اور آنے والے اسی رسولِ محتشم اور نبی مکرم ﷺ نے ربِّ ذوالجلال کی آیاتِ بینات اور انوارِ لامعات سے عالم کے گوشے گوشے کو منور فرمایا اور اپنے نور سے دنیا کے چپے چپے کو روشن و تابندہ اور درخشاں کر دیا۔ اب آنے والے نبی کی مبارک تعلیمات اور روشن ہدایت سے عالم کا کوئی حصہ محروم نہیں۔

اب ذرا حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطالعہ بھی کیجیے، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ، وَبِشَارَةُ عِيسَى عَلَيْهِمَا السَّلَامُ﴾ (الخصائص، صفحہ 16، جلد 1)

نبی کائنات ﷺ فرماتے ہیں: "میں اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیم کی دعا اور حضرت عیسیٰ کی بشارت ہوں۔"

یعنی ہمارے آقا ﷺ سیدنا خلیل کی دعاؤں کا کتنا خوبصورت نتیجہ ہیں! اس دعائے مبارکہ کے قرآنی الفاظ بھی آپ نے ملاحظہ کر لیے ہیں۔ سرکار کے جدِ اعلیٰ سیدنا خلیل نے کتنی آرزو اور منتوں سے ہمارے آقا کی بعثت کی دعا عرض کی ہے اور یہ خلیل تو خلیل اللہ ہیں، ان کی دعا کیسے رد ہو سکتی ہے۔

سرور کہوں یا مالک و مولیٰ کہوں تجھے
باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے

انہیں خلیل اللہ سے امت محمدیہ کو ایک عظیم تحفہ ملا، شب معراج سیدنا خلیل علیہ السلام نے اپنے اس فرزند دلبند کو فرمایا: اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہیے، جنت کی زمین مشک کی ہے، اور حکم دیا کہ اسے آباد کریں۔

سرکار ﷺ نے عرض کیا: کس سے یہ زمین آباد ہوگی؟ سیدنا خلیل نے فرمایا:

﴿سبحان اللہ، الحمد للہ، لا إلہ إلا اللہ، اللہ اکبر﴾

وغیرہ کے کلماتِ طیبہ سے یہ زمینِ جنت معمور ہو گی۔ سبحان اللہ!

اقرآن ناطق ہے: ﴿ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ﴾ (الصف:6)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سرکار کی آمد سے پانچ صدیوں سے بھی زیادہ عرصہ پیشتر دنیا کو یہ عظیم خوشخبری سنا رہے ہیں اور سرکار کے نام نامی "احمد" کے ساتھ یہ بشارت دے رہے ہیں۔ سرکار کی رفعت شان کتنی لاثانی ہے۔ انبیا علیہم السلام کے پورے طبقات میں کسی طبقے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

تیری مثل نہیں ہے خدا کی قسم

اس آیتِ کریمہ میں روح اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو یہ مژدہ دے رہے ہیں کہ میں تمہیں ایک بڑی روح پرور خوشخبری دے رہا ہوں؛ وہ یہ کہ میرے بعد ایک جلیلُ القدر اور عظیمُ المرتبت رسول تشریف لائے گا، اس کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی "احمد" ہو گا ﷺ۔

سید الکائنات ﷺ کے اسماءِ حسنیٰ صحیح حدیث سے ثابت ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿إِنَّ لِي أَسْمَاءً: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَحْمَدُ، وَالْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمِي﴾

(مالک، بخاری، مسلم وغیرہ)

حضور نے فرمایا: "میرے کئی نام ہیں؛ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، اور میں حاشر ہوں، لوگوں کا حشر میرے قدموں پر ہو گا۔"

صحابہ کرام میں حضور کا اسمِ گرامی "احمد" معروف و مشہور تھا چونکہ قرآن میں یہ وارد ہوا ہے، اور حضرت حسان یہی نام لے کر بارگاہِ رسالت میں صلوۃ و سلام عرض کرتے ہیں:

صلی الالہ و من یحف بعرشہ

و الطیبون علی المبارک احمد

اللہ تعالیٰ، حاملین عرش اور تمام پاکیزہ لوگ اس مبارک ہستی پر درود و سلام بھیجتے ہیں جس کا اسمِ گرامی "احمد" ہے۔

"احمد" کا معنی ہے ﴿احمد الحامدین لربه﴾ تمام حمد کرنے والوں سے بڑھ کر اپنے رب کی حمد کرنے والا۔ اپنے رب کی حمد کی کثرت کی برکت سے ہی آپ محمد بھی بنے۔ ﴿فاحمد هو الذی حمده مرة بعد مرة﴾ یعنی جس کی بار بار حمد کی جارہی ہو وہ محمد ہے۔ نہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرنے میں آپ کا کوئی مثیل ہے۔ کوئی فرشتہ، کوئی رسول، کوئی نبی اپنے رب کی حمد سرائی اور ثنا گستری میں اس مقام پر نہیں پہونچا اور نہ پہنچ سکتا ہے جس مقام پر اللہ تعالیٰ کا یہ پیارا حبیب فائز ہے۔ اسی طرح مخلوق میں سے جتنی حمد جتنی ثنا اس محبوب کی ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی کسی اور کو نصیب نہیں۔ جن و انس اس کے ثناخوان ہیں۔ حور و ملک اس کی ستائش میں رطب اللسان ہیں۔ راقم عرض کرتا ہے کہ خود خدا بھی اس کی مدح فرما رہا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىٕكَتَهٗ الخ﴾ کی تفسیر میں بخاری شریف میں ہے ﴿ثنائہ علیہ﴾ رب تعالیٰ کے درود کا معنی ہے کہ رب العزت اپنے حبیب کی ثنا و مدح فرما رہا ہے۔ اس محمد کی ثنا و تعریف صرف خلائق ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ خالق الخلق اپنے حبیب کی مدح و ثنا مسلسل فرما رہا ہے۔ صرف اس فانی دنیا ہی میں نہیں بلکہ عالم آخرت میں بھی حضور کی شان کیا شان ہوگی۔ حقیقت یہ ہے اس شان محمدیت کی تابانیوں کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب دست مبارک میں لوائے حمد تھامے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ حبیب مقام محمود پر جلوہ نما ہوگا۔ رب ذوالجلال کے لطف و کرم کا یہ انداز بھی بڑا نرالا ہے کہ سید کائنات ﷺ سے پہلے کبھی کسی شخص نے اپنے بیٹے کا نام "احمد" نہیں رکھا تاکہ اس بشارت کے مصداق کے بارے میں ذرا بھی شائبہ و شک پیدا نہ ہو۔ لیکن جب اس اسم کو ذات پاک مصطفوی سے نسبت ہوگئ تو یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ اب اسی نام کے لوگوں کا شمار ناممکن ہوگیا۔ کیونکہ آقائے کائنات ﷺ سے قبل بعثت محمدی کا چرچا عام تھا۔ یہ بات مشہور ہوچکی تھی کہ ایک نبی آنے والا ہے جس کا نام "محمد" ہوگا چنانچہ بعض والدین نے اپنے بچوں کے نام محمد تجویز کیے کہ شاید یہ سعادت ان کے حصہ میں آجائے۔ سرکار ﷺ سے قبل سات ایسے آدمی ملتے ہیں جن کا نام محمد ہے لیکن ان میں سے کسی نے نبوت کا دعوی نہیں کیا۔ س طرح اللہ رب العزت نے اپنی خاص حکمت سے اپنے حبیب ﷺ کے ان دو ناموں کو ہر اشتباہ و شک سے بالاتر رکھا۔ (ضیاء القرآن، ج5، ص213-214)

حضرت عیسی علیہ السلام نے مختلف اسلوب میں سید انبیا کی آمد آمد کی بشارتیں دی ہیں مثلا ایک موقع پر فرماتے ہیں: میرے بعد وہ ہستی تشریف لائے گی جو تمام انبیا اور نفوس قدسیہ کے لیے آب و تاب ہے اور پہلے انبیا نے جو باتیں کی ہیں ان پر یہ ہستی روشنی ڈالے گی کیونکہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

ایک اور موقع پر حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا: بے شک میں تو فقط اسرائیل کے گھرانے کی نجات کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں لیکن میرے بعد مسیحا تشریف لائے گا جسے اللہ تعالیٰ سارے جہاں کے لیے مبعوث فرمائے گا۔

اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات تخلیق کی ہے اور اسی کی کوششوں کے باعث ساری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے گی اور اس کی رحمت نصیب ہو گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اور فرمایا: مسیحا (محمد) کا نام قابل تعریف ہے، اللہ تعالیٰ نے جب ان کی روح مبارک کو پیدا کیا اور آسمانی آب و تاب میں رکھا پھر ان کا نام خود رکھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! انتظار کرو میں نے تیری خاطر جنت کو پیدا کیا اور بے شمار مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ جب میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا تو تمہیں نجات دہندہ بنا کر بھیجوں گا۔ تیری بات سچی ہو گی۔ آسمان و زمین فنا ہو سکتے ہیں لیکن تیرا دن کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کہا" محمد "اس کا بابرکت نام ہے، پھر تمام سامعین نے یہ سن کر یہ کہتے ہوئے فریاد کرنی شروع کی۔ اے خدا! اپنے رسول کو ہماری طرف بھیج، یارسول اللہ! دنیا کی نجات کے لیے جلد تشریف لے آیئے۔ (بحوالہ سابق)

متعدد ممالک کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی بشارت:

مقالہ کی طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک بادشاہ سیف بن ذی یزن کی بشارت پر اکتفا کیا جا رہا ہے، سیف یمن کا بڑا حکمراں گزرا ہے، میں اپنی تالیف " الادب الجمیل " سے سیف بن ذی یزن کی خوشخبری کے الفاظ درج کر رہا ہوں:

جب بادشاہ سیف حبشیوں کو یمن سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کو فتح کی مبارک باد و تہنیت پیش کرنے کے لیے مکہ مکرمہ سے قریش کا ایک وفد بھی یمن پہنچا، اس وفد کے سربراہ سرکار کے جد امجد حضرت عبد المطلب تھے۔ جب حضرت عبد المطلب بادشاہ کے قریب پہنچے اور گفتگو کرنے کا اذن طلب کیا۔ سیف نے کہا: اگر تمہیں بادشاہوں کے دربار میں کلام کرنے کا سلیقہ آتا ہو تو تمہیں اجازت ہے۔

حضرت عبد المطلب نے کہا: اے بادشاہ اللہ تعالیٰ نے تجھے جلیل القدر منصب پر فائز کیا ہے، تو حسب و نسب کے اعتبار سے قابل رشک ہے، تو سارے عرب کا سردار ہے، تو اس کی وہ بہار ہے جس سے سارا عرب سرسبز و شاداب ہے، تیرے بزرگ ہمارے لیے بہترین سلف تھے اور تو ان کا بہترین خلف ہے، جن کا جانشین تیرے جیسا ہو وہ فنا نہیں ہو گا، اور جس کے آباو اجداد تیرے آباو اجداد کی طرح ہوں وہ کبھی گمنام نہیں ہو گا۔ اے بادشاہ ہم اللہ تعالیٰ کے حرم کے رہنے والے ہیں اور اس کے گھر کے خدام ہیں، ہم تیری خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرنے کے لیے آئے ہیں۔

سیف نے کہا: اے گفتگو کرنے والے! اپنا تعاف کراؤ۔

حضرت عبد المطلب نے کہا: میں عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف ہوں۔

بادشاہ نے کہا: پھر تو تم ہمارے بھانجے ہو۔

آپ نے فرمایا: بے شک۔

بادشاہ نے کہا: مرحبا اور خوش آمدید، تمہارے لیے یہاں اونٹنی بھی ہے اور کجاوہ بھی، اور خیمہ زن ہونے کے لیے وسیع میدان بھی اور ایسا بادشاہ جو عظیم الشان ہے جس کی جود و عطا کی حد نہیں۔ میں نے تمہاری گفتگو سنی اور تمہاری قریبی رشتہ داری کو پہچان لیا ہے اور تمہارے وسیلہ کو قبول کیا ہے۔ جب تک تم یہاں اقامت گزیں رہو گے تمہاری ہر طرح عزت و تکریم کی جائے گی۔

ایک ماہ تک یہ وفد شاہی مہمان رہا، سیف نہ انہیں واپس جانے کی اجازت دیتا اور نہ انہیں اپنی ملاقات کا موقع دیتا پھر اچانک اس نے ایک روز علیحدگی میں حضرت عبد المطلب کو بلایا اور ان کو اپنی مخصوص محفل میں شرفیابی بخشا اور ان سے کہا: اے عبد المطلب! میں اپنا ایک راز تمہارے سامنے افشا کرنا چاہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ تم اسے فاش نہ کروگے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنے کی اجازت دے۔ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس کو ہم سب سے مخفی رکھتے ہیں، ہم نے اسے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے کسی غیر کو اس پر آگاہ نہیں ہونے دیتے، اس میں آپ کے لیے ایک خصوصی فضیلت مرقوم ہے۔

حضرت عبد المطلب نے کہا: اے بادشاہ! خدا تمہیں خوش رکھے اور نیکی کی توفیق دے۔ وہ کیا ہے؟

بادشاہ نے کہا: کہ جب تھامہ میں ایک بچہ پیدا ہو گا جس کے کندھوں کے درمیان ایک نشان ہو گا۔ وہ سارے عرب کا سردار ہو گا اور اس کے ذریعہ تمہیں بھی سارے عرب کی قیادت نصیب ہو گی روز قیامت تک۔

حضرت عبد المطلب نے کہا: اگر بادشاہ سلامت اجازت دیں تو میں درخواست کروں گا کہ وہ اس بشارت کی تفصیل بیان کریں تاکہ میری خوشی میں اضافہ ہو۔

بادشاہ نے کہا: اس بچے کی پیدائش کا زمانہ آگیا ہے، یا وہ پیدا ہو چکا ہے، اس کا نام "محمد" ہے۔ اس کے دونوں کندھوں کے درمیان نشان ہے۔ اس کے والد اور ماں فوت ہوں گے۔ اور اس کے دادا اور چچا اس کی کفالت کریں گے۔ وہ اللہ رحمٰن کی عبادت کرے گا اور شیطان کو ٹھکرا دے گا۔ آگ کو بجھا دے گا۔ بتوں کو توڑ دے گا۔ اس کی بات فیصل کن ہو گی۔ اس کا حکم سراپا انصاف ہو گا۔

حضرت عبد المطلب نے کہا: اے بادشاہ! تیرا ہمسایہ ہمیشہ باعزت رہے اور تو ہمیشہ سعادت مند رہے۔ تیری عمر لمبی ہو، تیری حکومت ہمیشہ رہے کیا تو مزید وضاحت کرنے کی زحمت گوارا کرے گا۔

سیف بن ذی یزن نے کہا: اس کے غلافوں والے گھر کی قسم! اے عبد المطلب تو ہی اس کا دادا ہے اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ حضرت عبد المطلب سجدے میں گر پڑے۔ بادشاہ نے کہا: سر اٹھایئے، تیرا سینہ ٹھنڈا ہو۔ کیا تو نے اس چیز کو محسوس کیا ہے جس کا میں نے تیرے سامنے ذکر کیا ہے؟

حضرت عبد المطلب نے کہا: بے شک اے بادشاہ! بے شک میرا ایک بیٹا تھا جس پر میں فریفتہ تھا، میں نے اس کی شادی ایک عفت شعار خاتون سے کی جس کا نام آمنہ بنت وھب ہے۔ اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا میں نے محمد نام رکھا۔ اس کے باپ اور ماں فوت ہو چکے ہیں، میں اور اس کا چچا اس کی کفالت کرتے ہیں۔ اس کے کندھوں کے درمیان ایک نشان ہے اس میں وہ تمام علامتیں موجود ہیں جن کا تو نے ذکر کیا ہے۔

سیف نے کہا: پھر تو اپنے اس بچے کی حفاظت کیا کرو اور یہود سے محتاط رہا کرو کیونکہ وہ اس کے دشمن ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں کبھی اس پر غالب نہیں ہونے دے گا۔ اور جو باتیں میں نے تم سے کی ہیں ان سے اپنے ساتھیوں کو بھی مت آگاہ کرنا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ حسد نہ کرنے لگیں۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ ان کی بعثت سے پہلے میں موت کی آغوش میں جانے والا ہوں اگر مجھے موت مہلت دیتی تو میں اپنے گھوڑوں اور پیدل فوج کے ساتھ یثرب (مدینہ) جاتا جو شہر مدینہ کہ اس کا دار السلطنت ہو گا۔ اس شہر میں سکونت کر کے یثرب (مدینہ) کو اپنا دارالسلطنت بناتا۔ کیونکہ میری کتاب میں یہ لکھا ہے کہ یثرب میں اس کا دین مستحکم ہو گا۔ اسی شہر میں آپ کا مدفن ہو گا اور وہاں کے لوگ آپ کے انصار ہوں گے۔

(الادب الجمیل ص 13-14-15 بحوالہ البدایۃ والنھایۃ، ج2 ص 328-330)

حضرت حسان بن ثابت نے کیا عمدہ فرمایا:

و شق لہ من اسمہ لیجلہ
فذو العرش محمود و ھذا محمد

حضور کے اسم گرامی کو رب العزۃ نے اپنے نام سے مشتق کیا، رب کائنات محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔ یعنی خالق و مخلوق سب اس کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں۔

سیرت اور امن عالم

اداریہ

پیغمبرِ امن کی سیرت: عالمی امن کا ابدی چارٹر

ابتدائیہ:

امن ایک ایسی نعمت عظمی ہے جس کے متلاشی نہ صرف انسان ہیں بلکہ اللہ رب العزت کی ہر وہ مخلوق ہے جو اس کرۂ ارض پر سانس لے رہی ہے۔ انسان ہوں کہ چرند و پرند ہر ایک امن و سکون اور خیر و سلامتی کے خواہاں ہیں۔ امن عالم ہر عہد کی ایک ناقابل فراموش حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے ہے، اس لیے اللہ رب العزت نے ابتدائے آفرینش سے ہی عالم میں امن و امان کے قیام کے لیے حضرات انبیا و رسل علیہم السلام کا مقدس قافلہ تدریجا مبعوث فرمایا، ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر کلیم اللہ سیدنا موسی علیہ السلام تک اور سیدنا موسی علیہ السلام سے روح اللہ سیدنا عیسی علیہ السلام تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا علیہم السلام میں سے ہر ایک نے اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ جس چیز کو بطور خاص اپنی تبلیغ و ارشاد کا محور بنایا وہ ہے عالم میں امن و سلامتی کا قیام۔

تو نے دیکھا ہی نہیں فطرتِ اسلام کا رنگ
ہم نفس ! دین محمد ہے محبت کا نظام

ایک دستور کہ آدم ہے عظیم
ایک قانون کہ انسان ہے اخلاق کا نام

امن، اخلاق ، محبت ، رہِ تسلیم و رضا
دین اسلام نے آدم کو یہ پیغام دیا

تمام انبیا کا یہ مشن رہا کہ وہ مخلوق خدا کو دنیا کے خالق ومالک کا مطیع، تابع اور فرماں بردار کردیں اور اس دنیا کو ظلم و ستم، فتنہ و فساد اور بدامنی سے پاک وصاف کر کے امن وامان اور خیر وسلامتی کا گہوارہ بنادیں۔ حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد رسول مکرم، نبی محتشم، سیدنا رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم آخری نبی بن کر اس خاک دان گیتی پر جلوہ گر ہوئے، آپ آخری نبی ہیں، آپ پر نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اب آپ کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾(1)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے آخر میں تشریف لانے والے ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

آخری نبی ہونے کے سبب اب قیامت تک کے لیے امن عالم کی ذمہ داری آپ ﷺ کے دوش مبارک پر آئی اور آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کو بتمام وکمال ادا فرمایا چنانچہ تاریخ وسیر کے جاننے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے مقدس ارشادات وفرامین اور اپنی مساعی جمیلہ کے ذریعہ ظلمت کدۂ عالم سے جبر واستبداد اور شر وفساد کو مٹا کر عالم کو امن وسکون کی جنت سے ہمکنار فرمایا اور دنیا کو امن عالم کا ایسا نسخۂ کیمیا عطا فرمایا جو ہر قوم، ہر معاشرہ اور ہر عہد کے لیے ہر قسم کی بدامنی، شر وفساد، ظلم وبربریت جیسے مہلک امراض کا یقینی علاج ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا وہ پہلو ہے جس کا اعتراف اغیار کو بھی ہے۔ مشہور برطانوی فلسفی جارج برنارڈشا (Sir George Bernard Shaw) آپ ﷺ کو انسانیت کا نجات دہندہ تسلیم کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ورفعت کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے:

”اور میرا یقین ہے کہ اگر محمد (ﷺ) جیسے شخص کو جدید دنیا کی مطلق العنان حکومت سونپ دی جائے تو وہ اس دنیا کے مسائل اس طرح سے حل کرے گا کہ دنیا حقیقی مسرّتوں اور راحتوں سے بھر جائے گی۔ میں نے انہیں پڑ

ھا ہے۔ وہ کسی بھی طرح کے مکر و فریب سے کوسوں دُور ہیں انہیں بجاطور پر انسانیت کا نجات دہندہ کہا جاسکتا ہے۔ میں نے پیشگوئی کی تھی کہ محمد (ﷺ) کا عقیدہ یورپ کے لئے آنے والے کل میں اتنا ہی قابلِ قبول ہو گا کہ جتنا آج قابلِ قبول بننے لگا ہے۔"(2)

جارج برنارڈشا کے یہ الفاظ یوں ہی نہیں صفحۂ قرطاس کی زینت بنے ہیں بلکہ اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ و السلام کی مبارک تعلیمات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ الفاظ سپرد قرطاس ہوئے ہیں جو یقیناسیرت نبوی کا ایک اعجازی پہلو ہے کہ غیروں کو بھی حضور اکرم ﷺ کی امن پسندی سے مجال انکار نہیں۔ سچ کہا شاعر نے

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

امن عالم کے سلسلے میں پیغمبر امن ص ﷺ کی مساعی جمیلہ اور مبارک ارشادت و ہدایات کو پڑھنے سے قبل بعثت نبوی کے وقت دنیا میں ظلم و بربریت اور فتنہ و فساد کا ایک مختصر جائزہ ناگزیر ہے۔ حضور کی بعثت ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ ظلم و ستم، فتنہ و فساد، قتل و خونریزی کا یہ وہ تاریک ترین دور تھا جس کے بیان کی قلم میں طاقت نہیں۔ ہر طرف کفر کا دور دورہ تھا۔ انسان انسان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ بیٹی کو زندہ در گور کرنا ایک فیشن تھا، عورت کو نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ایک آلہ تصور کیا جاتا تھا، قدیم مذاہب اور ان کے احکام و قوانین بازیچۂ اطفال بن چکے تھے، شر و فساد پر مشتمل باطل رسومات کا چلن عام تھا، فتنہ و فساد سریر عالم پر براجمان ہو کر دنیا کو فسق و فجور اور بد امنی کا گہوارہ بنا چکا تھا، عدل و انصاف کس چیز کا نام ہے کوئی جانتا نہ تھا، امن و سلامتی کا خاتمہ ہو چکا تھا، انسانیت کراہ رہی تھی، یہ صورت حال کسی ایک دو خطے یا کسی ایک دو قوم کی نہیں تھی بلکہ یہ سنگین صورت حال اس خاک دان گیتی پر بسنے والے تمام اقوام و ملل کی تھی اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اس تعفن زدہ ماحول سے تنگ آکر انسان آمادہ خود کشی تھا اور خود کو نذر آتش کر کے ہمیشہ کے لیے اس حولناک ماحول سے نجات کا طالب تھا، اس پر آشوب عہد کا نقشہ قرآن مقدس نے اس آیت میں یوں بیان کیا ہے۔

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًاۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ﴾(3)

ترجمہ: اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ پیدا کر دیا پس اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔

جی ہاں اس تعفن زدہ ماحول سے تنگ آکر انسان آمادۂ خودکشی تھا، آخری سانس لے رہی انسانیت اب دم توڑنا چاہ رہی تھی کہ اس دنیا کے خالق و مالک کو انسانوں پر رحم آیا اور اس نے آخری نجات دہندہ کے طور پر رسول مکرم، رحمت عالم، نبی آخر الزماں سیدنا رسول اللہ ارواحنا فداہ ﷺ کو اس خاک دان گیتی پر مبعوث فرمایا اور مکہ مکرمہ میں آفتاب امن کے طلوع ہوتے ہی افق عالم پر صبح امن نمودار ہو گئی۔ ظلم و ستم، جبر و استبداد، اخلاقی جرائم و ذمائم کی گھٹاٹوپ تاریکیاں چھٹ گئیں اور سارا جہان عدل و انصاف، امن و امان کے نور سے مستنیر ہو گیا۔

جہاں تاریک تھا، ظلمت کدہ تھا، سخت کالا تھا
کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا تھا

جان، مال اور عزت کی حفاظت:

اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو گا کہ امن و امان اور بدامنی کا تعلق درجہ ذیل چیزوں میں سے کسی ایک سے ضرور ہوتا ہے: جان۔ مال اور عزت

تاریخ عالم اس پر شاہد ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں فتنہ و فساد برپا ہوا، بدامنی کی فضا ہموار ہوئی اور چین و سکون غارت ہوا وہاں لازماً مذکورہ تین باتوں میں سے کسی ایک کے فقدان کی وجہ سے ہوا۔ پیغمبر اسلام سیدنا رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے جان و مال اور عزت و آبرو کی بحالی کے لیے جدوجہد فرمایا اور عالم میں بسنے والے بندگان خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کو یقینی بنا کر عالم سے شر و فساد کی بیخ کنی کی اور عالم انسانیت کو صبح امن سے سرفراز فرمایا۔ اس سلسلے میں رسول مکرم ﷺ کا درج ذیل ارشاد چشم انصاف سے پڑھیں اور اندازہ کریں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو کس قدر اہمیت دی ہے؟ اور کسی بھی انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو کس قدر محترم و مکرم قرار دیا ہے؟۔ ارشاد نبوی حضرت ابو بکرہ سے مروی ہے:

﴿ذَكَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَعَدَ عَلَى بَعِيرِهِ، وَأَمْسَكَ إِنْسَانٌ بِخِطَامِهِ أَوْ بِزِمَامِهِ قَالَ: «أَيُّ يَوْمٍ هَذَا»، فَسَكَتْنَا حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ سِوَى اسْمِهِ، قَالَ: «أَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ» قُلْنَا: بَلَى، قَالَ: «فَأَيُّ شَهْرٍ هَذَا» فَسَكَتْنَا حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ، فَقَالَ: «أَلَيْسَ بِذِي الحِجَّةِ» قُلْنَا: بَلَى، قَالَ: «فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ، وَأَمْوَالَكُمْ، وَأَعْرَاضَكُمْ، بَيْنَكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا"﴾(4)

ترجمہ: رسول مکرم ﷺ اپنے اونٹ پر سوار تھے، اور ایک صحابی (حضرت بلال) اس اونٹ کی مہار تھامے تھے۔ حضونے (صحابہ کو مخاطب کرکے) فرمایا: آج کون سا دن ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ ہم سب خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ حضور اس دن کا کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے۔ حضور نے فرمایا: کیا آج یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا بے شک آج یوم النحر ہے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ یہ کون سا مہینہ ہے۔ اس سوال کے جواب میں بھی ہم خاموش رہے اور ہم نے یہ گمان کیا کہ شائد حضور اس مہینے کا کوئی دوسرا نام تجویز کریں گے۔ حضور نے فرمایا کیا یہ ماہ ذوالحجہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا بالکل یہ ماہ ذوالحجہ ہے۔ اب آپ نے فرمایا بے شک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبرو تمہارے درمیان اسی طرح محترم ہے جس طرح تمہارے اس شہر اس مہینے میں آج کا دن محترم و مکرم ہے۔

حق و صداقت کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو یہ ایک ارشاد نبوی امن و سلامتی کا کامل نصاب، خیر و سلامتی کا ابدی و عالمی چارٹر اور اخوت و محبت، رافت و رحمت اور عزت و احترام کا ایک جامع دستاویز ہے۔ اس اجمال کے بعد ذیل میں بندگان خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت و صیانت کے لیے پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والثناء کی عظیم الشان مساعی جمیلہ کی تفصیل اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

حلف الفضول اور پیغمبر امن ﷺ:

آفتاب رسالت 12 ربیع الاول واقعہ فیل سے 50 روز بعد بمطابق 22 اپریل 571ء صبح صادق کے وقت مکہ مکرمہ کی سرزمین پر دوشنبہ کے دن طلوع ہوا۔ چھ سال کی عمر شریف تک آپ ﷺ اپنی والدہ ماجدہ طیبہ طاہرہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کی آغوش محبت میں پروان چڑھے۔ والدہ ماجدہ کے وصال کے بعد دادا سیدنا عبد المطلب کے آغوش

شفقت میں آ گئے۔ بچپن کا زمانہ دوسرے بچوں سے مختلف طہارت و پاکیزگی اور صداقت و شرافت کا آئینہ دار ثابت ہوا۔ بچپن سے ہی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صداقت و شرافت، امانت و دیانت۔ نظافت و طہارت، اخوت و محبت اور عدالت و مساوات کے پیکر رہے کہ بہت جلد آپ مکہ مکرمہ میں صادق و امین جیسے القاب سے مشہور ہو گئے اور عنفوان شباب میں قدم رکھتے ہی آپ کی صداقت و امن پسندی پورے علاقے میں ضرب المثل بن گئی۔ اسی زمانہ میں "حلف الفضول" کا واقعہ رونما ہوا جو مظلوم کی حمایت اور امن و امان کی ایک عمدہ کوشش تھی۔ ابھی پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام نے اعلان نبوت نہیں فرمایا تھا۔ اعلان نبوت سے قبل یہ واقعہ پیش آیا۔ چونکہ یہ تحریک مظلوم کی دادرسی اور امن و امان کے قیام کی ایک لائق تحسین کوشش تھی اس لیے پیغمبر امن سیدنا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نہ صرف اس تحریک میں شامل ہوئے بلکہ رکن اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی بھرپور خدمات بھی پیش کیں۔

کتب سیرت میں "حلف الفضول" کے واقع ہونے کا سبب یوں مرقوم ہے:

"بنو زبید کا ایک شخص مکہ میں کچھ مال تجارت لے کر آیا۔ اس مال تجارت کو (مکہ کے ایک شہری) عاص بن وائل نے خرید لیا لیکن اس سامان کی قیمت ادا نہیں کی۔ تاجر بنو زبید کے مانگنے پر عاص نے انکار کر دیا۔ تاجر بے چارا غریب الوطن۔ اس سے کچھ نہ بن سکا تو وہ بیت اللہ میں داخل ہوا اور قریش کے لوگوں سے اس معاملے کی شکایت کی اور کہا کہ میں ٹھہرا اجنبی اور غریب الدیار۔ کچھ مال تجارت لے کر بغرض تجارت آپ کے دیار میں آیا تھا لیکن عاص نے مال تجارت خریدنے کے بعد قیمت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور میں اپنی کمزوری اور غریب الوطنی کی وجہ سے اس سے اس مال کی قیمت لینے پر قادر نہیں ہوں۔ ہاں آپ لوگ عزو جاہ والے ہیں۔ اگر آپ لوگ میری مدد کریں تو غریب پر احسان ہو گا۔ غریب کی اس فریاد پر چند لوگوں نے اس کو یقین دلایا کہ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی۔ اس کو اس کے مال کی قیمت دلائی جائے گی۔ اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کلیدی کردار ادا کیا۔ چنانچہ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تحریک اور کوششوں کے نتیجے میں بنو ہاشم، بنو عبد المطلب اور خاندان زُہرہ و تَیم وغیرہ نے متحدہ طور پر اس تاجر کی مدد کے لیے حلف اٹھایا۔ حلف الفضول کے شرکا نے حلف اٹھا کر عہد کیا کہ ہم لوگ

(1) ملک سے بے امنی دور کریں گے

(2) مسافروں کی حفاظت کریں گے

(3) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے

(4) مظلوم کی حمایت کریں گے

(5) کسی ظالم یا غاصب کو مکہ میں نہیں رہنے دیں گے۔ (5)

اس مبارک حلف نامہ کے یہ الفاظ بھی پڑھیے اور شرکا کے جذبات کا اندازہ کیجیے۔

﴿بِاللہِ لَنَکُوْنَنَّ مَعَ الْمَظْلُوْمِ حَتّٰی یُؤَدّٰی اِلَیْہِ حَقُّہٗ مَا بَلَّ بَحْرٌ صُوْفَۃً﴾ (6)

ترجمہ: اللہ کی قسم! ہم سب مظلوم کی مدد کریں جب تک کہ ظالم اسے اس کا حق ادا نہیں کر دیتا۔ اور ہمارا یہ معاہدہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک سمندر صوفہ کو بھگوتا رہے گا۔

ظلم و ستم، فتنہ و فساد اور بد عہدی و بد امنی کے تاریک ترین دور میں یہ پہلا چراغ امن تھا جسے پیغمبر امن ﷺ نے روشن فرمایا اور دنیا نے پہلی بار عدل و انصاف کا منور و خوبصورت چہرہ دیکھنے کی سعادت حاصل کی۔ عدل و انصاف اور امن امان کا یہ سعادت آثار منشور رسول مکرم ﷺ کو اس قدر محبوب و پسندیدہ تھا کہ اعلان نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ اس کا تذکرہ فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں کتب حدیث میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے:

"اس معاہدہ سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر اس معاہدہ کے بدلے میں کوئی مجھے سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیتا تو مجھے اتنی خوشی نہیں ہوتی اور آج اسلام میں بھی اگر کوئی مظلوم یا" آل حلف الفضول "کہہ کر مجھے مدد کے لیے پکارے تو میں اس کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ (7)

یہ ارشاد "حلف الفضول" کے سالوں بعد کا ہے لیکن اس ارشاد کا ہر ہر لفظ اس امر کا غماز ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو عدل و انصاف بے حد محبوب تھا اور آپ کا مطمح نظر عالم میں امن و امان کا قیام اور دنیا کو فتنہ و فساد اور تباہی و بربادی کے ظلمت کدہ سے نکال کر امن و سکون سے ہمکنار کرنا تھا۔

امن ، اخلاق ، محبت ، رہ تسلیم و رضا
دین اسلام نے آدم کو یہ پیغام دیا

حجر اسود اور پیغمبر امن ﷺ:

اعلان نبوت سے قبل متعدد ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے آپ ﷺ کی راست بازی اور امن پسندی آفتاب عالم تاب کی طرح منور و تابناک نظر آتی ہے، ان ہی ایمان افروز واقعات میں سے تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے نصب کرنے کا واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اس واقعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر امن ﷺ اپنے عنفوان شباب میں اہل مکہ میں محترم و مکرم اور ایک امانت دار و راست باز، پر کشش شخصیت کے طور پر جانے اور مانے جاتے تھے۔ وہیں اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ ہر جگہ اور ہر حال میں عدل و انصاف، امن و امان اور خیر و سلامتی کو عملا نافذ کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "جب آپ ﷺ کی عمر پینتیس برس کی ہوئی تو زور دار بارش سے حرم کعبہ میں ایسا عظیم سیلاب آگیا کہ کعبہ کی عمارت بالکل ہی منہدم ہو گئی، حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کا بنایا ہوا کعبہ بہت پرانا ہو چکا تھا، عمالقہ، قبیلہ جرہم اور قصی وغیرہ اپنے اپنے وقتوں میں اس کعبہ کی تعمیر و مرمت کرتے رہے تھے مگر چونکہ عمارت نشیب میں تھی اس لیے پہاڑیوں سے برساتی پانی کے بہاؤ کا زور دار دھارا وادی مکہ میں ہو کر گزرتا تھا اور اکثر حرم کعبہ میں سیلاب آجاتا تھا۔ اس لیے قریش نے یہ طے کیا کہ عمارت کو ڈھا کر پھر سے کعبہ کی ایک مضبوط عمارت بنائی جائے جس کا دروازہ بلند ہو اور چھت بھی ہو۔ چنانچہ قریش نے مل جل کر تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس تعمیر میں حضور ﷺ بھی شریک ہوئے اور سرداران قریش کے دوش بدوش پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے رہے۔ مختلف قبیلوں نے تعمیر کے لیے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لیے۔ جب عمارت "حجر اسود" تک پہنچ گئی، تو قبائل میں سخت جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہر قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ ہم ہی "حجر اسود" کو اٹھا کر دیوار میں نصب کریں ۔تاکہ ہمارے قبیلہ کے لیے یہ فخر و اعزاز کا باعث بن جائے۔ اس کشمکش میں چار دن گزر گئے یہاں تک نوبت پہنچی کہ تلواریں نکل آئیں۔ بنو عبد الدار اور بنو عدی کے قبیلوں نے تو اس پر جان کی بازی لگا دی اور زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنی قسموں کو مضبوط کرنے کے لیے ایک پیالہ میں خون بھر کر اپنی انگلیاں اس میں ڈبو کر چاٹ لیں۔ پانچویں دن حرم کعبہ میں تمام قبائل عرب جمع ہوئے اور اس جھگڑے کو طے کرنے کے لیے ایک بڑے بوڑھے شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ کل جو شخص صبح سویرے سب سے پہلے حرم کعبہ میں داخل ہو اس کو پنچ مان لیا جائے۔ وہ جو فیصلہ کر دے سب اس کو تسلیم کر لیں۔ چنانچہ سب نے یہ بات مان لی۔ خدا عزوجل کی

شان کہ صبح کو جو شخص حرم کعبہ میں داخل ہوئے وہ حضور رحمت عالم ﷺ ہی تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی سب پکار اٹھے کہ واللہ یہ "امین" ہیں لہٰذا ہم سب ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔"(8)

ایک اہم، حساس، نازک اور عظیم ترین مسئلہ میں تمام قبائل عرب کا بیک زبان و دل پیغمبر امن ﷺ کو اپنا حاکم وجج تصور کر لینا اور پھر ان کے فیصلے کو بلا چوں وچرا حرف بہ حرف تسلیم کرنا اس امر پر برہان قوی ہے کہ اعلان نبوت سے قبل بھی آپ ﷺ کی راست بازی، امانت داری، حلم وبردباری، اور طہارت وپاکیزگی پر قبائل عرب کا اجماع واتفاق تھا اور آپ بلاشک وریب سب کے مقتدا، مہتدا اور قائد وحکم تصور کیے جاتے تھے۔

اللہ رے وسعت ترے دامان کرم کی
اس بحر کا ملتا نہیں ڈھونڈے سے کنارا

اب حضور اکرم ﷺ کا قائدانہ فیصلہ عقیدت ومحبت کی عینک لگا کر پڑھیں اس فیصلے کے ایک ایک لفظ سے عدل وانصاف، اخوت ومحبت، امانت ودیانت اور امن وآشتی کے پھول جھڑ رہے ہیں۔

"آپ ﷺ نے اس جھگڑے کا اس طرح تصفیہ فرمایا کہ پہلے آپ نے یہ حکم دیا کہ جس جس قبیلہ کے لوگ حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کے مدعی ہیں ان کا ایک ایک سردار چن لیا جائے۔ چنانچہ ہر قبیلہ والوں نے اپنا اپنا سردار چن لیا۔ پھر حضور ﷺ نے اپنی چادر مبارک کو بچھا کر حجر اسود کو اس پر رکھا اور سرداروں کو حکم دیا کہ سب لوگ اس چادر کو تھام کر مقدس پتھر کو اٹھائیں۔ چنانچہ سب سرداروں نے چادر کو اٹھایا اور جب حجر اسود اپنے مقام تک پہنچ گیا تو حضور ﷺ نے اپنے متبرک ہاتھوں سے اس مقدس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس طرح ایک ایسی خونریز لڑائی ٹل گئی جس کے نتیجہ میں نہ معلوم کتنا خون خرابا ہوتا"۔(9)

اعلان نبوت کے بعد حضور کی امن پسندی:

پیغمبر امن ﷺ کی عمر مبارک کا چالیسواں سال تھا، غار حراء میں رسول مکرم پیغمبر امن ﷺ مصروف عبادت تھے، اچانک اس غار میں روح الامین یعنی فرشتوں کے سردار حضرت جبرئیل علیہ السلام پیغام الٰہی لے کر حاضر ہوئے اور پھر آپ ﷺ حکم خداوندی کے بموجب دعوت حق، تبلیغ اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کمربستہ ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فاران کی چوٹی سے اعلان نبوت فرمایا، اعلان نبوت کے بعد تیرہ سال تک آپ ﷺ مکہ

مکرمہ میں رہ کر دعوت حق اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اعلان نبوت کے بعد مکہ کا نقشہ بالکل بدل چکا تھا۔ آپ ﷺ کو "صادق الوعد" اور "امین اعظم" کے لقب سے خطاب کرنے والے لوگ اعلان حق کے نتیجے میں آپ ﷺ کے جانی دشمن بن چکے تھے۔ آپ ﷺ کی ذات پر پھبتیاں کسی جارہی تھیں، لوگ آپ کو ساحر و مجنون اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر اپنی بدباطنی کا ثبوت پیش کر رہے تھے، گستاخی کا بازار گرم تھا۔ لیکن اس تکلیف دہ حالات میں بھی پیغمبر امن ﷺ صبر کی تصویر کامل بنے رہے۔ کسی کا جواب تو درکنار لب نازنین پر اُف تک نہیں آیا بلکہ گالی کا جواب آپ ﷺ نے تبسم ریز لبوں سے دیا اور اس طرح آپ ﷺ نے دنیا کو ایک نئے فلسفۂ جواب سے آگاہ کیا کہ گالی اور بدگوئی کا جواب گالی یہ ہلاکت اور بدامنی کا سبب ہے جبکہ گالی کا جواب تبسم اپنے انجام کار کے اعتبار سے خیر و سلامتی اور اخوت و مروت کا سبب ہے۔ اگر آپ ﷺ چاہتے تو قبیلہ بنو ہاشم جو قبائل قریش میں سب سے معزز اور با اثر قبیلہ تھا ان سے اپنی رشتہ داری کا پاس دے کر انہیں قبائل قریش سے انتقام لینے پر آمادہ کرسکتے تھے لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے عفو، درگزر کے اصول کو اپنا کر اپنی امن پسندی کی ایسی داستان قرطاس عالم پر رقم فرمائی جو صبح قیامت تک تابناک رہے گی۔ اب آپ دل تھام لیجیے او آئندہ صفحات پر مشتے نمونہ از خروارے کے طور پیغمبر امن ﷺ پر ظلم و ستم کی صرف دو مثالیں رقم کی جارہی ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ظلم و ستم اور فتنہ و فساد کی کیسی کالی گھٹا میں پیغمبر امن ﷺ نے بلا خوف و خطر امن پسندی کا مظاہرہ فرمایا تھا اور عفو و درگزر کے اصول پر کاربند رہے تھے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے: "ایک روز پیغمبر اسلام حرم کعبہ میں نماز ادا فرمارہے تھے۔ ایک بدباطن عقبہ بن معیط نے آپ کے گلے میں چادر کا پھندہ ڈال کر اس زور سے کھینچا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دوڑ پڑے، آپ نے عقبہ بن ابی معیط کو دھکا دے کر دفع کیا اور فرمایا: کیا ایک انسان کو اس وجہ سے مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور بے شک وہ روشن نشانیاں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف لائے ہیں۔(10)

حضرت ابو طارق کہتے ہیں کہ میں نے (اسلام لانے قبل) رسول اللہ ﷺ کو "ذوالمجاز" کے بازار میں دیکھا کہ آپ قبائل عرب کو ایک خدا کی پرستش کی طرف بلا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک شخص تھا وہ انہیں پتھروں سے مار رہا تھا یہاں تک کہ ان کے ٹخنے خون آلود ہوگئے تھے۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا: اے لوگو! اس کی بات مت سنو۔

یہ جھوٹا ہے، میں نے اس مظلوم کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ محمد بن عبد اللہ ہیں جو ایک اللہ کی عبادت کی دعوت اور اپنی رسالت کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ پھر میں نے اس ظالم کے بارے میں دریافت کیا کہ انہیں پتھر مارنے والا کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ وہ ابو لہب ہے۔(السیرۃ الحلبیہ)

اب رسول مکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی نمناک آنکھوں کے ساتھ ملاحظہ کیجیے:

﴿لَقَدْ أُخِفْتُ فِي اللَّهِ وَمَا يُخَافُ أَحَدٌ، وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللَّهِ وَمَا يُؤْذَى أَحَدٌ، وَلَقَدْ أَتَتْ عَلَيَّ ثَلَاثُونَ مِنْ بَيْنِ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ وَمَا لِي وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَأْكُلُهُ ذُو كَبِدٍ إِلَّا شَيْءٌ يُوَارِيهِ إِبْطُ بِلَالٍ﴾ (11)

ترجمہ: اللہ رب العزت کی راہ میں مجھے اس قدر ڈرایا گیا کہ کسی اور کو نہیں ڈرایا گیا ہوگا اور اللہ کی راہ میں مجھے اس قدر تکلیف دی گئی کہ کسی اور کو اتنی تکلیف نہیں دی گئی ہو۔ مجھ پر تیس راتیں ایسی گزریں کہ میرے اور بلال کے پاس کھانے کے لیے صرف وہ تھوڑی چیزیں تھیں جو بلال اپنی بغل میں دبا کر لائے تھے۔

یہ اور اس طرح کی کثیر روایات کتب حدیث میں موجود ہیں جس میں پیغمبر اسلام ﷺ پر کیے جانے والے مظالم کی داستانیں موجود ہیں۔ جنہیں پڑھ کر دل کی دنیا میں زلزلہ برپا ہو جاتا ہے، دماغ کا عالم زیر و زبر ہو جاتا ہے اور پور اوجود ایک اضطرابی کیفیت محسوس کرتا ہے لیکن قربان جایئے پیغمبر امن ﷺ کی امن پسندی پر کہ خدائی طاقت و قوت پاس میں ہوتے ہوئے دشمن سے انتقام لینے کے درپہ نہیں ہوتے بلکہ عفو و درگزر اور معافی کا مظاہرہ کرکے دنیا کے سامنے امن کی عملی مثال پیش فرماتے ہیں۔ اور عفو و درگزر کا اعلان ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾(12)

یعنی: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے اس لیے کہ وہ مجھے جانتے نہیں ہیں۔

عفو و درگزر کا یہ منظر آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ دنیا والوں نے اس ذات گرامی کے ساتھ ایسے ایسے مظالم ڈھائے کہ اگر وہ مظالم پہاڑ پر ڈھائے جاتے تو پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتا لیکن اس ذات والا صفات نے قدرت و طاقت کے باوجود اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لیا، انتقام کجا غیظ و غضب کا بھی اظہار نہیں کیا بلکہ معافی کا پروانہ عطا کرتے ہوئے انہیں اپنی رحمت و رافت کی چادر میں چھپا لیا۔

اے چشمہ رحمت بابی انت و امی
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تونے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے

سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے

افراد سازی اور پیغمبر امن ﷺ :

حضور اکرم ﷺ نے اپنے تیرہ سالہ مکی زندگی میں امن کے قیام اور اسلام کے فروغ کے لیے جس چیز پر بطور خاص توجہ مرکوز فرمائی ہے وہ ہے فرد کی اصلاح اور معاشرہ کو کامل انسان فراہم کرنا۔ ظاہر ہے کہ ملت کی اصلاح فرد کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔ جب ملت کے افراد نیک طینت اور پاکیزہ خصلت ہوں گے تو ایک صالح معاشرہ تشکیل پائے گا۔ اسی سبب سے پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام نے تیرہ سالہ مکی زندگی میں افراد سازی کے کار عظیم پر توجہ فرمائی اور چند سالوں کی انتھک کوشش کے نتیجے میں حضور اکرم ﷺ نے متعدد صالح، نیک، شریف، امن پسند، پاکیزہ، پاکباز اور کامل انسان پیدا کیے جو امن عالم کی تشکیل میں پیغمبر امن کے دست و بازو بنے اور ان پاکباز ہستیوں کے وجود مسعود سے عالم میں امن و امان اور خیر و سلامتی کا بول بالا ہوا۔ بطور ثبوت ان پاکباز افراد میں سے فقط ایک کا نام ہی کافی ہے۔ اور وہ ہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ۔ جن کی صداقت و شجاعت اور عدالت و مساوات کا چرچا آج بھی پوری دنیا میں ہے۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے ان صفات کے قائل اور مداح ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف سے متعلق کتب سیرت میں کثیر روایات موجود ہیں۔ اختصار کے پیش نظر فقط ایک روایت پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

عہد فاروقی میں غسان کا حکمران ”جبلہ بن الایہم" مکہ مکرمہ آیا۔ طواف کعبۃ اللہ کے دوران اس بادشاہ نے کبر و غرور کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بدو اور غریب کو تھپڑ مارا۔ وہ مظلوم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے انصاف کی گہار لگائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جبلہ بن الایہم کو پکڑ کر اس بدو کے حوالے کر دیا جائے اور یہ مظلوم اس جبلہ کے منہ پر اسی طرح تھپڑ مارے جس طرح اس نے اس کو مارا ہے۔

ایک بدو کی فریاد پر غسان کے بادشاہ سے قصاص لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن عدل و انصاف کے پیکر نے اس نازک موقع پر بھی عدل و مساوات کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصلہ غریب مظلوم کے حق میں فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ غلامان مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عدل کا اجرا ہر قسم کے بھید بھاؤ سے اوپر اٹھ کر صرف اور صرف حق کو نظر میں رکھ کر کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ عدل فاروقی کی عظیم مثال ہے۔

ہجرت حبشہ اور پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم :

جب کفار قریش نے ظلم و ستم سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو اجازت دی کہ وہ حبشہ (موجودہ نام ایتھوپیا) جا کر پناہ لیں اور پر امن طریقہ سے زندگی بسر کریں چنانچہ اعلان نبوت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ کفار مکہ کو جب ان لوگوں کی ہجرت کا پتا چلا تو ان ظالموں نے ان لوگوں کی گرفتاری کے لیے ان کا تعاقب کیا لیکن یہ لوگ کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہو چکے تھے۔ اس لیے کفار ناکام واپس لوٹے۔ یہ مہاجرین کا قافلہ حبشہ کی سرزمین میں اتر کر امن و امان کے ساتھ خدا کی عبادت میں مصروف ہو گیا۔ مگر کفار مکہ کو کب گوارا ہو سکتا تھا کہ فرزندان توحید کہیں امن و چین کے ساتھ رہ سکیں۔ ان ظالموں نے کچھ تحائف کے ساتھ "عمرو بن العاص" اور "عمارہ بن ولید" کو بادشاہ حبشہ کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ ان دونوں نے نجاشی کے دربار میں پہنچ کر تحفوں کا نذرانہ پیش کیا اور بادشاہ کو سجدہ کر کے یہ فریاد کرنے لگے کہ اے بادشاہ! ہمارے کچھ مجرم مکہ سے بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ گزین ہو گئے ہیں۔ آپ ہمارے ان مجرموں کو ہمارے حوالہ کر دیجیے۔ یہ سن کر نجاشی بادشاہ نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے نمائندہ بن کر گفتگو کے لیے آگے بڑھے اور دربار کے آداب کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہیں کیا بلکہ صرف سلام کر کے کھڑے ہو گئے۔

درباریوں نے ٹوکا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے میں بادشاہ کو سجدہ نہیں کر سکتا۔(13)

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی بادشاہ کے سامنے جو خطاب ارشاد فرمایا اس کا ایک ایک لفظ حضور کی امن پسندی اور راست بازی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے کہتے ہیں:

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ شرک وبت پرستی کرتے تھے۔ لوٹ مار، چوری، ڈکیتی، ظلم وستم اور طرح طرح کی بدکاریوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم میں ایک شخص کو اپنا رسول بنا کر بھیجا جس کے حسب ونسب اور صدق و دیانت کو ہم پہلے سے جانتے تھے، اس رسول نے ہم کو شرک وبت پرستی سے روک دیا اور صرف ایک خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیا اور ہر قسم کے ظلم وستم اور تمام برائیوں اور بدکاریوں سے ہم کو منع کیا۔ ہم اس رسول پر ایمان لائے اور شرک وبت پرستی چھوڑ کر تمام برے کاموں سے تائب ہو گئے۔ بس یہی ہمارا گناہ ہے جس پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ان لوگوں نے ہمیں اتنا ستایا کہ ہم اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر آپ کی سلطنت کے زیر سایہ پر امن زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اب یہ لوگ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم پھر اسی پرانی گمراہی میں واپس لوٹ جائیں۔"

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے نجاشی بادشاہ بے حد متاثر ہوا۔ یہ دیکھ کر کفار مکہ کے سفیر عمرو بن العاص نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی پھینک دیا اور کہا کہ اے بادشاہ! یہ مسلمان لوگ آپ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کچھ دوسرا ہی اعتقاد رکھتے ہیں جو آپ کے عقیدہ کے بالکل ہی خلاف ہے۔ یہ سن کر نجاشی بادشاہ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے سورۂ مریم کی تلاوت فرمائی۔ کلام ربانی کی تاثیر سے نجاشی بادشاہ کے قلب پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہی بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں جو کنواری مریم رضی اللہ عنہا کے شکم مبارک سے بغیر باپ کے خدا کی قدرت کا نشان بن کر پیدا ہوئے۔ نجاشی بادشاہ نے بڑے غور سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر کو سنا اور یہ کہا کہ بلاشبہ انجیل اور قرآن دونوں ایک ہی آفتاب ہدایت کے دو نور ہیں اور یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور

میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک حضرت محمد ﷺ خدا کے وہی رسول ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں دی ہے اور اگر میں دستور سلطنت کے مطابق تخت شاہی پر رہنے کا پابند نہ ہوتا تو میں خود مکہ جاکر رسول اکرم ﷺ کی جوتیاں سیدھی کرتا اور ان کے قدم دھوتا۔ بادشاہ کی تقریر سن کر اس کے درباری جو کٹر قسم کے عیسائی تھے ناراض و برہم ہوگئے مگر نجاشی بادشاہ نے جوش ایمانی میں سب کو ڈانٹ پھٹکار کر خاموش کر دیا۔ اور کفار مکہ کے تحفوں کو واپس لوٹا کر عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو دربار سے نکلوا دیا اور مسلمانوں سے کہہ دیا کہ تم لوگ میری سلطنت میں جہاں چاہو امن و سکون کے ساتھ آرام و چین کی زندگی بسر کرو۔ کوئی تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔(14)

(واضح رہے کہ نجاشی بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کے انتقال پر حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ حالانکہ نجاشی بادشاہ کا انتقال حبشہ میں ہوا تھا اور وہ حبشہ ہی میں مدفون بھی ہوئے مگر حضور ﷺ نے غائبانہ ان کی نماز جنازہ پڑھ کر ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔)

سبحان اللہ! حضرت جعفر بن ابی طالب کی یہ تقریر کیا ہے؟ ایک آئینہ حقیقت ہے جس میں صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم حکمت، الفت، محبت، اخوت، مروت، عدالت، اخلاق، احسان اور اکرام واحترام انسانیت ہے۔ آپ ﷺ کی ذات گرامی نے فتنہ و فساد، ظلم و ستم، ذلت و نکبت جنگ و جدال، بدکاری و بے حیائی اور غلامی جیسی لعنت سے انسانوں کو آزاد کر کے بنی نوع آدم کو عزت سے ہمکنار کیا ہے اور عالم کے سامنے ایسا نظام محکم پیش کیا جس کا نفاذ امن و سلامت اور خیر و صلاح کا ضامن ہے۔

امن ، اخلاق ، محبت ، رہِ تسلیم و رضا
دین اسلام نے آدم کو یہ پیغام دیا

سفر ہجرت اور پیغمبر امن ﷺ:

پیغمبر اسلام ﷺ اعلان نبوت کے بعد تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں اعلائے کلمۂ حق اور نفاذ امن کے لیے جہد مسلسل کرتے رہے، تبلیغ دین متین کی راہ میں آنے والی ہر مشکلات کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کیا لیکن اپنے نصب العین سے کبھی صرف نظر نہیں فرمایا۔ آپ صرف مکہ والوں کے لیے رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ

ساری کائنات کے لیے رسول بنا کر مبعوث فرمائے گئے تھے۔ آپ کی ذمہ داری صرف مکہ والوں کی اصلاح نہ تھی بلکہ پوری دنیا میں بسنے والے قیامت تک کے بندگان خدا کی اصلاح کی ذمہ داری آپ کو من جانب اللہ تفویض ہوئی تھی جس کے لیے ضروری تھا کہ آپ کو ایک پر سکون ماحول میسر آئے۔ جہاں اختلاف و انتشار سے دور رہ کر کار تبلیغ کو انجام دیا جاسکے اور دین کا ہمہ گیر پیغام اکناف عالم میں بسنے والے بندگان خدا تک پہنچایا جاسکے۔ چنانچہ یہی ضرورت دراصل مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تمہید ثابت ہوئی جبکہ اس ہجرت کی ضرورت اس دن ناگزیر صورت میں سامنے آئی جب کفار مکہ نے حضور اکرم ﷺ کے قتل کی متفقہ پلاننگ کر لی اور ہر قبیلہ کے افراد نے یک جا ہو کر کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کر لیا۔ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کو وحی کے ذریعہ کفار مکہ کے ناپاک ارادوں سے باخبر کر کے ہجرت مدینہ کا حکم فرمایا۔ بوقت محاصرہ حضور اکرم ﷺ اپنے کاشانۂ اقدس میں موجود تھے، حضور ﷺ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے ہجرت مدینہ کا حکم فرمایا ہے۔ اس لیے میں آج مدینہ کی طرف ہجرت کر رہا ہوں اور مشیت خداوندی یہ ہے کہ آپ میرے بعد ہجرت کریں۔

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ نہ لے جانے اور بعد میں ہجرت کی تلقین و ہدایت کرنے کا جو ایمان افروز سبب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے وہ اگر تعصب کی عینک اتار کر پڑھا جائے تو اس امر کا اقرار کیے بغیر چارہ نہ ہوگا کہ جو شخص اپنے بدترین دشمن کے ساتھ بھی امانت و دیانت اور راست بازی کا برتاؤ رکھتا ہے وہ بھلا اپنے خالق و مالک کے تئیں جھوٹ کی جرأت کیونکر کر سکتا ہے، اس کی آواز یقیناً حق کی آواز ہوگی۔ اس کا پیغام یقیناً حق کا پیغام ہوگا۔ اور اس کی تعلیمات حق کی تعلیمات ہوں گی۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا: "اے علی! تم میری سبز رنگ کی چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو رہو، اور میرے چلے جانے کے بعد تم قریش کی تمام امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کر کے مدینہ چلے آنا" (15)

معلوم ہوا کہ کفار مکہ حضور کے بدترین دشمن تھے مگر اس کے باوجود اس وقت بھی حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر انہیں اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنے قیمتی مال و اسباب حضور اکرم ﷺ کے پاس بطور امانت رکھتے تھے۔ تاریخ عالم میں یہ غیر معمولی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔

مدینہ منورہ میں پیغمبر امن ﷺ کی امن پسندی:

اعلان نبوت کے چودہویں سال رسالت مآب ﷺ نے مدینہ منورہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا اور اس طرح مدینہ منورہ کے افق پر اس کی دائمی و سرمدی عظمت و رفعت کا ہلال طلوع ہوا۔ پیغمبر امن صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے ارشادات و ہدایات کی پہلی برکت جو اہل مدینہ کو میسر آئی وہ امن و سکون کی برکت ہے۔ کیونکہ تعلیمات نبوی کی ضیا بار کرنیں پہنچنے سے قبل مدینہ منورہ کے افراد دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک قبیلہ "اوس" کے نام سے جانا جاتا تھا جبکہ دوسرا "خزرج" کے نام سے موسوم تھا اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے جانی دشمن تھے، یہاں تک کہ "جنگ بعاث" میں ان دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور نامور بہادر آپس میں لڑ لڑ کر قتل ہو چکے تھے اور ہر وقت دونوں قبیلہ ایک دوسرے کے خلاف بر سر پیکار رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی روز مرہ کی زندگی اجیرن بن چکی تھی، اس شر و فساد کے سنگین عالم میں قبیلہ "اوس" اور "خزرج" کو پیغمبر اسلام ﷺ کا دامن امن حاصل ہو گیا اور پھر "اوس" و "خزرج" کی ضرب المثل دشمنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور نہ صرف دشمنی ختم ہو گئی بلکہ "اوس" و "خزرج" باہم شیر و شکر ہو گئے اور مدینہ منورہ میں عرصۂ دراز سے فتنہ و فساد اور ظلم و ستم کی افسوسناک صورت حال نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح پیغمبر امن ﷺ کے وجود مسعود کی برکت سے مدینہ منورہ امن و سکون کا گہوارہ بن گیا۔

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مدینہ میں عہد مواخات پُر امن دعوت کا ایک انقلابی پیغام:

مدینہ منورہ میں شمع رسالت پر نثار ہونے والے پروانے دو قسم کے تھے۔ ایک تو "اوس" و "خزرج" کے وہ سعادت مند حضرات جنہوں نے اسلام قبول کر کے دین متین کی نصرت و حمایت کا عہد کیا تھا۔ ان حضرات کو "انصار" کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے وہ اصحاب عزیمت تھے جنہوں نے اللہ رب العزت و

رسول اللہ ﷺ کی رضاو خوشنودی کے لیے وطن عزیز کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ کر مہاجرانہ زندگی کو فوقیت دی تھی۔ ان حضرات کے پاس نہ گھر تھا نہ اثاثۂ زندگی۔ سر چھپانے کے لیے نیلگوں آسمان اور سکونت کے لیے مسجد نبوی سے متصل ایک چبوترہ بس یہی کل ان کی دنیا تھی۔ ایسے پریشان کن عالم میں پیغمبر اسلام ﷺ نے "عہد مواخات" کا فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور دنیا کو الفت، محبت، مودت، مروت، اخوت اور بھائی چارہ سے روبرو کرایا۔ اس "عہد مواخات" کی تفصیل بخاری میں موجود ہے، چشم سرور سے پڑھیں اور پیغمبر امن ﷺ کی پر امن تعلیمات پر قربان جائیں۔

"مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد ایک دن حضور ﷺ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مکان میں انصار و مہاجرین کو جمع فرمایا۔ اس وقت تک مہاجرین کی تعداد پینتالیس یا پچاس تھی۔ حضور ﷺ نے انصار کو مخاطب کرکے فرمایا کہ یہ مہاجرین تمہارے بھائی ہیں پھر مہاجرین وانصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد فرماتے ہی یہ رشتہ اخوت بالکل حقیقی بھائی جیسا رشتہ بن گیا۔ چنانچہ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جاکر اپنے گھر کی ایک ایک چیز سامنے لاکر رکھ دی اور کہہ دیا کہ آپ ہمارے بھائی ہیں اس لیے ان سب سامانوں میں آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ حد ہو گئی کہ حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ جو حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مہاجر کے بھائی قرار پائے تھے ان کی دو بیویاں تھیں، حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میری ایک بیوی جسے آپ پسند کریں میں اس کو طلاق دے دوں اور آپ اس سے نکاح کر لیں۔

اللہ اکبر! اس میں شک نہیں کہ انصار کا یہ ایثار اور اخوت و بھائی چارہ ایک ایسا بے مثال شاہکار ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی مگر مہاجرین نے کیا طرز عمل اختیار کیا یہ بھی ایک قابل تقلید تاریخی کارنامہ ہے اور ایک قابل قدر، خوددار معاشرہ کا افتخار ہے۔ کتب حدیث میں مرقوم ہے کہ: حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ کی اس مخلصانہ پیشکش کو سن کر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے شکریہ کے ساتھ یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ یہ سب مال و متاع اور اہل و عیال آپ کو مبارک فرمائے مجھے تو آپ صرف بازار کا راستہ بتا دیجیے۔ انہوں نے مدینہ کے مشہور بازار "قینقاع" کا راستہ بتا دیا۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بازار گئے اور کچھ گھی، کچھ پنیر

خرید کر شام تک بیچتے رہے۔ اسی طرح روزانہ وہ بازار جاتے رہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کافی مالدار ہو گئے اور ان کے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو گیا کہ انہوں نے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا۔ جب یہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم نے بیوی کو کتنا مہر دیا؟ عرض کیا کہ پانچ درہم برابر سونا۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں برکتیں عطا فرمائے تم دعوتِ ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری ہی سے ہو۔ (16)

عہد مواخات کی جو مبارک جھلک آپ نے اوپر کی سطروں میں ملاحظہ کیا اس کی حیثیت فقط ایک عہد و پیمان کی نہ تھی بلکہ یہ ایک ایسا نافذ العمل عہد و پیمان تھا کہ جس میں ایثار و قربانی اور محبت و مودت کی پر خلوص آمیزش تھی۔ جس نے دنیا کے سامنے رنگ و نسل اور بھید بھاؤ کے سارے بتوں کو پامال کر کے اخوت و محبت اور بھائی چارہ کا ایسا تاج محل قائم کیا جس کی نظیر لانا عنقا ہے۔

مدینہ کے یہودیوں سے معاہدہ اور پیغمبر امن ﷺ:

حضور اکرم ﷺ کی آمد آمد سے قبل مدینہ منورہ میں تین قسم کے لوگ آباد تھے، قبیلہ "اوس" کے لوگ، قبیلہ "خزرج" کے افراد اور یہود کے قبائل۔ قبیلہ "اوس" و "خزرج" کے لوگ تو داخل اسلام ہو چکے تھے۔ اس لیے مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے نزول اجلال فرمانے کے بعد آپ نے یہود مدینہ سے عہد و پیمان لیا۔ اس عہد کا بنیادی مقصد مدینہ منورہ میں امن و امان کا قیام تھا تاکہ دونوں فریق امن و سکون کے ساتھ مدینہ منورہ میں رہیں اور باہم کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہونے پائے چنانچہ یہود مدینہ کو آپ ﷺ نے ایک دستاویز لکھوائی اس معاہدہ کی دفعات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) خون بہا (جان کے بدلے جو مال دیا جاتا ہے) اور فدیہ (قیدی کو چھڑانے کے بدلے جو رقم دی جاتی ہے) کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی وہ قائم رہے گا۔

(۲) یہودیوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی ان کے مذہبی رسوم میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔

(۳) یہودی اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

(۴) یہودی یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

(۵) اگر مدینہ پر کوئی حملہ ہو گا تو دونوں فریق مل کر حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔

(۶) کوئی فریق قریش اور ان کے مددگاروں کو پناہ نہیں دے گا۔

(۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا فریق بھی اس مصالحت میں شامل ہو گا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ رہے گی۔(17)

اس معاہدہ کی دفعات کے ہر لفظ سے امن و سلامتی کے نوع بنوع پھول جھڑ رہے ہیں۔ یہ فقط معاہدہ نہ تھا بلکہ رواداری، امن و سلامتی، آزادی، عدل و انصاف کا ایک نصاب تھا جس میں یہود کو دین و مذہب کی مکمل آزادی دی گئی تھی۔ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا تھا۔ طاقت و قوت کے باوجود ظلم و جبر کی سیاست کا کوئی تصور نہیں تھا جو کہ پیغمبر امن ﷺ کی امن پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

صلح حدیبیہ امن کا پیغام:

ہجرت کا چھٹا سال تھا۔ مدینہ منورہ میں حضور اکرم ﷺ کو جلوہ افروز ہوئے چھ سال مکمل ہونے والے تھے، ان چھ برسوں میں قبائل عرب میں حضور اکرم ﷺ کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں اسلام کا غلغلہ برپا تھا۔ لیکن پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی تبلیغ وارشاد کا محور فقط مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور قرب وجوار کے قبائل نہیں تھے بلکہ حضور اکرم ﷺ کے پیش نظر پوری دنیا میں کلمۂ حق اور نظام امن کا نفاذ تھا اور یہ امر بھی حضور اکرم ﷺ کے پیش نظر تھا کہ اس بڑے کاز کے لیے ماحول کا ساز گار اور پر سکون ہونا لازم ولابدی ہے، دوسری طرف مکہ کے کفار نے شر و فساد کا ماحول گرم کر رکھا تھا، سینکڑوں میل دور ہونے کے باوجود ان کی زندگی کی صبح و شام اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں بسر ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود بھی ہیجانی زندگی گزار تے تھے اور ان کے فتنوں کے سبب مسلمانان مدینہ بھی پر سکون نہیں رہ سکتے تھے، اس لیے حضور ﷺ کی یہ دلی خواہش تھی کہ کفار مکہ کی طرف سے فتنہ وفساد کا سلسلہ تھم جائے تاکہ پر سکون ماحول میں ارشاد وہدایت کا سلسلہ برق رفتاری کے ساتھ آگے کی سمت رواں دواں ہو۔ اور حضور اکرم ﷺ کو یہ سنہرا موقع ہجرت کے چھٹے سال مقام حدیبیہ میں نظر آیا۔ اور امن وسکون کی بحالی کے لیے حضور اکرم ﷺ نے بغیر پس وپیش کے کفار سے صلح کی جسے تاریخ اسلامی میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کا آغاز یوں ہوا کہ ذوالقعدہ ۶ھ میں حضور ﷺ چودہ سو صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ حضور ﷺ کو اندیشہ تھا کہ شاید کفار مکہ ہمیں عمرہ ادا کرنے سے روکیں گے۔ اس لیے آپ ﷺ نے پہلے ہی قبیلۂ خزاعہ کے ایک شخص کو مکہ بھیج دیا تھا تا کہ وہ کفار مکہ کے ارادوں کی خبر لائے۔ جب آپ ﷺ کا قافلہ مقام "عسفان" کے قریب پہنچا تو وہ شخص یہ خبر لے کر آیا کہ کفار مکہ نے تمام قبائل عرب کے کافروں کو جمع کر کے یہ کہہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مکہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ کفار قریش نے اپنے تمام ہمنوا قبائل کو جمع کر کے ایک فوج تیار کرلی اور مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے مکہ سے باہر نکل کر مقامِ "بلدح" میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اور خالد بن الولید اور ابو جہل کا بیٹا عکرمہ یہ دونوں دو سو چنے ہوئے سواروں کا دستہ لے کر مقام "غمیم" تک پہنچ گئے۔ جب حضور ﷺ کو راستہ میں خالد بن الولید کے سواروں کی گرد نظر آئی تو آپ ﷺ نے شاہراہ سے ہٹ کر سفر شروع کر دیا اور عام راستہ سے کٹ کر آگے بڑھے اور مقام "حدیبیہ" میں پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ مقام حدیبیہ میں پہنچ کر حضور ﷺ نے یہ دیکھا کہ کفار قریش کا ایک عظیم لشکر جنگ کے لیے آمادہ ہے اور ادھر یہ حال ہے کہ سب لوگ احرام باندھے ہوئے ہیں اس حالت میں جوئیں بھی نہیں مار سکتے تو آپ ﷺ نے مناسب سمجھا کہ کفار مکہ سے مصالحت کی گفتگو کرنے کے لیے کسی کو مکہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا۔ انہوں نے مکہ پہنچ کر کفار قریش کو حضور ﷺ کی طرف سے صلح کا پیغام پہنچایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی مالداری اور اپنے قبیلہ والوں کی حمایت و پاسداری کی وجہ سے کفار قریش کی نگاہوں میں بہت زیادہ معزز تھے۔ اس لیے کفار قریش ان پر کوئی دست درازی نہیں کر سکے۔ بلکہ ان سے یہ کہا کہ ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں کہ آپ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر کے اپنا عمرہ ادا کرلیں مگر ہم محمد (ﷺ) کو ہرگز ہرگز کعبہ کے قریب نہ آنے دیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں بغیر رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لیے کبھی ہرگز ہرگز اکیلے اپنا عمرہ نہیں ادا کر سکتا۔ حدیبیہ میں سب سے پہلا شخص جو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ بدیل بن ورقاء خزاعی تھا۔ ان کا قبیلہ اگرچہ ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا مگر یہ لوگ حضور ﷺ کے حلیف اور انتہائی مخلص و خیر خواہ تھے۔ بدیل بن ورقاء نے آپ

ﷺ کو خبر دی کہ کفار قریش نے کثیر تعداد میں فوج جمع کر لی ہے اور فوج کے ساتھ راشن کے لیے دودھ والی اونٹنیاں بھی ہیں۔ یہ لوگ آپ سے جنگ کریں گے اور آپ کو خانہ کعبہ تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم قریش کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں اور نہ ہم جنگ چاہتے ہیں۔ ہم یہاں صرف عمرہ ادا کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ مسلسل لڑائیوں سے قریش کو بہت کافی جانی ومالی نقصان پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ان کے حق میں بھی یہی بہتر ہے کہ وہ جنگ نہ کریں بلکہ مجھ سے ایک مدت معینہ تک کے لیے صلح کا معاہدہ کرلیں اور مجھ کو اہل عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اگر قریش میری بات مان لیں تو بہتر ہوگا اور اگر انہوں نے مجھ سے جنگ کی تو مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ میں ان سے اس وقت تک لڑوں گا کہ میری گردن میرے بدن سے الگ ہو جائے۔

بدیل بن ورقاء آپ ﷺ کا یہ پیغام لے کر کفار قریش کے پاس گیا اور کہا کہ میں محمد (ﷺ) کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر تم لوگوں کی مرضی ہو تو میں ان کا پیغام تم لوگوں کو سناؤں۔ کفار قریش کے شرارت پسند لونڈے جن کا جوش ان کے ہوش پر غالب تھا شور مچانے لگے کہ نہیں! ہرگز نہیں! ہمیں ان کا پیغام سننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کفار قریش کے سنجیدہ اور سمجھدار لوگوں نے پیغام سنانے کی اجازت دے دی اور بدیل بن ورقاء نے حضور ﷺ کی دعوت صلح کو ان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کے بعد قریش کے معمر لوگ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، باہمی گفتگو کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ سے معاہدہ کر لیا اور اس معاہدہ کو لکھ لیا گیا۔ اس صلح نامہ میں یہ طے کر دیا گیا کہ فریقین کے درمیان دس سال تک لڑائی بالکل موقوف رہے گی۔ صلح نامہ کی باقی دفعات اور شرطیں یہ تھیں کہ:

(۱) مسلمان اس سال بغیر عمرہ ادا کیے واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال عمرہ کے لیے آئیں اور صرف تین دن مکہ میں ٹھہر کر واپس چلے جائیں۔

(۳) تلوار کے سوا کوئی دوسرا ہتھیار لے کر نہ آئیں۔ تلوار بھی نیام کے اندر رکھ کر تھیلے وغیرہ میں بند ہو۔

(۴) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

(۵) کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ چلا جائے تو واپس کر دیا جائے۔
لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ میں چلا جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔
(۶) قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں دوستی کا معاہدہ کر لیں۔
یہ شرطیں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس پر بڑی زبردست ناگواری ہو رہی تھی مگر وہ فرمان رسالت کے خلاف دم مارنے سے مجبور تھے۔(18)
اس صلح کو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مغلوبانہ صلح اور ذلت آمیز معاہدہ سمجھا مگر اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾

اے حبیب! ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی۔

خداوند قدوس نے اس صلح کو "فتح مبین" بتایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ "فتح" ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ہاں! یہ فتح ہے۔"
گو اس وقت اس صلح نامہ کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے خیالات اچھے نہیں تھے۔ مگر اس کے بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ درحقیقت یہی صلح تمام فتوحات کی کنجی ثابت ہوئی اور سب نے مان لیا کہ واقعی صلح حدیبیہ ایک ایسی فتح مبین تھی جو مکہ میں اشاعت اسلام بلکہ فتح مکہ کا ذریعہ بن گئی۔ اب تک مسلمان اور کفار ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا مگر اس صلح کی وجہ سے ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت آزادی کے ساتھ گفت و شنید اور تبادلۂ خیالات کا راستہ کھل گیا۔ کفار مدینہ آتے اور مہینوں ٹھہر کر مسلمانوں کے کردار و اعمال کا گہرا مطالعہ کرتے۔ اسلامی مسائل اور اسلام کی خوبیوں کا تذکرہ سنتے جو مسلمان مکہ جاتے وہ اپنے چال چلن، عفت شعاری اور عبادت گزاری سے کفار کے دلوں پر اسلام کی خوبیوں کا ایسا نقش بٹھا دیتے کہ خود بخود دشمنان اسلام مذہب اسلام کی طرف مائل ہوتے جاتے تھے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک اس قدر کثیر تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے کہ اتنے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ (سیرت مصطفیٰ)

فتح مکہ کے دن پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام امن:

دو سال تک یہ معاہدہ قائم رہا لیکن اس کے بعد کفار مکہ نے عہد شکنی کا مظاہرہ کیا۔ اس طور پر کہ صلح حدیبیہ میں قرار پایا تھا کہ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ قریش کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے وہ قریش کے ساتھ معاہدہ کرے اور جو حضرت محمد ﷺ سے معاہدہ کرنا چاہے وہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ معاہدہ کرے۔

چنانچہ اسی بنا پر قبیلہ بنی بکر نے قریش سے باہمی امداد کا معاہدہ کر لیا اور قبیلہ بنی خزاعہ نے رسول اللہ عزوجل و ﷺ سے امداد باہمی کا معاہدہ کر لیا۔ یہ دونوں قبیلے مکہ کے قریب ہی میں آباد تھے لیکن ان دونوں میں عرصہ دراز سے سخت عداوت اور مخالفت چلی آ رہی تھی۔

ایک مدت سے تو کفار قریش اور دوسرے قبائل عرب کے کفار مسلمانوں سے جنگ کرنے میں اپنا سارا زور صرف کر رہے تھے لیکن صلح حدیبیہ کی بدولت جب مسلمانوں کی جنگ سے کفار قریش اور دوسرے قبائل کفار کو اطمینان ملا تو قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ بنی خزاعہ سے اپنی پرانی عداوت کا انتقام لینا چاہا اور اپنے حلیف کفارِ قریش سے مل کر بالکل اچانک طور پر قبیلہ بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا اور اس حملہ میں کفار قریش کے تمام رؤسا یعنی عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ و سہیل بن عمرو وغیرہ بڑے بڑے سرداروں نے علانیہ بنی خزاعہ کو قتل کیا۔ بے چارے بنی خزاعہ اس خوفناک ظالمانہ حملہ کی تاب نہ لا سکے اور اپنی جان بچانے کے لیے حرم کعبہ میں پناہ لینے کے لیے بھاگے۔ بنی بکر کے عوام نے تو حرم میں تلوار چلانے سے ہاتھ روک لیا اور حرم الٰہی کا احترام کیا۔ لیکن بنی بکر کا سردار "نوفل" اس قدر جوش انتقام میں آپے سے باہر ہو چکا تھا کہ وہ حرم میں بھی بنی خزاعہ کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کرتا رہا اور چلا چلا کر اپنی قوم کو للکارتا رہا کہ پھر یہ موقع کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا۔ چنانچہ ان درندہ صفت خونخوار انسانوں نے حرم الٰہی کے احترام کو بھی خاک میں ملا دیا اور حرم کعبہ کی حدود میں نہایت ہی ظالمانہ طور پر بنی خزاعہ کا خون بہایا اور کفار قریش نے بھی اس قتل و غارت اور کشت و خون میں خوب خوب حصہ لیا۔ (19)

ظاہر ہے کہ قریش نے اپنی اس حرکت سے حدیبیہ کے معاہدہ کو عملی طور پر توڑ ڈالا۔ کیونکہ بنی خزاعہ رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کر کے آپ کے حلیف بن چکے تھے، اس لیے بنی خزاعہ پر حملہ کرنا، یہ رسول اللہ ﷺ پر حملہ کرنے کے برابر تھا۔ اس حملہ میں بنی خزاعہ کے تیئیس (۲۳) آدمی قتل ہو گئے۔

اس حادثہ کے بعد قبیلۂ بنی خزاعہ کے سردار عمرو بن سالم خزاعی چالیس آدمیوں کا وفد لے کر فریاد کرنے اور امداد طلب کرنے کے لئے مدینہ بارگاہ رسالت میں پہنچے اور گڑگڑا کر حضور ﷺ سے فریاد رسی کی حضور ﷺ نے ان لوگوں کو تسلی دی اور فرمایا کہ مت گھبراؤ میں تمہاری امداد کے لیے تیار ہوں۔(20)

کفار قریش عہد شکنی کر کے معاہد حدیبیہ کو عملی طور پر تار تار کر چکے تھے لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ امن پسندی اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ معاہدہ کو فی الفور کالعدم قرار نہیں دیا بلکہ قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش فرمائیں کہ ان میں سے کوئی ایک شرط قریش منظور کر لیں:

(۱) بنی خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش قبیلہ بنی بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

جب حضور ﷺ کے قاصد نے ان شرطوں کو قریش کے سامنے رکھا تو قرطہ بن عبد عمر نے قریش کا نمائندہ بن کر جواب دیا کہ "نہ ہم مقتولوں کے خون کا معاوضہ دیں گے نہ اپنے حلیف قبیلہ بنی بکر کی حمایت چھوڑیں گے۔ ہاں تیسری شرط ہمیں منظور ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔"

لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو اپنے اس جواب پر ندامت ہوئی۔ چنانچہ چند رؤسائے قریش ابو سفیان کے پاس گئے اور یہ کہا کہ اگر یہ معاملہ نہ سلجھا تو پھر سمجھ لو کہ یقینا محمد (ﷺ) ہم پر حملہ کر دیں گے۔ اس کے بعد حضور نے مسلمانوں کو حملے کی تیاری کے لیے حکم دیا۔ غرض ۱۰ رمضان ۸ ھ کو رسول اکرم ﷺ مدینہ سے دس ہزار کا لشکرِ جرار ساتھ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ فتح مکہ میں آپ کے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر تھا ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مدینہ سے روانگی کے وقت دس ہزار کا لشکر رہا ہو۔ پھر راستہ میں بعض قبائل اس لشکر میں شامل ہو گئے ہوں تو مکہ پہنچ کر اس لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی ہو۔ مختصر حضور ﷺ مسلمانوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوئے۔

اب حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اکرام وانعام کی جس طرح بارش ہوئی وہ ذیل کی سطروں میں ملاحظہ کیجیے اور اندازہ کیجیے کہ پیغمبر امن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کس طرح امن کا چراغ روشن کیا ہے۔

ابوسفیان بن حرب کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی۔ مکہ میں رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو سخت سے سخت ایذائیں دینی، مدینہ پر بار بار حملہ کرنا، قبائل عرب کو اشتعال دلا کر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے قتل کی بارہا سازشیں، یہودیوں اور تمام کفار عرب سے سازباز کر کے اسلام اور بانی اسلام کے خاتمہ کی کوششیں یہ وہ ناقابل معافی جرائم تھے جو پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ابوسفیان کا قتل بالکل درست و جائز اور برمحل ہے۔ لیکن رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جن کو قرآن نے "رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ان کی رحمت چمکار چمکار کر ابوسفیان کے کان میں کہہ رہی تھی کہ اے مجرم! مت ڈر۔ یہ دنیا کے سلاطین کا دربار نہیں ہے بلکہ یہ رحمۃ للعالمین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بارگاہ رحمت ہے۔ بخاری شریف کی روایت تو یہی ہے کہ ابوسفیان بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو فوراً ہی اسلام قبول کرلیا۔ اس لئے جان بچ گئی۔

جس وقت اسلام کا عظیم لشکر مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہا تھا تو انصار کے علمبردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوش انتقام میں آکر یہ نعرہ لگانے لگے:

﴿اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْیَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْکَعْبَةُ﴾

آج گھمسان کی جنگ کا دن ہے۔ آج کعبہ میں خونریزی حلال کر دی جائے گی۔

اس بات کو سن کر پیغمبر امن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے برہمی کا اظہار فرمایا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ سعد بن عبادہ نے اتنی غلط بات کیوں کہہ دی۔ آپ نے ان کے ہاتھ سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے غلط کہا، آج تو کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔ آج تو کعبہ کو لباس پہنانے کا دن ہے۔

﴿اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَةِ﴾

آج کا دن تو رحمت کا دن ہے۔

تاجدار دوعالم ﷺ نے مکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی جو پہلا فرمان جاری فرمایا وہ یہ اعلان تھا کہ جس کے لفظ لفظ میں رحمتوں کے دریا موجیں مار رہے ہیں:

"جو شخص ہتھیار ڈال دے گا اس کے لئے امان ہے۔

جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے گا اس کے لئے امان ہے۔

جو کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کے لئے امان ہے۔"

اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ﷺ ابوسفیان ایک فخر پسند آدمی ہے اس کے لیے کوئی ایسی امتیازی بات فرمادیجئے کہ اس کا سر فخر سے اونچا ہو جائے تو آپ ﷺ نے فرمادیا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کے لئے امان ہے۔" ان لوگوں کو بھی امان دے دی ہے جو اپنے دروازے بند کرلیں یا مسجد حرام میں داخل ہو جائیں یا ہتھیار ڈال دیں۔

حضور ﷺ جب فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہونے لگے تو آپ اپنی اونٹنی "قصواء" پر سوار تھے۔ ایک سیاہ رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کے ایک جانب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسری جانب اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ تھے اور آپ کے چاروں طرف جوش میں بھرا ہوا اور ہتھیاروں میں ڈوبا ہوا لشکر تھا جس کے درمیان کوکبۂ نبوی تھا۔ اس شاہانہ جلوس کے جاہ و جلال کے باوجود شہنشاہ رسالت ﷺ کی شان تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ سورۂ فتح کی تلاوت فرماتے ہوئے اس طرح سر جھکائے ہوئے اونٹنی پر بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ کا سر اونٹنی کے پالان سے لگ لگ جاتا تھا۔ آپ ﷺ کی یہ کیفیت تواضع خداوند قدوس کا شکر ادا کرنے اور اس کی بارگاہِ عظمت میں اپنے عجز و نیاز مندی کا اظہار کرنے کے لیے تھی۔ (21)

کفارِ مکہ سے خطاب

اس کے بعد شہنشاہ کونین ﷺ نے اس ہزاروں کے مجمع میں ایک گہری نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سر جھکائے، نگاہیں نیچی کئے ہوئے لرزاں و ترساں اشراف قریش کھڑے ہوئے ہیں۔ ان ظالموں اور جفاکاروں میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے آپ ﷺ کے راستوں میں کانٹے بچھائے تھے۔ وہ لوگ بھی تھے جو بارہا آپ ﷺ پر پتھروں کی بارش کر چکے تھے۔ وہ خونخوار بھی تھے جنھوں نے بار بار آپ ﷺ پر قاتلانہ حملے کیے تھے۔ وہ بے رحم و بے درد

بھی تھے جنہوں نے آپ ﷺ کے دندان مبارک کو شہید اور آپ ﷺ کے چہرۂ انور کو لہولہان کر ڈالا تھا۔ وہ اوباش بھی تھے جو برسہابرس تک اپنی بہتان تراشیوں اور شرمناک گالیوں سے آپ ﷺ کے قلب مبارک کو زخمی کر چکے تھے۔ وہ سفاک و درندہ صفت بھی تھے جو آپ ﷺ کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر آپ کا گلا گھونٹ چکے تھے۔ وہ ظلم و ستم کے مجسمے اور پاپ کے پتلے بھی تھے جنہوں نے آپ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نیزہ مار کر اونٹ سے گرا دیا تھا اور ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ وہ آپ کے خون کے پیاسے بھی تھے جن کی تشنہ لبی اور پیاس خون نبوت کے سوا کسی چیز سے نہیں بجھ سکتی تھی۔ وہ جفاکار و خونخوار بھی تھے جن کے جارحانہ حملوں اور ظالمانہ یلغار سے بار بار مدینہ منورہ کے در و دیوار دہل چکے تھے۔ حضور ﷺ کے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل اور ان کی ناک، کان کاٹنے والے، ان کی آنکھیں پھوڑنے والے، ان کا جگر چبانے والے بھی اس مجمع میں موجود تھے۔ وہ ستم گار جنہوں نے شمع نبوت کے جاں نثار پروانوں حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت عمار، حضرت خباب، حضرت خبیب، حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کو رسیوں سے باندھ باندھ کر کوڑے مار مار کر جلتی ہوئی ریتوں پر لٹایا تھا، کسی کو آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں پر سلایا تھا، کسی کو چٹائیوں میں لپیٹ لپیٹ کر ناکوں میں دھوئیں دیئے تھے، سینکڑوں بار گلا گھونٹا تھا۔ یہ تمام جور و جفا اور ظلم و ستمگاری کے پیکر، جن کے جسم کے رونگٹے رونگٹے اور بدن کے بال بال ظلم و عدوان اور سرکشی و طغیان کے وبال سے خوفناک جرموں اور شرمناک مظالم کے پہاڑ بن چکے تھے۔ آج یہ سب کے سب دس بارہ ہزار مہاجرین و انصار کے لشکر کی حراست میں مجرم بنے ہوئے کھڑے کانپ رہے تھے اور اپنے دلوں میں یہ سوچ رہے تھے کہ شاید آج ہماری لاشوں کو کتوں سے نچوا کر ہماری بوٹیاں چیلوں اور کووں کو کھلا دی جائیں گی اور انصار و مہاجرین کی غضب ناک فوجیں ہمارے بچے بچے کو خاک و خون میں ملا کر ہماری نسلوں کو نیست و نابود کر ڈالیں گی اور ہماری بستیوں کو تاخت و تاراج کر کے تہس نہس کر ڈالیں گی ان مجرموں کے سینوں میں خوف و ہراس کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ دہشت اور ڈر سے ان کے بدنوں کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی، دل دھڑک رہے تھے، کلیجے منہ میں آ گئے تھے اور عالم یاس میں انہیں زمین سے آسمان تک دھوئیں ہی دھوئیں کے خوفناک بادل نظر آ رہے تھے۔ اسی مایوسی اور ناامیدی کی خطرناک فضا میں ایک دم شہنشاہِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہ رحمت ان پاپیوں کی طرف

متوجہ ہوئی۔ اور ان مجرموں سے آپ نے پوچھا کہ "بولو! تم کو کچھ معلوم ہے؟ کہ آج میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔"

اس دہشت انگیز اور خوفناک سوال سے مجرمین حواس باختہ ہو کر کانپ اُٹھے لیکن جبین رحمت کے پیغمبرانہ تیور کو دیکھ کر اُمید و بیم کے محشر میں لرزتے ہوئے سب یک زبان ہو کر بولے کہ:

﴿اَخٌ کَرِیۡمٌ وَابۡنُ اَخٍ کَرِیۡمٍ﴾

آپ کرم والے بھائی اور کرم والے باپ کے بیٹے ہیں۔

سب کی للچائی ہوئی نظریں جمال نبوت کا منہ تک رہی تھیں۔ اور سب کے کان شہنشاہ نبوت کا فیصلہ کن جواب سننے کے منتظر تھے کہ اک دم دفعۃً فاتح مکہ نے اپنے کریمانہ لہجے میں ارشاد فرمایا کہ

﴿لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ فَاذۡهَبُوۡا اَنۡتُمُ الطُّلَقَآءُ﴾

آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

بالکل غیر متوقع طور پر ایک دم اچانک یہ فرمان رسالت سن کر سب مجرموں کی آنکھیں فرط ندامت سے اشکبار ہو گئیں اور ان کے دلوں کی گہرائیوں سے جذبات شکر کے آثار آنسوؤں کی دھار بن کر ان کے رخسار پر مچلنے لگے اور کفار کی زبانوں پر لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ کے نعروں سے حرم کعبہ کے در و دیوار پر ہر طرف انوار کی بارش ہونے لگی۔ ناگہاں بالکل ہی اچانک اور دفعۃً ایک عجیب انقلاب برپا ہو گیا کہ سماں ہی بدل گیا، فضا ہی پلٹ گئی اور ایک دم ایسا محسوس ہونے لگا کہ

جہاں تاریک تھا، بے نور تھا اور سخت کالا تھا
کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا تھا

کفار نے مہاجرین کی جائدادوں، مکانوں، دکانوں پر غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا۔ اب وقت تھا کہ مہاجرین کو ان کے حقوق دلائے جاتے اور ان سب جائدادوں، مکانوں، دکانوں اور سامانوں کو مکہ کے غاصبوں کے قبضوں سے واگزار کر کے مہاجرین کے سپرد کیے جاتے۔ لیکن شہنشاہ رسالت نے مہاجرین کو حکم دے دیا کہ وہ اپنی کل جائدادیں خوشی خوشی مکہ والوں کو ہبہ کر دیں۔

اللہ اکبر! اے اقوام عالم کی تاریخی داستانو! بتاؤ کیا دنیا کے کسی فاتح کی کتاب زندگی میں کوئی ایسا حسین وزریں ورق ہے؟ اے دھرتی! خدا کے لئے بتا؟ اے آسمان! اللہ کے لیے بول۔ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا فاتح گزرا ہے؟ جس نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا حسن سلوک کیا ہو؟ اے چاند اور سورج کی چمکتی اور دوربین نگاہو! کیا تم نے لاکھوں برس کی گردش لیل ونہار میں کوئی ایسا تاجدار دیکھا ہے؟ تم اس کے سوا اور کیا کہو گے؟ کہ یہ نبی جمال و جلال کا وہ بے مثال شاہکار ہے کہ شاہان عالم میں اس کی نظیر تو کیا اس کا تصور بھی محال ہے۔(22)

خطبہ حجۃ الوداع امن عالم کا ابدی پیغام:

۱۰ھ میں آپ ﷺ نے ایک لاکھ چودہ ہزار اور دوسری روایتوں میں ہے ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد یہ آپ کا پہلا اور آخری حج تھا۔ اس حج کو "حجۃ الوداع" کے نام سے کتب سیرت میں یاد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر رسول اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ کے متعدد مقام پر صحابہ کرام سے خطاب فرمایا۔ یہ خطبہ دراصل عدل وانصاف، امانت ودیانت، حق گوئی وبے باکی، طہارت وپاکیزگی، محبت ومودت، اخوت و بھائی چارگی اور امن وامان کی ایک دستاویز اور نسلی ونسبی عصبیتوں کی شکار مظلوم انسانیت کے نام ایک انقلابی پیغام ہے۔ اس خطبہ کو خطبہ حجۃ الوداع کے نام شہرت حاصل ہے۔ علمانے اس عنوان پر باضابطہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس انقلابی خطبہ کے چند اقتباس پڑھنے سے قبل رومانیہ کے مشہور غیر مسلم ادیب گونسٹن ویٹر ریل جارج "خطبۂ حجۃ الوداع" پر ہمہ گیر اہمیت وافادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب ہم یہ خطبہ پڑھتے ہیں تو باوجودے کہ ہم یورپی ہیں اور پیغمبر امن (ﷺ) کی آواز ہم نے نہیں سنی اور نہ ہم اس مقام پر اس مجمع میں موجود تھے پھر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اسلام میں اس خطبہ کا بہت اثر رہا ہے اور آج بھی ہے۔(23)

اس مبارک خطبہ کے چند اقتباسات ہدیہ قارئین ہے۔ ان اقتباسات کو پڑھیں اور اندازہ کریں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے کس طرح انسان کو انسانیت اور ابن آدم کو آدمیت کا درس دے کر انہیں ارشاد وہدایت اور امن و سکون کا راہی بنانے کی سعی مشکور فرمائی ہے۔ اب اس خطبہ کے اقتباس کو پڑھیں۔

"لوگو اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں جماعتوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت و عظمت و کرامت والا اللہ رب العزت کی نظروں میں وہی ہے جو اللہ تعالی سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ لہذا کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ نہ کسی گورے کو کالے پر برتری ہے اور نہ کالے کو گورے پر۔ عظمت و بزرگی کا معیار فقط تقوی ہے۔

قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامان آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

اے قریش کے لوگو! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا ہے اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔

لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے پر قطعا حرام کر دی گئی ہیں، ان چیزوں کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسے اس دن کی اور اس ماہ مبارک (ذی الحجہ) کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا کے حضور جاؤ گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

لوگو! دور جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں تلے روند دیا۔ زمانہ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے، ربیعہ بن حارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔

اس مبارک خطبہ کے یہ چند مبارک اقتباسات ہیں جن میں انسانی مساوات کا تصور، حقوق کی ادائگی کا حکم، نسلی عصبیت و نسبی تفاخر کا خاتمہ جیسے بے شمار انقلاب آفریں پیغام کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ یہ خطبہ دراصل امن عالم کا ابدی اور عالمی چارٹر ہے۔

دشمنوں سے لڑائی میں امن پسندی:

لڑائی اور جنگ کے وقت دنیا سب کچھ جائز سمجھتی ہے اور بے دریغ خون بہا کر تباہی و بربادی کر دینے کو اپنا افتخار تصور کرتی ہے لیکن پیغمبر اسلام چونکہ پیغمبر امن ہیں ان کا مقصد حصول اقتدار نہیں تھا بلکہ آپ کا نصب العین

قوانین الہیہ کا نفاذ اور دنیا میں عدل و انصاف کا فروغ، مساوات و اخوت کی ترقی، ہمدردی و رواداری کی بنیادیں مضبوط کرنا اور تہذیب و تمدن کی بناڈالنا تھا اس لیے پیغمبر امن نے غزوات و لڑائی میں دشمنوں کے سامنے امن پسندی کا مظاہرہ فرمایا اور غزوات کے وقت صحابہ کو جنگ میں پر امن اصول کو برتنے کی تاکید و تعلیم فرمائی جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی امن پسندی کی قوی دلیل ہے۔

سزا میں مساوات

1: دشمن کو سزا اتنی ہی دی جائے جتنی زیادتی اس نے کی یا اسے معاف کر دیا جائے تو اور بہتر ہے۔ ارشاد ربانی ہے

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ﴾(24)

ترجمہ: اور اگر تم سزا دو تو ایسی ہی سزا دو جیسی تمہیں تکلیف پہونچائی تھی اور اگر تم صبر کرو تو بے شک صبر والوں کو صبر سب سے اچھا ہے۔

بچے، بوڑھے اور خواتین سے اعراض:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيرًا وَلَا امْرَأَةً﴾(25)

ترجمہ: جنگ میں بہت بوڑھے، بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔

غفلت میں حملہ کرنے کی ممانعت:

پیغمبر امن ﷺ نے جنگی اصولوں میں اس امر کو بھی خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا کہ مخالف قوم پر اچانک حملہ نہ کیا جائے اور اس کی تعلیم خود پیغمبر امن نے عملی طور پر پیش فرمائی چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کا معمول ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

﴿كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يُغِرْ حَتَّى يُصْبِحَ﴾ (26)

یعنی: رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ جب بھی کسی قوم سے جہاد فرماتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہیں فرماتے تھے۔

جنگ کے دوران قدرتی چیزوں کی حفاظت:

دنیا کے جنگجو گروہوں کا کل بھی یہی مزاج تھا اور آج بھی یہی حال ہے کہ اگر وہ دشمن کے علاقے میں داخل ہو گئے تو پھر کھیتوں کو تباہ کرنا، ان کی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلنا، ان کے تجارتی مراکز میں توڑ، پھوڑ اور آتش زنی کرنا، ان کی فصلوں کو تباہ کرنا اور ہر قسم کی تباہی کو روا رکھنا اپنا فاتحانہ حق تصور کرتے ہیں لیکن پیغمبر امن ﷺ کے پیش نظر جنگ کا مقصد اقتدار اور دولت نہیں تھا بلکہ حق کے کلمہ کو بلند کرنا، دنیا میں الٰہی نظام نافذ کر کے کرۂ ارض کو عدل وانصاف اور امن وامان سے بھر دینا مقصود تھا اس لیے پیغمبر امن ﷺ نے جنگ میں بھی تخریب کے بجائے تعمیر، تباہی کے بجائے اصلاح اور خوں ریزی کے بجائے امن و امان کی تعلیم دی۔ اور رسول مکرم ﷺ نے اللہ رب العزت کا یہ پیغام بندگان خدا کو سنایا:

﴿وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَؕ-وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ﴾(27)

ترجمہ: اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے اور اللہ فساد سے راضی نہیں ۔

الغرض مصطفی جان رحمت ﷺ نے جنگ کے سلسلے میں اس طرح کے متعدد رہنما اصول عنایت فرمائے ہیں جنہیں پڑھ کر ہر قلب صادق اس بات کے احساس پر خود کو مجبور پاتا ہے کہ حالت جنگ میں ان باتوں کا پاس ولحاظ وہی رکھ سکتا ہے جو انسان اور انسانیت کا بہی خواہ، بنی نوع آدم کا مخلص، اہل عالم کی فلاح و بہبود کا خواہاں اور امن عالم کا مبلغ اعظم ہو۔

پہلی ہجری سے دسویں ہجری کے درمیانی سالوں میں متعدد غزوات رونما ہوئے۔ ان غزوات کے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی کوشش یہی رہی کہ دشمن کو موت گھاٹ نہ اتارا جائے بلکہ اسے بے بس کر دیا جائے یہاں تک کہ یا تو وہ تعاون کرے یا مزاحمت چھوڑ دے۔ چنانچہ خیبر کی مہم کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیغمبر امن ﷺ نے علم خاص دے کر جو ہدایت فرمائی۔ وہ ہدایت بھی دراصل اسی امر کا بیان ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے علی! اگر تمہارے ذریعے سے ایک شخص کو بھی ہدایت ہو گئی تو یہ تمہارے لیے سب سے بڑی نعمت ہو گی۔

ذرا غور کریں لشکر کے کمانڈر آف چیف سے یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ دشمن کا سر کاٹ کر لانا یہ تمہاری کامیابی کی ضمانت ہے۔ نہیں نہیں بلکہ اس امر کی ترغیب دی جارہی ہے کہ مخالفین کے دلوں کو تسخیر کرنے کی کوشش کرنا جو اس بات کا واضح بیان ہے کہ پیغمبر امن کے عہد سعید میں جو جنگیں ہوئیں ان کا مقصد خونریزی نہیں تھا بلکہ مقصد تھا کہ لوگ باطل عقائد و نظریات سے نکل کر حق وہدایت اور گمراہ کن رسوم کے دلدل سے نکال کر عدل و مساوات کی زمین پر قدم رکھیں۔ اور اس کے لیے جان لینے کی نہیں دل بدلنے کی ضرورت تھی۔ اور پیغمبر امن ﷺ نے اس مقصد عظیم کو ہر جنگ میں پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ عہد نبوی ﷺ کے غزوات کی کاروائیوں کو سامنے رکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ پیغمبر امن ﷺ نے کم سے کم خونریزی کے اصول پر عمل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں جو جنگیں ہوئیں اس میں طرفین سے جانی نقصان کم سے کم ہوا۔ چنانچہ چھوٹی بڑی جنگیں ملا کر کل 27 جنگیں 2ھ سے 9ھ تک آٹھ سال کے اندر ہوئیں جن میں کل 918 آدمیوں کی جانیں گئیں۔ 27 غزاوت میں جان سے جانے والوں کی یہ تعداد اس عہد کی ہے جس عہد میں انتقام در انتقام کی شکل میں ہونے والی خوں ریز جنگوں میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت و بربادی ایک عام سی بات تھی۔ اب اس مقام پر تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیے۔ وہ لوگ جو خود کو امن کا علمبر دار تصور کرتے ہیں اور اسلامی جہاد کو دہشت گردی کا نام دیتے ہیں ذرا ان کے کارناموں کا بھی سرسری جائزہ لیتے چلیے تاکہ معلوم ہو کہ اپنے کو مہذب اور امن پسند کہنے والے ان افراد کا دامن انسانی خون سے کیسا رنگین ہے اور انہوں نے حصول اقتدار کے لیے دنیا کو آنسو، آہیں اور خون کے سوا کچھ نہیں دیا ہے۔ اب یہاں مختصرا صرف پہلی جنگ عظیم کے جانی نقصانات اور دوسری جنگ عظیم کی ہلاکت خیزیوں کی لسٹ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

پہلی جنگ عظیم میں روس کے سترہ لاکھ۔ جرمنی کے سولہ لاکھ۔ فرانس کے تیرہ لاکھ ستر ہزار۔ اٹلی کے چار لاکھ ساٹھ ہزار۔ آسٹریا کے آٹھ لاکھ۔ برطانیہ کے ساتھ لاکھ۔ ترکی کے دولاکھ پچاس ہزار۔ بلجیم کے ایک لاکھ دو ہزار۔ بلغاریہ کے ایک لاکھ۔ رومانیہ کے ایک لاکھ۔ سردیا دمانٹینگری کے ایک لاکھ۔ امریکہ کے پچاس ہزار افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

یعنی پہلی جنگ عظیم میں کل جانی نقصان تہتر لاکھ بتیس ہزار کا ہوا۔ 7,332,000

اسی طرح دوسری جنگ عظیم میں روس کے دو کروڑ دس لاکھ۔ جرمنی کے سولہ لاکھ، پولینڈ کے نو لاکھ۔ چین کے تیس لاکھ۔ جاپان کے ستائس / پچاس لاکھ۔ آسٹریا کے سات لاکھ، رومانیہ کے سات لاکھ۔ فن لینڈ کے ایک لاکھ تراسی ہزار۔ چیکو سلویکیہ کے ساٹھ ہزار۔ سلاویکیہ کے تیس لاکھ پچاس ہزار، امریکہ کے دس لاکھ ستر ہزار۔ برطانیہ کے چودہ لاکھ تیس ہزار۔ فرانس کے دس لاکھ۔ اٹلی کے گیارہ لاکھ۔ یوگوسلادیہ کے سولہ لاکھ پچاسی ہزار ۔ ہنگری کے چھ لاکھ۔ ہالینڈ کے دولاکھ پچھتر ہزار۔ بلجیم کے ساٹھ ہزار۔ فلپائن کے تیس ہزار افراد مارے گئے۔ (28)

مقتولین و مہلوکین کی اس لسٹ کو دیکھ کر ان جنگوں کے سورماؤں کو انسانیت کے کس خانے میں فٹ کیا جائے اور جن لوگوں نے اپنے مقاصد رذیلہ کے تحت دنیا کی آبادی کو بیک وقت آگ کے الاؤ میں جھونک دیا، جنگ کے آتش فشاں پر کھڑا کر دیا کیا ان کا منہ ہے اسلامی جہاد کی پاکیزہ مہم پر انگشت نمائی کرنے کا؟

پیغمبر امن ﷺ کے ارشادات امن عالم کا اکمل ترین نصاب:

مذکورہ گفتگو میں آپ نے حضور اکرم پیغمبر امن ﷺ کے گوشۂ حیات کے چند پہلوؤں کو اجمالا ملاحظہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی ساری زندگی امانت و دیانت، عدالت و صداقت، شرافت و طہارت اور حق وہدایت اور امن و امان سے عبارت ہے۔ اب ذیل میں پیغمبر امن ﷺ کے چند ارشادات عالیہ درج کیے جا رہے ہیں جو قیام امن کے باب میں ایک جامع، غیر مبدل اور عظیم الشان نصاب ہے۔ بلاشبہ یہ نصاب قیامت تک کے لیے ہر ملک ہر خطے، ہر سوسائٹی، ہر قوم، ہر علاقے کے لیے یکساں مفید اور لائق عمل ہے۔ چشم محبت لگا کر حضور اکرم ﷺ کے چند ارشادات ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

احترام انسانیت:

﴿اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللهِ. فَأَحَبُّهُمْ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهِ﴾ (29)

ترجمہ: تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے اور تمام مخلوق میں خدا کا سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جو اس کے کینبے کو زیادہ نفع پہنچائے۔

انسانوں سے رحم اور مروت کا برتاؤ:

﴿الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ ارْحَمُوا أَهْلَ الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ﴾(30)

ترجمہ: رحمن کرنے والوں پر رحمن اللہ تعالی رحم فرماتا ہے، تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم لوگوں پر رحم فرمائے گا۔

مومن کو امن پسندی کی ہدایت:

پیغمبر امن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

﴿الْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِم﴾(31)

ترجمہ: مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے اموال اور اپنی جانوں کو محفوظ جانیں۔

قتل وغارت کا خاتمہ:

پیغمبر امن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بندگان خدا کو یہ الہی پیغام سنایا:

﴿اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ﴾(32)

ترجمہ: جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد مچایا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا۔

جھوٹے الزامات اور بہتان تراشی کا خاتمہ:

پیغمبر امن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جھوٹے الزامات اور عصمت پر آنچ لانے والے افراد کو اللہ بہتان تراشی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بندگان خدا کو اللہ رب العزت کا یہ ارشاد سنایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾(33)

ترجمہ: اور جو پارسا عورتوں کو عیب لگائیں پھر چار گواہ معائنہ کے نہ لائیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی کوئی گواہی کبھی نہ مانو اور وہی فاسق ہیں۔

اس قرآنی ارشاد میں کس قدر انسانی حقوق کی پاسداری اور عصمت وعفت کی حفاظت وصیانت کی تعلیم دی گئی ہے کہ ایک عورت کے لیے اس کی عزت و آبرو سب سے اہم ہوا کرتی ہے، اب ایسے میں کوئی کسی عورت پر تہمت

لگائے تو یہ اس کے لیے سب سے سنگین مسئلہ ہے اس سے معاشرہ میں فتنہ و فساد برپا ہو گا اور زندگی اجیرن بن جائے گی، اس لیے اسلام نے خواتین کی عزت و آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے یہ الٰہی قانون سنایا کہ کوئی بلاوجہ اور بلا سبب کسی پاک دامن عورت کے سلسلے میں الزام تراشی نہ کر سکے کیونکہ غلط بیانی کے بعد وہ خود سکون سے نہیں بیٹھ سکے گا، اس کو یہ امر ثابت کرنا ہو گا اور اگر ثابت نہ کر سکا تو پھر کسی کی عزت سے کھیلنے کے پاداش میں اس کو دینی و دنیاوی ہر سطح پر خسران و نقصان اور شرمندگی کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہ حقوق نسواں کے باب میں امن و امان کا ایک مژدہ جانفزا ہے۔

مذہبی آزادی:

حضور اکرم ﷺ نے اہل نجران سے جو معاہدہ کیا اس کے الفاظ پڑھیں، اس سے معلوم ہو گا کہ حضور ﷺ کی تعلیمات میں جبر و اکراہ نہیں تھا بلکہ ہر کسی کو مذہبی آزادی و تحفظ فراہم کیا گیا تھا جو بلاشبہ پیغمبر امن ﷺ کی امن پسندی پر برہان قوی ہے۔ اس معاہدہ میں حضور ﷺ نے یہ تحریری فرمان جاری کیا تھا:

اللہ تعالی اور اس کے رسول محمد ﷺ ، اہل نجران اور ان کے حلیفوں کے لیے ان کے خون، ان کی جانوں، ان کے مذہب، ان کی زمینوں، ان کے اموال، ان کے راہبوں اور پادریوں، ان کے موجود اور غیر موجود افراد، ان کے مویشیوں اور قافلوں اور ان کے مذہبی ٹھکانوں وغیرہ کے ضامن اور ذمے دار ہیں۔ جس دین پر وہ ہیں اس سے ان کو نہیں پھیرا جائے گا۔ ان کے حقوق اور ان کی عبادت گاہوں کے حقوق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی، نہ کسی پادری کو، نہ کسی راہب کو، نہ کسی سردار کو اور نہ کسی عبادت گاہ کے خادم کو، خواہ اس کا عہدہ معمولی ہو یا بڑا، اس سے نہیں ہٹایا جائے گا اور ان کو کوئی خوف و خطرہ نہ ہو گا۔(34)

جانور کے قتل ناحق سے بھی پیغمبر امن نے منع فرمایا:

پیغمبر امن ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ قَتَلَ عُصْفُورًا فَمَا فَوْقَهَا بِغَيْرِ حَقِّهَا، سَأَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَنْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾(35)

جس نے کسی چڑیا یا اس سے بھی چھوٹے کسی جانور کو بے مقصد اور ناحق قتل کیا اللہ تعالی بروز قیامت اس کے بارے میں اس سے باز پرس فرمائے گا۔

ظلم وزیادتی کا خاتمہ:

ظلم وزیادتی کو جرم عظیم گردانتے ہوئے پیغمبر اسلام نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد مصطفوی ہے:

﴿لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوقَ إِلَى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، حَتَّى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ، مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ﴾(36)

ترجمہ: تمہیں بروز قیامت حق والوں کے حق ضرور ادا کرنے ہوں گے حتی کہ بغیر سینگوں والی بکری کو سینگوں والی بکری سے بدلہ دلوایا جائے گا۔

چوری اور ڈاکہ زنی:

چوری اور ڈاکہ زنی ہر دو عمل ایک صالح اور پر امن معاشرہ کے خلاف ہیں۔ جہاں چوری اور ڈاکہ زنی ہو وہ معاشرہ کبھی بھی پر سکون اور پر امن معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر امن ﷺ نے اپنی پر امن تعلیمات کے ذریعہ اس امر پر از حد زور دیا کہ چوری اور ڈاکہ زنی معاشرہ کے لیے ناسور ہے اور عند اللہ بے حد مبغوض ہے۔ حضور پیغمبر امن ﷺ کا ارشاد عالی شان ہے:

﴿وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾(37)

اور چور جب چوری کرتا ہے تو (اس وقت) وہ مومن نہیں رہتا (یعنی اس کا ایمان کامل نہیں ہوتا)۔

اسی طرح ڈکیتی اور رہزنی اور علی الاعلان کسی کا مال چھین لینے کو حضور اکرم ﷺ نے جرم عظیم شمار فرمایا ہے۔

غصب کی مذمت:

پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِنَ الأَرْضِ ظُلْمًا، فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ﴾(38)

ترجمہ: جس نے کسی کی ایک بالشت زمین ناجائز طور سے دبائی ہے تو قیامت کے دن اس کی وجہ سے ساتوں زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

وعدہ خلافی کی مذمت:

پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ﴾(39)

ترجمہ: منافق کی علامتیں تین ہیں: جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور امانت میں خیانت کرتا ہے۔

امانت کا حکم:

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

﴿لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ﴾(40)

ترجمہ: جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں وعدے کی پابندی نہیں اس میں دین داری نہیں۔

عدل وانصاف سب کے لیے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾(41)

ترجمہ: کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہر حال میں عدل کرو یہ روش تقوی سے زیادہ قریب ہے۔

مردوں کو ہدایت دی:

﴿خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ﴾(42)

ترجمہ: تم میں وہی لوگ بہتر ہیں جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھے ہیں

عورتوں کی رہنمائی:

حدیث شریف میں عورتوں کو ایک اچھی بیوی بن کر رہنے کی تعلیم فرمائی گئی ہے چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

﴿قِيلَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ؟ قَالَ: «الَّتِي تَسُرُّهُ إِذَا نَظَرَ، وَتُطِيعُهُ إِذَا أَمَرَ، وَلَا تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ﴾(43)

عرض کیا گیا: یارسول اللہ ﷺ کون سی عورت سب ست بہتر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: شوہر کو خوش کرے جب وہ اس کی طرف دیکھے، اطاعت کرے جب وہ کسی کام کا حکم دے، نیز اپنے مال کے بارے میں کوئی ایسا رویہ نہ اپنائے جو شوہر کو ناپسند ہو۔

یہ ارشادات مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ ایسے کثیر ارشادات و ہدایت اور تعلیمات پیغمبر اسلام ﷺ نے عنایت فرمائے ہیں جس میں تکبر، ظلم، فحش انگاری و بد زبانی، غیبت، دور خاپن، وعدہ خلافی، عیب چینی، حسد،، بد گمانی، بد نگاہی، جھوٹی گواہی، استہزا اور تمسخر، ناجائز حمایت و طرف داری جیسی لعنتوں کو انسانی اخلاق کی بد ترین بیماریاں شمار کرا کر ان سے دور و نفور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے اور وقار و سنجیدگی، سادگی و صفائی، تعلیم و تعلم، صبر و شکر، شرم و حیا، توکل و استغناء، اخلاص و استقامت، انفاق و سخاوت، حلم و بردباری، مودت و مروت، اخوت و محبت، عبادت و ریاضت، دنیا سے بے رغبتی اور فکر آخرت جیسے اسباق کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، بلاشبہ حضور مصطفی جان رحمت ﷺ کی تعلیمات امن و امان و خیر و سلامتی کا ایک ایسا عظیم و اکمل ترین نصاب ہے جس میں ہر عہد کے لیے امن کے رہنما اصول موجود ہیں۔ اور پیغمبر امن ﷺ کے یہ اصول صاف و شفاف آئینہ کی طرح ہر انسان کے روبرو ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اور ملتیں اس سے استفادہ بھی کر سکتی ہیں اور کرتی آرہی ہیں۔

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

مصادر و مراجع

(1) سورۃ الاحزاب، آیت 40

(2) The Genuine Islam (Der wahre Islam) Vol. 1, No. 8, 1936

(3) سورہ آل عمران۔ آیت 103

(4) صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ : «رُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ، حدیث 67
(5) سیرت ابن ہشام ج1 س 134
(6) سیرت ابن ہشام ج1 س 134
(7) سیرت ابن ہشام ج1 ص 134
(8) سیرت مصطفی ص 79-80۔ بحوالہ سیرت ابن ہشام ج ا ص 196 تا 197
(9) سیرت مصطفی ص-80۔ بحوالہ سیرت ابن ہشام ج1 ص 196 تا 197
(10) صحیح بخاری، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا» حدیث 3678
(11) سنن الترمذی، حدیث 2472
(12) الشفاء، الفصل الثاني عشر الحلم والاحتمال وَالعَفُوُ، ج1 ص 221
(13) زرقانی علی المواہب ج1 ص 288
(14) سیرت مصطفی
(15) زرقانی علی المواہب
(16) سیرت مصطفی بحوالہ بخاری، باب الولیمۃ ولو بشاۃ، ص 777، ج2
(17) سیرت مصطفی بحوالہ سیرتِ ابن ہشام ج4 ص 501 تا 502
(18) سیرت مصطفی بحوالہ سیرتِ ابن ہشام
(19) زرقانی ج2 ص 289
(20) سیرت مصطفی بحوالہ زرقانی ج2 ص 290
(21) سیرت مصطفی
(22) سیرت مصطفی
(23) محمد رسول اللہ ﷺ ۔ از گونسٹن ویز ریل جارج۔ ص 424
(24) سورہ النحل، آیت 126
(25) سنن ابو داؤد، بَابٌ فِي دُعَاءِ الْمُشْرِكِينَ، حدیث 2614
(26) صحیح البخاری۔ بَابُ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ النَّاسَ إِلَى الإِسْلَامِ وَالنُّبُوَّةِ، حدیث 2943
(27) سورۃ البقرہ آیت 205

(28) اسلام اور امن عالم، ص130-132

(29) مرقاۃ المفاتیح۔4998

(30) سنن ابی داؤد۔ باب فی الرحمۃ۔ حدیث 4941

(31) سنن ابن ماجہ۔ بَابُ حُرْمَةِ دَمِ الْمُؤْمِنِ وَمَالِهِ۔ حدیث۔ 3934

(32) سورۃ المائدہ۔ آیت 32

(33) سورۃ النور، آیت 4

(34) کتاب الخراج لابی یوسف ص 85

(35) سنن نسائی، باب مَنْ قَتَلَ عُصْفُورًا بِغَيْرِ حَقِّهَا، حدیث 4445

(36) صحیح مسلم۔ بَابُ تَحْرِيمِ الظُّلْمِ۔ حدیث 2582

(37) صحیح بخاری، حدیث 5578

(38) صحیح البخاری۔ بَابُ مَا جَاءَ فِي سَبْعِ أَرَضِينَ۔ حدیث 3198

(39) صحیح بخاری۔ بَابُ عَلاَمَةِ المُنَافِقِ۔ حدیث 33

(40) شعب الایمان۔ 4045

(41) شعب الایمان۔ 4045

(42) سنن الترمذی، بَابٌ فِي فَضْلِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ۔ 3895

(43) سنن نسائی، أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ۔ حدیث 3231

سیرت اور روحانیت

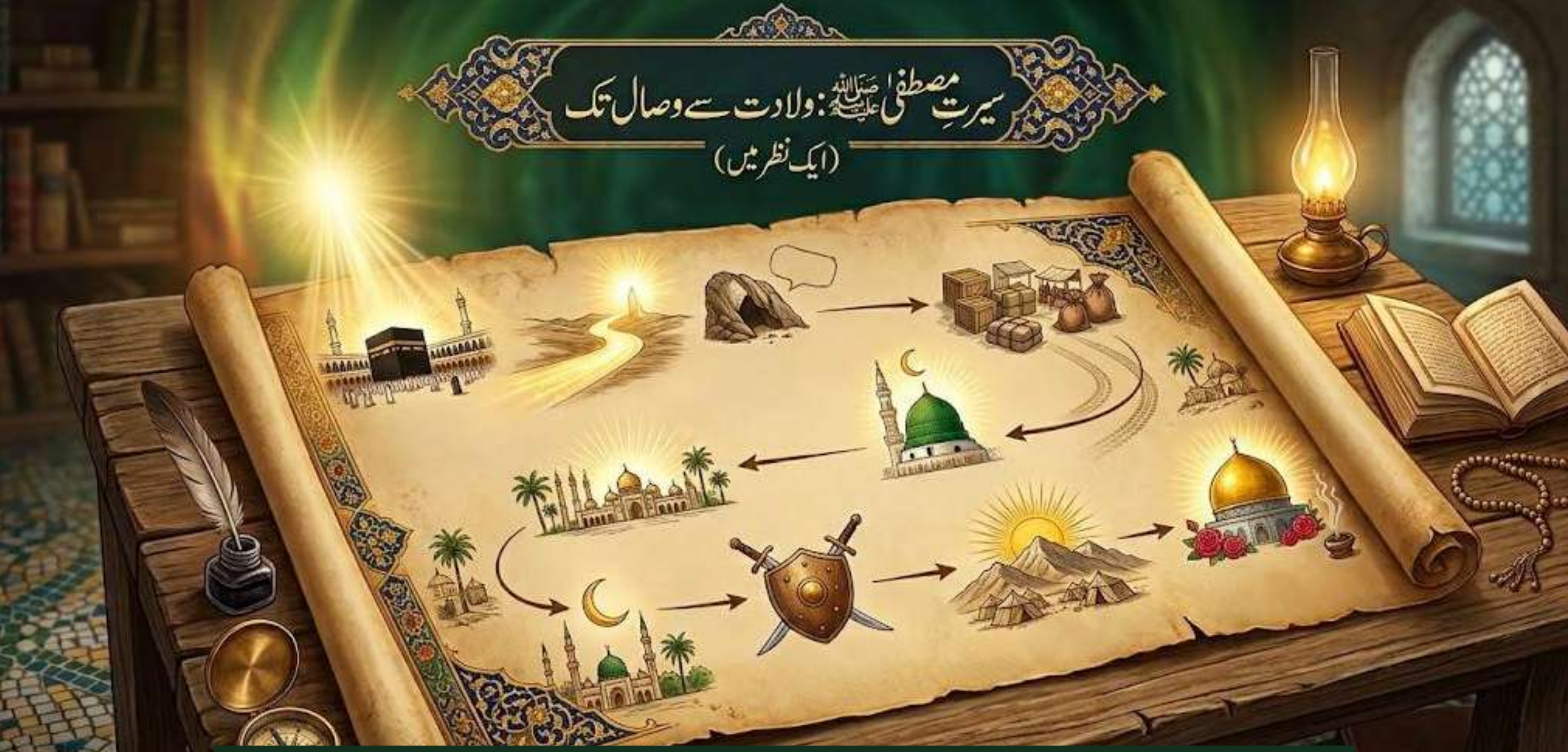

مولانا محمد عارف رضا اشفاقی، مرکز فروغ اسلام برکات اشفاق، ٹائیں نوح میوات ھریانہ

رحمۃ اللعالمین، مالک حل و حرم، تاجدار عرب و عجم، حضور طٰہٰ و یٰسٓ احمد مجتبی محمد مصطفی علیہ تحیۃ والثناء کی ولادت پاک 20/ اپریل 571ء بروز دوشنبہ مبارکہ مکۃ المکرمہ میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالی عنہ کے مبارک و پرنور گھر میں ہوئی۔ قبل ولادت حضرت آمنہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس انبیاء کرام تشریف لائے اور فرماتے: "مبارک ہو تیرے بطن میں خاتم النبیین تشریف فرما ہیں"۔ غیبی ندا سنائی دیتی کہ "نام محمد رکھنا"۔ عجیب وغریب چیزیں دیکھی و سنی گئیں۔ ہر عورت کو گرانی محسوس ہوتی ہے مگر حضرت آمنہ کو کوئی گرانی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہو بھی کیسے مصطفی جان رحمت کسی پر بوجھ بننے تشریف نہ لائے تھے بلکہ کائنات کا بوجھ اٹھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔

جس کو بارے دو عالم کی پرواہ نہیں
ایسے بازو کے قوت پہ لاکھوں سلام

حضرت آمنہ جہاں تشریف لے جاتیں ایام بہاری کی آمد آمد ہوتی تھی، ہریالی ہی ہریالی ہو جاتی، کنواں سے پانی خود بخود اوپر آجاتا تھا، ڈول کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ وقت ولادت آسمان کے تارے اتنے قریب ہوگئے کہ دیکھنے والوں نے کہا ایسا محسوس ہونے لگا کہیں ہم پر گر نہ پڑیں۔ ہاں ہاں اتر آئے تھے ستارے قمقمے بن کر، حضرت

جبرئیل امین سدرۃ المنتہی سے جلوس لے کر چلے جس میں 70 ہزار فرشتے شریک تھے۔ آپ نے ایک جھنڈا مشرق، دوسرا مغرب میں اور تیسرا کعبہ معظمہ پر نصب فرمایا۔ دایہ کے طور پر حضرت مریم اور دیگر پاک بیبیاں موجود تھیں ۔ حوران بہشت حاضر تھیں۔ فرشتے صلاۃ وسلام کا ورد کر رہے تھے کہ حضرت آمنہ فرماتی ہیں ﴿خرج منی نور﴾ مجھ سے ایک نور نکلا جس سے میں نے شام کے محلات دیکھ لیے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ تمام بچے روتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں مگر مصطفی جان رحمت ﷺ مسکراتے ہوئے پیدا ہوئے۔

یوں مسکرائے کہ جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

پیدا ہوتے ہی کریم آقا رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوگئے اور سجدہ میں ﴿رب ھب لی امتی﴾ لب پہ جاری تھا ،ناف بریدہ پیدا ہوئے، عجیب وغریب واقعات کا ظہور ہوا۔ ہزار سال سے جلنے والی آگ جس کی پارسی پوجا کرتے تھے یک بیک بجھ گئی، برسوں سے خشک دریا بہہ پڑا، ہزار برس سے بہنے والا دریا خوش ہو گیا، کسریٰ کے محل کے 14 کنگورے گر پڑے، کعبۃ اللہ بہر تعظیم حبیب خدا جھک گیا، کعبہ معظمہ کے اوپر رکھے ہوئے بت اوندھے منہ گر پڑے۔

بت شکن آیا یہ کہہ کر بت منہ کے بل گر پڑے
جھوم کر کہتا تھا کعبہ الصلوۃ والسلام
جن کے سجدے کو محراب کعبہ جھکی
ان بھوں کی لطافت پہ لاکھوں سلام
تیری امد تھی کہ بیت اللہ مجرے کو جھکا
تیری ہیبت تھی کہ ہر بت تھرا کر گر گیا

مکۃ المکرمہ کو اصل فضیلت آپ ﷺ کے سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿1﴾ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ مکہ کی قسم صرف اس لیے یاد فرمائی جارہی ہے کہ وہاں کے ذروں نے محبوب خدا ﷺ کے قدوم ناز کو بوسہ دیا ہے در حقیقت یہ راہ گزر کی قسم ہے۔

کھائی قرآن نے رہ گزر کی قسم
اس کف پاکی حرمت پہ لاکھوں سلام

قبل ولادت پاک والد ماجد حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالی عنہ وصال فرما گئے۔ عمر پاک چھ برس کی ہوئی تو والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالی عنہا وصال فرما گئیں، بعد ازآں حضرت عبد المطلب نے پرورش فرمائی، آٹھ برس کی عمر پاک ہوئی تو دادا جان نے بھی دنیا فانی کو الوداع فرمایا، دادا کے بعد چچا ابو طالب نے دل و جان سے آپ کی پرورش کی، ہر موڑ پر آپ کا ساتھ دیا۔

آپ نے اول سات روز والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالی عنہا کا دودھ پیا، بعد ازاں حضرت ثویبہ (ابو لہب کی لونڈی جس کو اللہ کے نبی ﷺ کی ولادت کی خوش خبری سنانے پر ابو لہب نے آزاد کر دیا تھا) نے چند روز دودھ پلانے کا شرف حاصل کیا، اس کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ کو دودھ پلانے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت حلیمہ جس کمزور اونٹنی پر آپ کو لے کر اپنے گھر آئیں وہ اونٹنی تندرست ہو گئی، بکریوں کے دودھ تھن سے بھر گئے، غریبی دور ہو گئی، قبیلے کی عورتیں آتیں آپ کے قدموں کا دھوون لے کر بکریوں میں چھڑکتیں ان کی بکریاں بھی خوب دودھ دیتیں۔

جن کے قدموں کا دھوون ہے آب حیات
ہے وہ جان مسیحا ہمارا نبی

ایسے ایسے برکات کا ظہور ہوا کہ لکھنے کو دفاتر بھی ناکافی ہیں۔ بچپن سے ہی آپ کی امانت داری، دیانتداری کا شہرہ تھا، ہر آدمی آپ کو امین و صادق کے لقب سے یاد کرتا تھا، چچا ابو طالب 10 برس کی عمر پاک میں آپ کو اپنے ساتھ ملک شام کی طرف تجارت کے لیے لے گئے، ایک راہب کی نظر آپ پر پڑی دیکھتے ہی چچا سے کہا انہیں واپس لے جاؤ، یہ خاتم النبیین ہیں، ہم نے توریت و انجیل میں جو نشانیاں پڑھی ہیں وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں،

یہود و نصاری ان کے دشمن ہیں، آپ واپس لے جائیں کہیں کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ چچاابو طالب نے راہب کی بات مانی اور واپس مکہ معظمہ آ گئے۔

15 برس کی عمر پاک میں حرب الفجار میں شریک ہوئے مگر قتال میں حصہ نہ لیا۔16 برس کی عمر پاک میں حلف الفضول نامی معاہدے میں شرکت فرمائی۔25 برس کی عمر پاک میں حضرت خدیجۃ الکبری نے آپ کے عجیب و غریب واقعات سن کر اور یہ دیکھ کر کے آپ کے سر اقدس پر ہر وقت ابر سایہ فگن رہتا ہے اور آپ کے اخلاق و کردار کی پاکیزگی کو دیکھ کر پیغام نکاح بھجوا دیا، چچاابو طالب نے منظوری دی اور نکاح کر دیا، خطبۂ نکاح چچاابو طالب نے پڑھا۔ کل ازاوج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے اسماء درج ذیل ہیں:

حضرت خدیجۃ الکبریٰ (وصال ۱۰ ار مضان ۱۰ھ)، حضرت سودہ (وصال ۱۹ھ)، حضرت عائشہ (وصال ۲۷ ر مضان ۵۷ھ)، حضرت حفصہ (وصال جمادی الاولیٰ ۴۱ھ)، حضرت زینب بنت خذیمہ (وصال ۲ھ)، حضرت ام سلمہ (وصال ۶۳ھ یا ۶۱ھ)، حضرت زینب بنت جحش (وصال ۲۰ھ)، حضرت جویریہ (وصال ربیع الاول ۵۶ھ)، حضرت ام حبیبہ (وصال ۴۴ھ)، حضرت صفیہ (وصال ۵۰ھ)، حضرت میمونہ بنت حارث (وصال ۲۱ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنھن۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی کل اولاد امجاد کے اسمائے پاک یہ ہیں:

حضرت قاسم، حضرت عبد اللہ، حضرت ابراھیم (تینوں شہزادے بچپن میں ہی واصل بحق ہوئے)۔ حضرت زینب (ولادت قبل بعثت، وصال ۸ھ) حضرت رقیہ (ولادت قبل بعثت، وصال ۲ھ) حضرت ام کلثوم (وصال ۹ھ) حضرت فاطمۃ الزہراء (11ھ سرکار دوعالم ﷺ کے پردہ فرماجانے کے ۶ ماہ بعد وصال فرمایا) کل اولاد پاک حضرت سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ کے بطن اقدس سے ہیں، سوائے حضرت ابراھیم کے آپ حضرت ماریہ قبطیہ سے ہیں۔

سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے 35 برس کی عمر پاک میں حجر اسود کو اپنے دست اقدس سے نصب فرما کر خانوادوں کے باہمی جھگڑے کو ختم فرما کر محبت کی فضا قائم فرمائی۔ 40 برس کی عمر پاک میں اعلان نبوت فرمایا، نزول وحی کی شروعات ہوئی۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

نبوت کا اعلان اور ہے نبی ہونا اور ہے آقا کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿کنت نبیا وآدم بین الماء والطین﴾ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم آب و گل کی منزلیں طے فرمارہے تھے۔ اعلان نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ مکرمہ میں تبلیغ اسلام فرماتے رہے اس کے بعد رب کے حکم سے ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لائے اور 10 برس مدینہ منورہ میں تشریف فرمارہے۔ آقا کریم ﷺ نے لوگوں کو کفر شرک کی دلدل سے نکال کر ایک خدا کی عبادت کا سبق پڑھایا، کسی نے ظاہری آنکھوں سے رب تعالی کا دیدار نہیں کیا یہ خصوصیت ہمارے اور آپ سب کے آقا ﷺ کی ہے کہ معراج میں بلا حجاب دیدار سے مشرف ہوئے جسے اللہ تعالی نے یوں بیان فرمایا: ﴿ما زاغ البصر وما تغی﴾ علم غیب کے نقطے کو اعلی حضرت نے ایک شعر میں یوں واضح فرمایا

اور کوئی غیب کیا تم سے نہاں ہو بھلا
جب نہ خدا ہی چھپا تم پہ کروڑوں درود

رب تعالی کے تمام نعمتیں ہمیں مصطفی ﷺ کے صدقے میں نصیب ہوئی ہیں حدیث قدسی ہے: ﴿لو لاک لما خلقت الافلاک والارضین﴾۔ اور اعلی حضرت فرماتے ہیں۔

غایت و علت سبب بہر جہاں تم ہو
سب تم سے بنا تم بنا تم پہ کروڑ درود
وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہو تو کچھ نہ ہو
وہ جان ہے جہان کی جان ہے تو جہان ہے

ہمارے نبی مصطفی جان رحمت ﷺ قاسم نعمت الہیہ ہیں حدیث پاک ہے ﴿انما انا قاسم واللہ یعطی﴾

لاورب العرش جس کو جو ملا ان سے ملا
بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

افضل الخلق افضل البشر میرے اور آپ سب کے آقا و مولا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اعلی حضرت فرماتے ہیں :

سب سے اعلی واولی ہمارا نبی
سب سے بالا و والا ہمارا نبی

خلق سے اولیاء اولیاء سے رسل
اور رسولوں سے اعلیٰ ہمارا نبی

اور امام بوصیری پکار اٹھے

فاق النبیین فی خلق وفی خلق
لم یدانوہ فی علم ولافی کرم

اب آیئے مختصراً 23 سالہ دور تبلیغ کو ملاحظہ فرمائیں

1/ نبوت: اعلان نبوت فرمایا

4/3/2 نبوت: میں تین برس تک خفیہ طور پر تبلیغ دین متین ہوتی رہی۔ اسی دوران فاران سے اعلانیہ تبلیغ فرمائی۔

5/ نبوت: 15/16 افراد نے حبشہ کی جانب پہلی مرتبہ ہجرت فرمائی۔ حضرت ذوالنورین عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ اس گروہ کے قائد تھے۔

7/6 نبوت: میں حبشہ کی طرف دوسری مرتبہ 86 افراد نے ہجرت فرمائی اس جماعت کے ترجمان حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالی عنہ تھے۔

آپ نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا تھا نجاسی بادشاہ اصحمہ نے مسلمانوں کو پناہ دی۔

9/8/7 نبوت: شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کا زمانہ گزرا

10/ نبوت میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا وصال ہوا۔ آپ کا مزار پاک جنت المعلی میں مرجع خلائق ہے۔ بعدہ اسی سال چچا ابو طالب بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اسی برس حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالی عنہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے طائف کا سفر فرمایا، واپسی میں انگور کے باغ میں قیام فرمایا جو کہ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا باغ تھا اور مطعم بن عدی نے اپ کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔

10 / نبوت: میں ہی 27 رجب المرجب کی شب معراج ہوئی۔ اسی شب پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔

11 / نبوت: بیعت عقبہ اولیٰ ہوئی جس میں قبیلہ خزرج کے چھ لوگوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

12 / نبوت: میں بیت نساء ہوئی جس میں قبیلہ اوس کے تین وقبل خزرج کے نو افراد تھے کل 12 افراد بیعت سے مشرف ہوئے۔

13 / نبوت: میں بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی۔ اس میں 77 افراد نے بیعت کا شرف حاصل کیا جس میں 75 مرد اور دو عورتیں تھیں۔

مدنی دور ملاحظہ فرمائیں

1 ھ: میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت فرمائی، راہ میں حضرت سیدنا ابو بکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں قیام فرمایا اور آیت کریمہ ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ نازل ہوئی۔ مسجد قبا تعمیر ہوئی جو کہ اسلام کی سب سے اول مسجد تھی۔ اسی برس مسجد نبوی کی بنیاد رکھی گئی جس قطع اراضی میں مسجد نبوی ہے یہ دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی تھی، ان سے خرید کر مسجد نبوی بنائی گئی، اسی برس انصار و مہاجرین میں بھائی چارگی قائم ہوئی، اسی برس یعنی ہجرت کے فورا بعد ظہر عصر عشاء کی نماز میں مقیم کے لیے دو دو رکعت کا اضافہ ہوا یعنی چار رکعت فرض ہوئیں ورنہ اس سے قبل ان تینوں نمازوں میں دو دو رکعت ہی فرض تھیں۔ اسی برس دستور مدینہ نافذ ہوا۔ اسی برس اذان کا حکم ہوا۔ اذان کے کلمات خواب میں حضرت عبد اللہ بن زید انصاری کو سکھائے گئے۔

2 ھ: میں درج ذیل اہم امور وقوع پذیر ہوئے

زکوۃ فرض ہوئی۔ رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ نماز عیدین قائم ہوئی۔ تحویل قبلہ مدینے میں بنو سلمہ کی مسجد میں ظہر کی نماز میں ہوا۔ اس مسجد کو مسجد قبلتین سے شہرت ہے۔ اسی میں 17 رمضان کو جنگ بدر ہوئی اس میں کل 313 مسلمان تھے اور ایک ہزار کفار۔ اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ 14 مسلمان شہید ہوئے اور 70 گرفتار ہوئے۔ "بدر" دراصل کنویں کا نام ہے اسی بنا پر اس میدان کو جہاں جنگ ہوئی میدان بدر کہا جاتا ہے اور مدینہ منورہ سے 85 میل جانب مغرب واقع ہے اور اس دن کو یوم فرقان سے یاد کیا جاتا ہے اور بدر کے فورا بعد غزوہ سویق اسی برس ہوا، بدر کے بعد غزوہ بنو قینقاع بھی اسی سال ہوا، اس قبیلے کے لوگوں کو مدینہ سے نکال دیا گیا اور وہ سب ملک شام چلے گئے تھے۔

3 ھ میں جنگ احد (کوہ احد کے قریب) جنگ ہوئی اسی میں دندان مبارک کا ایک حصہ شہید ہوا۔ احد وہ مبارک پہاڑ ہے جس کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا احد مجھ سے اور میں احد سے پیار کرتا ہوں۔

4 ھ: میں غزوہ بنو نضیر ہوا، بنو نضیر یہ یہودی قبیلہ تھا جو خیبر میں جا بسا تھا اور غزوہ بدر ثانی ہوا جسے بدر صغری بھی کہا کہا جاتا ہے۔

5 ھ: میں غزوہ دومۃ الجندل ہوا (یہ دور صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالی عنہ کے ہاتھ پر فتح ہوا 633ء میں) اسی برس واقعہ افک یعنی سورہ نور کے 10 آیتیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہما کی شان

برات میں نازل ہوئیں اور تیمم کا حکم نازل ہوا۔جنگ خندق بھی اسی سال ہوئی اسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں اس جنگ میں یہودی قبیلہ بنو قریضہ نے کفار قریش کا ساتھ دیا تھا اس بنا پر ان کو مدینے سے نکالا گیا اور یہی واقعہ غزوہ بنو قریضہ سے معروف ہے۔

6ھ:میں حدیبیہ کے مقام پر درخت کے نیچے 1400 صحابہ کرام نے بیعت کی جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے یہ مقام مکہ مکرمہ سے 14 کلومیٹر جانب مدینہ منورہ واقع ہے۔ صلح حدیبیہ کو اللہ تعالی نے سورہ فتح میں "فتح مبین" فرمایا بعد ازاں سید عالم ﷺ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں ،بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خاطر خطوط ارسال فرمائے۔

7 ھ:میں جنگ خیبر ہوئی اسی سال نبی رحمت ﷺ نے عمرۃ القضا ادا فرمایا۔

8 ھ:میں جنگ موتہ (یہ جنگ رومیوں کے خلاف تھی اس میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالی عنہ شہید ہوئے)ہوئی۔اسی سال مکہ فتح ہوا اور کعبہ کو بتوں سے پاک کیا گیا اور عتاب بن اسید اموی رضی اللہ تعالی عنہ کو مکہ مکرمہ کا اول گورنر بنایا گیا۔اسی برس جنگ حنین ہوئی اور طائف کے آس پاس کے علاقے فتح ہوئے۔

9 ھ:میں غزوہ تبوک ہوا،ہرقل روم کے خلاف اس میں بیک وقت یہودیوں وعیسائیوں سے جنگ ہوئی۔حج بھی اسی سال فرض ہوا اور گورنر مکہ کو امیر حج بنایا گیا اسی برس فتح مکہ کے بعد عربی قبائل کے وفود کثرت سے آئے اور مشرف بہ اسلام ہو کر اطاعت بجالائے اس سال کو سنۃ الوفود کے نام سے شہرت ملی۔

10ھ میں حضور سید عالم ﷺ نے وصال پاک سے تین ماہ قبل اول و آخر حج ادا فرمایا ،اس حج کو حجۃ الوداع کہتے ہیں اور اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اسے خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے جانا جاتا ہے۔

11ھ میں قبل وصال پاک حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالی عنہما کو رومیوں کے خلاف جہاد کے لیے روانہ فرمایا تھا۔اسی سال بارہ ربیع الاول شریف بروز دوشنبہ مبارکہ کو سید عالم رحمۃ اللعالمین ﷺ نے پردہ فرمایا۔ روضۂ اقدس مدینہ منورہ (حجرہ عائشہ میں)میں ہر عاشق کے لیے جائے پناہ ہے،رحمت کے چشمے دونوں عالم میں یہیں سے جاری ہیں۔

23سالہ دور تبلیغ ایک نظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئ تفصیل کے لیے تو دفاتر بھی ناکافی ہیں اور حق تو یہ ہے

اے رضا خود صاحب قران ہے مداح حضور
تجھ سے پھر کب ممکن ہے مدحت رسول اللہ کی

سیرت نبی اور مکارم اخلاق

حضرت علامہ عبد الرحمٰن مصباحی، جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی

سیرتِ رسولِ اعظم ﷺ کا ہر باب اتنا با معنی اور پر مغز ہے کہ اسے مستقل عنوان قرار دے کر تصنیف و تالیف کا ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جب خداوندِ قدوس نے قیامت تک تمام بنی نوع انسان کے لیے سرکار کی ذات کو نمونہ عمل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے زمانہ تغیر پذیر ہے، اسے ایک حال پر قرار نہیں ہے اس کے باوجود کسی ذات کا ہمیشہ نمونہ ہونا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے مگر حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔ اقوامِ عالم میں طرح طرح کے لوگ ہوتے رہے ہیں اور ان کے اخلاق و عادات، شمائل و خصائل بھی بدلتے رہے ہیں، ایسی صورت میں جو ذات سب کے لیے نمونہ ہو اس میں ایسے اوصاف حمیدہ کا ہونا ضروری ہے جو صلاح و فلاحِ انسانیت کے لیے باعث خیر ہو اور وہ ایسے اوصاف ہوں جو دائمی اور باقی رہنے والے ہوں اس زاویہ سے جب ہم سیرت پاک کا مطالعہ کرتے ہیں تو جو اوصاف ایک نبی کو تمام لوگوں سے ممتاز و منفرد کرتے ہیں تو وہ ہے دنیا میں سرکار کا اپنے اور بیگانوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ جو ہمیشہ یکساں نظر آتا ہے مثلاً راست گوئی جو تمام خیر کا منبع ہے وہ ہر جگہ برابر ہے، اگر اپنوں کے ساتھ صداقت کو اپنایا جا رہا ہے تو غیروں کے ساتھ بھی صداقت ہی کے پیرائے میں برتاؤ ہوتا ہے ایسا نہیں کہ غیر ہونے کے سبب اس کے ساتھ کذب و دروغ کو درست و جائز قرار دیا جائے۔

اسی طرح عدل و انصاف جس کی بنیاد حق پر ہوتی ہے وہ معاملہ سب کے ساتھ برابر ہے، اگر اپنا عزیز و قریب ہے اور حق اس کے ساتھ نہیں ہے تو کٹر دشمن کے لیے فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اپنے کو ظلم سے روکنے

کی نصیحت کی جاتی ہے اور دشمن کو عدل و انصاف کا پورا پورا صلہ دیا جاتا ہے۔ محض دشمن ہونے کی بناء پر اس کو نا انصافی کی اذیت نہیں جھیلنی پڑتی۔

اسی طرح حلم اور انتقام سے بچنے کی پوری رعایت ملحوظ ہوتی ہے، اگرچہ انتقام کی پوری قدرت موجود ہو، سرکارِ اعظم ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، البتہ کوئی خداوندِ قدوس کی مقرر کردہ حدوں کو توڑنے پامال کرنے کی جرأت کرتا تو اسے اس کے جرم کی مقدار کے اعتبار سے سزا دیتے لیکن سزا دینے میں بھی عدل کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا کہ تعدی اور ظلم کی حد سے قریب ہو جائے۔

قربانی جو ایک عظیم عبادت ہے، جس میں جانوروں کو ذبح کر کے تقرب الٰہی کی سعادت حاصل کی جاتی ہے اس کے تعلق سے ارشادِ نبوی ہے کہ جانور کے سامنے چھری تیز نہ کی جائے، نہ اسے بیجا تکلیف پہونچائی جائے یہ اسی خلق حسن کا پرتو جمیل ہے کہ انسان تو انسان جانور سے بھی اچھا برتاؤ کیا جائے۔

اسی طرح امانت داری جو عظیم خُلق و خصلت جمیلہ ہے اس تعلق سے رسولِ اعظم ﷺ کا کردار دنیا کے تمام رہنماؤں سے الگ ہے۔ آپ کے جانی دشمن جو ہر طرح کی سازشوں سے آپ کا قصہ تمام کرنے میں پیش پیش رہتے تھے، وہ بھی اپنی امانتیں آپ ہی کے پاس جمع رکھتے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ عظیم ذات سب کچھ گوارا کر سکتی ہے مگر خیانت کسی حال میں انہیں گوارا نہیں ہے۔

آج ہماری دنیا اخلاقی زوال سے ہمکنار ہے کیونکہ اوصافِ حمیدہ جو انسانیت کا زیور ہے اس کی بقا اور فروغ ان کے ایجنڈا میں ہے ہی نہیں جب کہ صلاح و فلاح کا تعلق انھیں مذکورہ اوصاف سے ہے۔

رسولِ اعظم ﷺ نے ظاہر سے زیادہ باطن کے سدھارنے پر زور دیا کیونکہ ظاہری افعال باطنی ارادوں کے تابع ہوتے ہیں، اگر باطن گندہ ہو تو ظاہر سے خیر کی توقع فضول ہے اور اگر باطن پاکیزہ ہو تو ظاہر خود بخود درست ہو جائے گا۔

سرورِ دو عالم ﷺ جس طرح تمام اخلاقِ حسنہ کے جامع تھے، اسی طرح تمام انسانوں کو اس سے متصف ہونے کے داعی بھی تھے۔ کیونکہ کامیابی کا راز اسی میں پنہاں ہے۔

سورۂ آل عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت سے پہلے یہود کی بداعمالیاں مذکور ہیں کیونکہ نزولِ قرآن کے وقت یہود ہی واحد قوم تھی جس نے سب سے پہلے انبیا کی تعلیمات میں تحریف کی اور صفات رذیلہ کو بڑھاوا دینے کا کام کیا، انہوں نے خود بھی خدا کے قوانین سے انحراف کیا اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے کے لیے اکسایا۔

امام رازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اللہ تعالی نے سابقہ آیات میں اہل کتاب کی دو باتوں پر مزمت کی ہے اس میں سے ایک تو اس نے ان کے کفر کی مذمت کی۔ اس کے بعد اس بات پر ان کی مذمت کی کہ وہ دوسروں کو کفر میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں پھر جب مسلمانوں سے خطاب کیا تو پہلے انہیں تقویٰ اور ایمان کا حکم دیا، اس کے بعد انہیں ہدایت کی کہ وہ دوسروں کو ایمان واطاعت کے دائرے میں لانے کی کوشش کریں۔

رسولِ پاک نے اپنے ماننے والوں کو اپنے رنگ میں ایسا رنگ دیا تھا کہ وہ صداقت، امانت، صبر وضبط، حلم، شکر، تسلیم ورضا کے متضاد صفات سے خود بیزار رہتے اور دوسروں میں بھی کذب، خیانت، جزع، کبر وغرور اور نفسانی مفاسد کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انہیں بار بار دعوت دینے کا تاکیدی حکم دیا گیا اور خود نبی اکرم ﷺ کو خدا نے حکم دیا﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾یعنی اے محبوب آپ لوگوں کو حکمت ودانائی اور پر تاثیر وعظ سے اپنے رب کی راہ کی طرف بلائیے۔

الغرض! مکارم اخلاق ہی وہ عظیم شرف ہے جو انسان کو دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک وبرتاؤ کے ذریعے عظمت اور بلندیِ مرتبت سے سرفراز کرتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

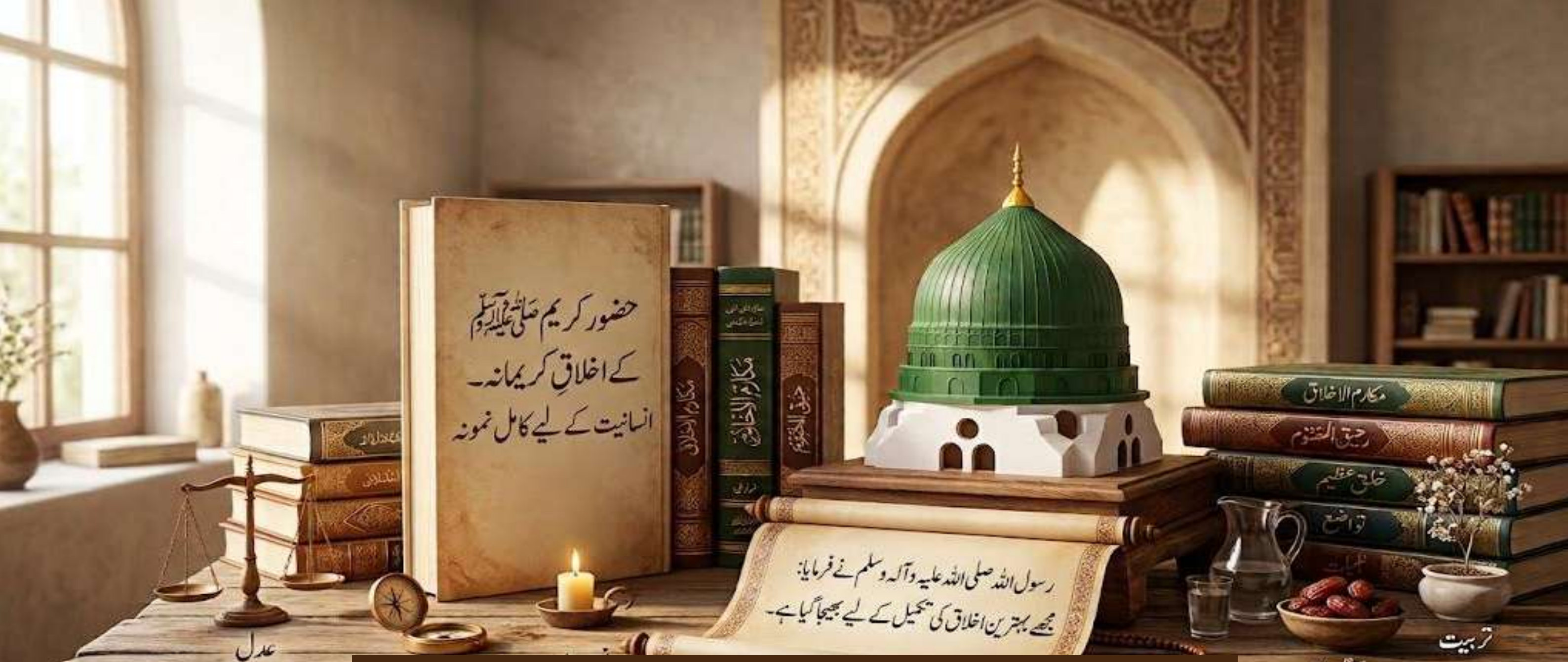

مولانا غیاث الدین احمد عارفؔ مصباحی نظامی، مدرسہ عربیہ سعید العلوم، مہراج گنج

انسانی تاریخ میں جتنے بھی اِلہامی مذاہب اور مصلحین آئے، اُن سب نے معاشرے کی اصلاح اور انسان کو بہتر بنانے کے لیے اصول وضوابط پیش کیے۔ تاہم، دینِ اسلام نے اَخلاقیات کو محض چند ظاہری آداب یا معاشرتی روایات تک محدود نہیں رکھا، بل کہ اسے ایمان کی روح، بندگی کا مغز اور دین کا بنیادی ستون قرار دیا۔ حُسنِ

اخلاق، انسانی زندگی کا وہ حَسین ترین جوہر ہے جو انسان کو ظاہری خوبصورتی کے ساتھ باطنی کمال بھی عطا کرتا ہے۔ ایک صالح، پُرامن اور متوازن معاشرے کی تشکیل حُسنِ اَخلاق کے بغیر ناگزیر ہے۔

حُسنِ اَخلاق کی لغوی تعریف:

عربی زبان میں "خُلق" انسان کی باطنی حالت، عادت، طبعی سرشت اور باطنی ہیئت کو کہتے ہیں۔

حُسنِ اَخلاق کا اصطلاحی مفہوم:

شریعتِ اسلامی کی اصطلاح میں حُسنِ اَخلاق "انسان کی ایسی باطنی حالت یا کیفیت کا نام ہے جس کے تحت وہ بغیر کسی تردُّد، تاُمّل اور سوچ بچار کے ایسے افعال سرانجام دے جو عقل اور شریعت کی رو سے پسندیدہ اور اچھے ہوں۔

حُسنِ اَخلاق کے تقاضے

عملی زندگی میں حُسنِ اَخلاق کے کچھ مخصوص تقاضے ہیں۔ مثلاً: مخلوقِ خدا کے ساتھ خندہ پیشانی، تواضع اور نرمی سے پیش آنا۔ عُسر ویُسر اور تکلیف وراحت کے ہر حال میں اعتدال اور صبر وبرداشت کا مظاہرہ کرنا۔ گفتار اور

کردار میں سچائی، امانت داری، اور عہد کی پاسداری کرنا۔ تکبر، غرور، حسد اور کینہ پروری سے کلی اجتناب کرنا۔انتقام کی طاقت ہونے کے باوجود عفو و درگزر اور فیاضی سے کام لینا،کمزوروں اور محتاجوں کی اعانت کرنا وغیرہ۔

دینِ اسلام میں حُسنِ اَخلاق کی اہمیت

حُسنِ اَخلاق دینِ اسلام کی روح،اس کی تعلیمات کاروشن ترین باب اور شریعت کا حاصل ہے۔یہ نہ صرف دنیامیں ایک پرامن،مہذب،اور باہمی محبت پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کی ضمانت دیتاہے،بل کہ آخرت میں رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔ایک سچا مسلمان وہی ہے جس کا دامن عقیدہ وعبادات کے ساتھ ساتھ حُسنِ اَخلاق کے حسین پھولوں سے بھی آراستہ ہو۔اسلامی تعلیمات میں حُسنِ اَخلاق کو جو مقام حاصل ہے،وہ کسی اور نظامِ فکر میں نظر نہیں آتا۔

مقصدِ بعثتِ نبوی تکمیلِ مکارمِ اخلاق

قرآن و سنت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق دین کا بنیادی مقصد اور مومن کی سب سے بڑی شناخت ہیں۔چناں چہ رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری اور بعثت کا سب سے بڑا مقصد اخلاقی اقدار کو بلندی عطا کرنا اور ان کی تکمیل کرنا ہے۔جیسا کہ خود آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخلَاقِ﴾(1)

ترجمہ: مجھے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

دینِ اسلام میں ایمان اور اخلاق لازم وملزوم ہیں۔اور کامل مومن وہ ہے جس کا اخلاق بہترین ہو۔نبی کریم ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ کون سا مومن،کامل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿أَكمَلُ المؤمنينَ إيمانًا أحسَنُهم خُلُقًا﴾(2)

ترجمہ: وہ مومن ایمان کے اعتبار سے زیادہ کامل ہے جو تم میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہے۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:﴿مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلَ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ﴾(3)

ترجمہ: قیامت کے دن میزان میں بندے کے اچھے اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔

قیامت کے ہولناک دن میں ہر شخص اس بات کا متمنی ہوگا کہ اسے انبیا اور مقربین کا قرب حاصل ہو۔ اس فضیلت کو حاصل کرنے کا نسخۂ کیمیا بتاتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے خوشخبری سنائی کہ روزِ محشر آپ کے سب سے زیادہ قریب اور محبوب وہی لوگ ہوں گے جو دنیا میں بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا﴾(4)

ترجمہ: تم میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن میری مجلس میں سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھے ہوں گے۔

حُسنِ اَخلاق کا درجہ اتنا بلند ہے کہ ایک عام انسان اپنے اچھے اخلاق کے ذریعے دن بھر کے روزے دار اور رات بھر کے شب بیدار عابد کا اجر حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ﴾(5)

ترجمہ: بندہ اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے دن کو روزہ رکھنے والے اور رات کو قیام کرنے والے (عبادت گزار) کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

قرآنِ مجید کی روشنی میں آپ ﷺ کے اخلاقِ عظیم کا تذکرہ

سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اخلاقِ حسنہ اور صفاتِ حمیدہ کی رفعتوں کی وہ معراج ہے جہاں تمام محاسنِ اخلاق اپنے کمال کو پہنچ گئے۔ آپ کے حُسنِ خُلق کی دل آویزی اور کشش کا ہی اعجاز تھا کہ پتھر سے سخت دل بھی آپ کے گرویدہ ہو گئے اور لوگوں نے آپ کی محبت کی خاطر دَورِ جاہلیت کے تمام فرسودہ تعلقات کو خیر باد کہہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ربِ ذوالجلال نے آپ کی ایسی شان دار مدح و توصیف فرمائی جو کسی اور نبی کے حصے میں نہ آئی؛ ارشادِ رب العزت ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾(6)

اور بے شک آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

یہ آیتِ مبارکہ آپ ﷺ کے اخلاقِ عظیم پر سب سے بڑی اور صریح سند ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے "عَلٰی" کا حرفِ استعلاء استعمال فرمایا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ آپ ﷺ اخلاق کے بلند ترین مینار اور ارفع ترین مقام پر فائز ہیں، جہاں تک کسی عام انسان کی عقل اور رسائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چناں چہ اُمُّ المؤمنین سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے برجستہ فرمایا کہ: "آپ کا اخلاق پورا قرآن تھا"۔ (7)

یعنی جو کچھ قرآنِ مجید میں نظریاتی طور پر بیان کیا گیا ہے، آپ ﷺ کی عملی زندگی اس کا مجسم اور زندہ عکس ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ شفقت، رافت اور رحمت کے مظاہر سے بھری پڑی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، اور آپ کے اخلاق کو نرمی اور لچک سے آراستہ فرمایا ہے، تاکہ آپ کی سیرت تمام انسانوں کے ساتھ حسنِ معاملہ میں مومنین کے لیے بہترین نمونہ بنی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (8)

ترجمہ: بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے، مسلمانوں پر کمال مہربان ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کی اپنی امت سے بے پناہ محبت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یعنی امت کی کوئی بھی تکلیف یا مشقت آپ ﷺ پر ایسی گراں گزرتی تھی کہ آپ ہر لمحہ اس بات کے لیے بے چین اور حریص رہتے تھے کہ انسان گمراہی سے بچ کر ہدایت کی راہ پر آ جائیں۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (9)

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

یہ آیت آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کے دائرۂ کار کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے پوری کائنات تک پھیلا دیتی ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی صرف مسلمانوں یا انسانوں کے لیے نہیں، بل کہ تمام جہانوں (جن وانس اور کائنات کی ہر مخلوق) کے لیے سراپا رحمت ہے۔

ارشاد پروردگار ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾(10)

ترجمہ: تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب! تم ان کے لئے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے۔

یہ آیت غزوۂ احد کے پس منظر میں نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ شفقت کا معاملہ کریں۔ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اے نبی! یہ اللہ کی خاص رحمت ہے جس کی وجہ سے آپ کا مزاج انتہائی نرم اور شیریں ہے۔ اگر آپ تند خو، ترش مزاج یا سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے منتشر ہو جاتے۔ نیز اس سے یہ اخلاقی اصول ثابت ہوتا ہے کہ دعوتِ دین، اصلاحِ معاشرہ اور قیادت کے فرائض انجام دینے کے لیے سختی نہیں بل کہ نرمی، عفو، اور دل جیتنے والا انداز ناگزیر ہے۔

اسی طرح **سورۃ الضحیٰ کی آیت ۶ تا ۱۱** میں یتیم کی خبر گیری کرنے، سائل کو نہ جھڑکنے، اور اللہ کی نعمتوں کا برملا اظہار کرنے کا حکم دے کر عملی اخلاق کی بنیادیں مضبوط کی گئی ہیں۔ اور **سورۃ الم نشرح کی آیت ۱ تا ۳** کے ذریعے آپ ﷺ کے قلبِ مبارک کو وسعت دینے، مشکلات کے بوجھ کو ہلکا کرنے اور بلند ذکر کے ذریعے روحانی و اخلاقی مدارج کی اس معراج کو بیان کیا گیا ہے جو تنگیِ قلب اور بدخلقی کی ہر جڑ کو کاٹ دیتی ہے۔

آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام عالَم کے لیے عملی نمونہ

خالقِ کون و مکاں نے تاجدارِ مدینہ، رحمتِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو نوعِ انسانی کے لیے ایک ایسا ہمہ گیر، جامع اور لافانی نمونہ بنایا ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر تا ابد ہر دور کے انسان کے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ یہ ربِ کائنات کا حتمی اعلانِ رحمت ہے کہ انسانیت جب کبھی تاریکیوں کے بھنور میں گھرے، تو اسے سیرت

محمدی کے چشمے سے ہی حیات بخش ضیا اور اطمینان نصیب ہو۔ آپ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ زندگی کے ہر رنگ، ہر موڑ اور ہر کیفیت پر اس اعتدال اور توازن کے ساتھ اتری ہے کہ دنیا کا ہر فرد، اپنے حالات کے کسی بھی کٹھن موڑ پر کھڑا ہو، اس میں اپنے لیے براہِ راست ہدایت پاتا ہے۔ خواہ کوئی انسان فقر و درویشی کی چادر اوڑھے زندگی کی سختیاں جھیل رہا ہو، یا تختِ شاہی اور مسندِ اقتدار پر براجمان ہو کر سلطنتوں کے فیصلے کر رہا ہو، چاہے کوئی میدانِ کارزار کی دہکتی ہوئی بھٹیوں میں شجاعت کے جوہر بکھیر رہا ہو، یا صلح و مفاہمت کی میز پر بیٹھ کر حکمت و تدبر کے نقوش ثبت کر رہا ہو، چاہے وہ گھر کی چاردیواری میں ایک شفیق شوہر اور مہربان باپ کا کردار ادا کر رہا ہو، یا معاشرے کی بھیڑ میں ایک عام فرد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہو۔ تاجدارِ کونین ﷺ کا اسوۂ حسنہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر زاویے میں ایک ایسا روشن باب ہے، جو تاریک ترین راستوں کے لیے منور قندیل اور ہر پیچیدہ مشکل کے لیے شافی و حتمی حل فراہم کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت جَلَّ شانہٗ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(11)

ترجمہ: بیشک تمھیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔

آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کے نمایاں گوشے

حِلم و بردباری (برداشت اور تحمل): ایک ایسی صفت یا ملکہ ہے جو انسان کے نفس کو ضبط اور قابو میں رکھتی ہے، اس بلند ترین مقام تک وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو اپنے غصے کی لگام کھینچنے پر پوری طرح قادر ہو۔ حِلم کا مقام اس لیے بہت بلند ہے کہ یہ اللہ رب العزت کی صفات میں سے ہے، جو تمام صفاتِ کمال کا مالک ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ﴾(12)

ترجمہ: اچھی بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف دی جائے، اور اللہ بے نیاز اور حِلم والا ہے۔

نیز یہ تمام انبیا علیہم السلام کی صفات میں سے بھی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ﴾(13)

ترجمہ: بے شک ابراہیم بڑے آہ وزاری کرنے والے، حلم والے تھے۔

احادیثِ مبارکہ میں حلم کی ترغیب: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حلم کی طرف رہنمائی فرمائی اور اس کی ترغیب دی ہے، آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنْفِذَهُ، دَعَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى رُؤُوسِ الخَلَائِقِ يَوْمَ القِيَامَةِ، حَتَّى يُخَيِّرَ مِنَ الحُورِ العِينِ مَا شَاءَ﴾(14)

ترجمہ: جو شخص اپنا غصہ پی جائے درآں حالیکہ وہ اسے نافذ کرنے کی طاقت رکھتا ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا یہاں تک کہ اسے اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس حورِ عین کو چاہے منتخب کر لے۔

اسی طرح جب ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! مجھے کوئی وصیت فرمایئے، تو آپ ﷺ نے اسے حلم کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿لَا تَغْضَبْ﴾ (غصہ نہ کرو) اس شخص نے بار بار یہی بات دہرائی، تو آپ ﷺ نے ہر بار یہی فرمایا: ﴿لَا تَغْضَبْ﴾ (غصہ نہ کرو)۔(15)

حلم و صبر کے عملی نمونے: آپ ﷺ نے ہمیں قولاً تو حلم کی دعوت دی ہی، ساتھ ہی آپ کی سیرتِ مبارکہ ایسے بے شمار معلوم اور مشہور مواقف سے بھری پڑی ہے جو حلم کی عملی تصویر ہیں۔

جنگ اُحد میں صبر: چناں چہ جب جنگِ احد کے دن آپ ﷺ کا دندانِ مبارک شہید کیا گیا اور چہرہ زخمی ہوا، تو صحابہ کرام پر یہ صدمہ بہت گراں گزرا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! مشرکین کے خلاف بد دعا کیجیے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنِّي لَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا، وَإِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً﴾ ترجمہ: بے شک مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، بل کہ مجھے سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔(16)

اس موقع کی منظر کشی کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں کہ: گویا میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ کسی ایسے نبی کا ذکر فرما رہے ہیں جسے اس کی قوم نے مارا یہاں تک کہ لہولہان کر دیا، اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں:

﴿اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي؛ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔(17)

ترجمہ: اے اللہ! میری قوم کو معاف کر دے، کیوں کہ وہ نہیں جانتے۔

غور کیجیے: اس قول میں کتنی جامع فضیلت، احسان کے درجات، حُسنِ خُلق، نفس کی شرافت اور غایت درجے کا صبر و حِلم پایا جاتا ہے! آپ ﷺ اس پر اکتفا نہیں فرما رہے کہ ان سے خاموش رہیں، بل کہ آپ نے انہیں معاف بھی کر دیا، پھر ان پر شفقت فرمائی، ان پر رحم کیا، ان کے لیے دعائیں اور سفارش کیں اور فرمایا: اے اللہ معاف فرما دے، ہدایت عطا کر دے۔ پھر شفقت و رحمت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: یہ میری قوم کے افراد ہیں۔ پھر ان کے جہل کا عذر پیش کرتے ہوئے فرمایا: کیوں کہ وہ نہیں جانتے۔ سبحان اللہ! ایسی حِلم و بُردباری کی مثال سوائے ذات مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اور کہاں مِل سکتی ہے؟۔

طائف والوں کے ظلم پر صبر: طائف کے سفر کا وہ دن بھی یاد کیجیے جب آپ اُن کی طرف دعوت اسلام کے لیے تشریف لے گئے، تو انہوں نے آپ کو برا بھلا کہا، سخت تکلیف دی، اپنے نادان بچوں کو آپ پر مسلط کر دیا، آپ پر پتھر برسائے، آپ کا مذاق اڑایا اور آپ کو دھتکار دیا۔ تو بتائیے اس وقت آپ ﷺ کا کیا رویہ تھا؟ کیا آپ نے ان کے خلاف بد دعا کی؟ کیا آپ نے اپنے رب سے ان پر انتقام کا مطالبہ کیا؟ کیا آپ نے اپنے غصے میں آکر انتقام لیا؟ کیا آپ اپنی رسالت کی ادائیگی اور دعوت سے منہ موڑ گئے؟ ہرگز نہیں! میرے ماں باپ اور میری جان آپ پر قربان، ایسا ہرگز نہیں ہوا، بل کہ آپ نے صبر، حِلم اور اپنی قوم کی نجات کی حرص کا مظاہرہ کیا۔

اور ادھر آپ کے پروردگار نے آپ کی طرف حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا، ان کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ بھی تھا، تاکہ نبی کریم ﷺ انہیں جو چاہیں حکم دیں۔ لیکن آپ نے اپنی قوم کے لیے دعا اور ان کی ہدایت کی امید کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کیا۔

عقبہ کا سخت ترین دن: آپ ﷺ کا حِلم کتنا عظیم ہے اور آپ کے صبر و بردباری کے کیا حَسین انداز ہیں؟ آیئے ہم ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سنیں کہ وہ ہمیں یہ واقعہ کس طرح سناتی ہیں، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپ پر اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن آیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”تمہاری قوم کی طرف سے مجھے جو مصائب پہنچے وہ پہنچے، اور ان میں سب سے سخت دن عقبہ کا دن تھا جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یا لیل بن عبد کلال کے سامنے پیش کیا، تو اس نے میری بات قبول نہ کی، پس میں غم و فکر میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا، مجھے ہوش تب آیا جب میں 'قرن الثعالب' کے مقام پر پہنچا، میں نے اپنا سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بادل نے مجھے سایہ کیا ہوا ہے، میں نے دیکھا تو اس میں جبریل علیہ السلام تھے، انہوں نے مجھے پکار کر کہا: بے شک اللہ نے آپ کی قوم کی بات سن لی ہے جو انہوں نے آپ کو کہی اور جو جواب دیا، اور اللہ نے آپ کی طرف پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تا کہ آپ ان کے بارے میں جو چاہیں حکم دیں۔ چناں چہ پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے پکارا، سلام کیا، اور کہا: اے محمد ﷺ! جو آپ چاہیں (حکم دیں)، اگر آپ کہیں تو میں ان پر دونوں پہاڑ (اخشبین کو) الٹ دوں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بل کہ مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے“۔(18)

جب ایک اعرابی نے چادر کھینچی: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا اور آپ نے نجران کی ایک موٹے حاشیے والی چادر اوڑھی ہوئی تھی، اتنے میں ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر کو اتنی زور سے کھینچا کہ رسول اللہ ﷺ کی گردن مبارک پر اس سخت کھینچنے کی وجہ سے چادر کے کنارے کا نشان پڑ گیا تھا۔ پھر اس اعرابی نے کہا: اے محمد ﷺ! اللہ کے اس مال میں سے مجھے بھی کچھ دینے کا حکم دیجیے جو آپ کے پاس ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا، مسکرائے اور اسے کچھ عطا کرنے کا حکم دیا۔ (19)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحم دلی اور شفقت

اللہ تعالیٰ نے اس کائناتِ ارضی پر اپنے محبوب خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو پوری دنیا کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ کا وجودِ مسعود پوری انسانیت، کمزوروں، بچوں، عورتوں، بے کسوں، بے بسوں حیوانات اور یہاں تک کہ اپنے شدید ترین دشمنوں کے لیے بھی رحمت اور شفقت کا ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کی

مثال پوری تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی۔ احادیثِ مبارکہ میں آپ ﷺ کی اس صفتِ رحمت کو انتہائی خوبصورت انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔﴾(20)

ترجمہ: رحم کرنے والوں پر رحمان بھی رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

خواتین اور اہل خانہ کے ساتھ حسنِ سلوک

معاشرت کی درستگی گھر سے شروع ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنے گھر والوں اور خواتین کے ساتھ انتہائی نرم خو، خوش مزاج اور مددگار تھے۔ مختلف احادیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ اپنے جوتے خود گانٹھتے، اپنے کپڑے میں پیوند لگاتے، اپنی بکری کا دودھ دوہتے، اپنے گھر والوں کا اور اپنے کام خود کرتے، گھر میں جھاڑو دیتے، اونٹ کو باندھتے، اپنی سواری کو خود چارہ ڈالتے، خادم کے ساتھ کھانا کھاتے، اس کے ساتھ آٹا گوندھتے اور بازار سے اپنا سامان خود اٹھا کر لاتے۔

چناں چہ کسی موقع پر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

﴿كَانَ يَكُونُ فِي مِهْنَةِ أَهْلِهِ، تَعْنِي خِدْمَةَ أَهْلِهِ، فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ۔﴾(21)

ترجمہ: آپ نے بتلایا کہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر کے کام کاج یعنی اپنے گھر والیوں کی خدمت کیا کرتے تھے اور جب نماز کا وقت ہوتا تو فوراً (کام کاج چھوڑ کر) نماز کے لیے چلے جاتے تھے۔

آپ ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع اور مختلف مواقع پر بار بار امت کو خواتین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی اور ارشاد فرمایا: ﴿اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ﴾(22)

ترجمہ: عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے کی میری وصیت قبول کرو۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿مَا رَأَيْتُ أَحَدًا كَانَ أَرْحَمَ بِالْعِيَالِ، مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ﴾(23)

ترجمہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی کو بھی عیال (بچوں اور اہل و عیال) پر رحم کرنے والا نہیں دیکھا۔

صحابہ کرام کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نرم رویہ

آپ ﷺ ہمیشہ اپنے صحابہ سے نرم روی اور خوش گفتاری کا معاملہ فرماتے، ان کے ساتھ مزاح کرتے، ان سے گھلتے ملتے، ان سے بات چیت کرتے، ان کے بچوں سے پیار کرتے اور انہیں اپنی گود میں بٹھاتے۔ آپ آزاد، غلام، لونڈی اور مسکین سب کی دعوت قبول کرتے، مدینہ کے آخری کنارے تک بیماروں کی عیادت کو جاتے، اور معذرت کرنے والے کا عذر قبول کرتے تھے۔ چند احادیث کریمہ میں ان صفات عظیمہ کی جھلک ملاحظہ کریں:۔

ہر موقع پر صحابہ کے ساتھ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ خطبہ دے رہے تھے تو انہوں نے فرمایا: سنو! اللہ کی قسم، ہم نے سفر اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کی صحبت اختیار کی، آپ ہمارے بیماروں کی عیادت کرتے تھے، ہمارے جنازوں کے ساتھ جاتے تھے، ہمارے ساتھ صبح کرتے تھے، اور تھوڑی یا زیادہ ہر چیز میں ہماری مواسات کرتے تھے۔ (24)

اپنی ذات کے لیے بدلہ نہیں لیا: اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ﴿مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه و آله وسلم بَيۡنَ أَمۡرَينِ إِلَّا اختَارَ أَيۡسَرَهُمَا مَا لَم يَكُن إِثمًا﴾ (25)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو کاموں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ہمیشہ آسان ترین کام کا انتخاب فرماتے جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو۔ اور اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ اس سے سب سے زیادہ دور رہنے والے ہوتے، اور رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی حرمت پامال کی جائے۔

سوائے جہاد کے کسی کو نہیں مارا: اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، نہ کسی عورت کو، نہ کسی غلام کو، مگر یہ کہ آپ اللہ کے راستے میں جہاد کر رہے

ہوں۔ اور جب بھی آپ کو نقصان پہنچایا گیا تو کبھی (ایسا نہیں ہوا کہ) آپ نے اس سے انتقام لیا ہو مگر یہ کہ کوئی اللہ کی محرمات میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا تو آپ اللہ عزوجل کی خاطر انتقام لے لیتے۔(26)

کسی کو پاس آنے سے نہیں روکا: حضرت جریر بن عبد اللہ نے کہا: "جب سے میں مسلمان ہوا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے مجھے کبھی اپنے پاس آنے سے نہیں روکا، اور جب بھی آپ نے مجھے دیکھا مسکرائے۔(27)

سب کو عزت عطا فرمائی: حضرت قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب **"الشفا"** میں حضور اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ، تواضع، اور مجالس کے آداب بیان کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ پاکیزہ روایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں: کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے کان میں منہ لے جا کر سرگوشی کرتا تو آپ ﷺ اپنا سر اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹاتے جب تک کہ وہ شخص خود اپنا سر نہ ہٹا لے۔ اور جب کوئی شخص آپ کا ہاتھ پکڑتا تو آپ اس وقت تک اپنا ہاتھ نہیں کھینچتے جب تک کہ وہ شخص خود اپنا ہاتھ نہ چھوڑ دے۔ اور آپ کو کبھی اپنے کسی بیٹھنے والے ساتھی کے سامنے گھٹنے آگے بڑھائے ہوئے نہیں دیکھا گیا، آپ ملنے والے کو خود سلام میں پہل کرتے، اور مصافحہ میں اپنے صحابہ سے پہل کرتے تھے۔ آپ کو کبھی اپنے ساتھیوں کے درمیان پاؤں پھیلائے ہوئے نہیں دیکھا گیا جس سے کسی کو تنگی ہو۔ جو آپ کے پاس آتا آپ اس کی عزت کرتے اور کبھی اس کے لیے اپنا کپڑا بچھا دیتے، اور جو تکیہ آپ کے نیچے ہوتا اسے اس کے لیے ترجیح دیتے اور اسے اس پر بیٹھنے کا اصرار کرتے اگرچہ وہ انکار کرتا۔ آپ اپنے صحابہ کی کنیت رکھتے اور ان کے پیارے ناموں سے انہیں پکارتے تاکہ ان کی عزت افزائی ہو۔ آپ کسی کی بات اس وقت تک نہیں کاٹتے تھے جب تک کہ وہ اپنی بات ختم نہ کر لے یا اٹھ نہ جائے۔

تربیت کا حسین انداز: حضرت معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں تھا کہ اتنے میں قوم کے ایک شخص نے چھینک دی، تو میں نے کہا: ﴿**یرحمك الله**﴾ تو لوگوں نے مجھے گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ میں نے کہا: ﴿**وا ثكل أمّاه! ما لهم ينظرون إليّ**﴾ (میری ماں مجھے روئے، انہیں کیا ہے جو مجھے دیکھ رہے ہیں؟)، انہوں نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں تو میں خاموش ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نماز سے سلام پھیرا تو مجھے بلایا

(میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں)، میں نے آپ سے بہتر سکھانے والا نہ آپ سے پہلے دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔ اللہ کی قسم! نہ تو آپ نے مجھے مارا، نہ گالی دی اور نہ ہی مجھے ڈانٹا، بلکہ آپ نے فرمایا: ﴿إِنَّ صَلَاتَكَ هَذِهِ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ﴾ بلاشبہ اس نماز میں لوگوں کی بات چیت کا کوئی عمل درست نہیں، یہ تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کی تلاوت کے لیے ہے۔ (28)

جب ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی مسجد میں داخل ہوا جب کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھی، پھر اس نے مسجد کے ایک گوشے میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف (اسے مارنے کے لیے) لپکے، تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں روکا اور فرمایا: ﴿إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ، وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ، عَلِّمُوا وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا﴾ تمہیں آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، تنگی پیدا کرنے والا بنا کر نہیں، لوگوں کو سکھاؤ، آسانی پیدا کرو اور سختی نہ کرو)، اس دیہاتی نے (آپ کی یہ شفقت دیکھ کر) کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نے مجھے ڈانٹا تک نہیں اور فرمایا: ﴿إِنَّ هَذَا الْمَسْجِدَ لَا يُبَالُ فِيهِ، إِنَّمَا بُنِيَ لِذِكْرِ اللَّهِ تَعَالَى وَلِلصَّلَاةِ﴾ یہ مسجد ہے، اس میں پیشاب کرنا درست نہیں، یہ تو صرف اللہ کے ذکر اور نماز کے لیے بنائی گئی ہے۔ (29)

بچوں اور خادموں کے ساتھ شفقت و محبت

نبی کریم ﷺ بچوں کے ساتھ اس قدر محبت اور شفقت فرماتے کہ آپ کی ذاتِ مبارکہ بزرگوں کے لیے رہبر اور بچوں کے لیے ایک شفیق باپ جیسی تھی۔ دورِ جاہلیت میں بچوں (خصوصاً بچیوں) کے ساتھ جو حقارت آمیز سلوک ہوتا تھا، آپ نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور بچوں کو معاشرے کا معزز حصہ بنایا۔ چناں چہ آپ ﷺ راستے سے گزرتے ہوئے بچوں کو سلام کرتے، ان کے ساتھ کھیلتے اور انہیں اپنے کندھوں پر سوار کرتے۔

خادم خاص پر شفقت:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے ساتھ کوئی خادم نہیں تھا۔ اس لیے ابو طلحہ (جو میرے سوتیلے باپ تھے) میرا ہاتھ پکڑ کر آپ ﷺ کی خدمت میں لے

گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! انس سمجھ دار بچہ ہے۔ یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کی سفر اور حضر میں خدمت کی، آپ ﷺ نے مجھ سے کبھی کسی کام کے بارے میں جسے میں نے کر دیا ہو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام تم نے اس طرح کیوں کیا، اسی طرح کسی ایسے کام کے متعلق جسے میں نہ کر سکا ہوں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کام اس طرح کیوں نہیں کیا۔(30)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک دن آپ ﷺ نے مجھے کسی کام کے لیے بھیجا تو میں نے کہا: 'اللہ کی قسم! میں نہیں جاؤں گا'، حالاں کہ میرے دل میں تھا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق جاؤں گا۔ تو میں بچوں کے پاس نکلا جو بازار میں کھیل رہے تھے، اچانک رسول اللہ ﷺ نے پیچھے سے میری گُدّی پکڑ لی، تو میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے، آپ نے فرمایا: ﴿يَا اُنَيْسُ! اِذْهَبْ حَيْثُ أَمَرْتُكَ﴾

ترجمہ: اے انس! جہاں میں نے تمہیں بھیجا ہے وہاں چلے جاؤ، تو میں نے عرض کیا: جی ہاں، میں جاتا ہوں اے اللہ کے رسول ﷺ! (31)

کمسن بچے کی چڑیا: بچوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لینا اور ان کے دلوں کو خوش کرنا آپ ﷺ کی سنتِ مبارکہ تھی۔ ابو عمیر (جو کمسن بچے تھے اور ان کے پاس ایک چھوٹی سی چڑیا تھی جسے 'نغیر' کہا جاتا تھا) اس کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حُسنِ اَخلاق میں سب لوگوں سے بڑھ کر تھے، میرا ایک بھائی ابو عمیر نامی تھا۔ بیان کیا کہ میرا خیال ہے کہ بچہ کا دودھ چھوٹ چکا تھا۔ نبی کریم ﷺ جب تشریف لاتے تو اس سے (مزاحاً، خوش طبعی) فرماتے اور کہتے: ﴿يا أبا عمير ما فعل النغير؟﴾(32)

آپ ﷺ کے اس اندازِ کریمانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچوں کے جذبات کا کتنا احترام کرتے تھے۔

بیواؤں اور مسکینوں پر شفقت: نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: بیواؤں اور مسکینوں کے لیے کوشش کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو دن میں روزے رکھتا ہے اور رات کو عبادت کرتا ہے۔(33)

بے زبان جانوروں پر شفقت: مغربی دنیا نے حقوقِ حیوانات کا شور آج اٹھایا ہے، لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بے زبان جانوروں کے ساتھ جو شفقت کا برتاؤ سکھایا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی رحمت کائنات کے ذرے ذرے کے لیے تھی۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے، جہاں ایک اونٹ موجود تھا جو آپ کو دیکھتے ہی بلبلانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے اس کے قریب جا کر اس کی کوہان پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو وہ پر سکون ہو گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ اس کا مالک کون ہے؟ جب نوجوان سامنے آیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿أَفَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ فِي هَذِهِ الْبَهِيمَةِ الَّتِي مَلَّكَكَ اللّٰهُ إِيَّاهَا فَإِنَّهُ شَكَى إِلَيَّ أَنَّكَ تُجِيعُهُ وَتُدْئِبُهُ﴾(34)

کیا تم اس بے زبان جانور کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے جس کا مالک تمہیں اللہ نے بنایا ہے؟ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور تھکا ڈالتے ہو۔

ذبح کرنے میں بھی احسان کا حکم: آپ ﷺ نے جانوروں کو ذبح کرتے وقت بھی ان پر تخفیف اور احسان کرنے کا حکم دیا تا کہ انہیں کم سے کم تکلیف ہو۔ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، فَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ﴾(35)

بے شک اللہ نے ہر چیز پر احسان (نیکی) کو لازم کیا ہے، لہٰذا جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے کرو، اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے کرو، اور تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی چھری تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچائے۔

آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا تواضع وانکسار

(۱) اپنے اونچے منصب اور بلند مقام کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تکبر سے سب سے زیادہ دور اور تواضع میں سب سے آگے تھے۔ آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کو اختیار دیا گیا کہ آپ ایک نبی بادشاہ بنیں یا ایک بندہ نبی، تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بندہ نبی بننا پسند کیا۔ اس پر حضرت اسرافیل علیہ السلام نے آپ

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کہا کہ: اللہ نے آپ کی اس تواضع کی وجہ سے آپ کو یہ شرف عطا کیا ہے کہ آپ قیامت کے دن اولادِ آدم کے سردار ہوں گے، زمین سے سب سے پہلے اٹھنے والے ہوں گے، اور پہلے شفاعت کرنے والے ہوں گے۔(36)

(۲) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس داخل ہوا تو آپ چٹائی کے ریشوں پر ٹیک لگائے ہوئے تھے جس کا نشان آپ کے پہلو مبارک پر پڑ گیا تھا۔ میں نے گھر کے اندر نظر دوڑائی، تو اللہ کی قسم! وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو آنکھ کو بھائے سوائے تین چمڑے کے ٹکڑوں اور جَو کے ایک ڈھیر کے۔ عمر کی آنکھیں چھلک آئیں، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: تمہیں کس چیز نے رلایا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں، اور ادھر کسریٰ اور قیصر اس عیش و آرام میں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کی اچھی چیزیں ان کی دنیا ہی کی زندگی میں جلدی دے دی گئیں، کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ دنیا ان کے لیے ہو اور آخرت ہمارے لیے ہو؟۔(37)

(۳) حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہمارے پاس ایک عصا کا سہارا لیے ہوئے تشریف لائے تو ہم سب کھڑے ہو گئے، آپ نے فرمایا: عجمیوں کی طرح ایک دوسرے کے احترام میں کھڑے نہ ہوا کرو۔(38)

فائدہ: اس قول مبارک میں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حد درجہ تواضع اور انکسار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ساری مخلوق پر لازم ہے کہ آپ کا انتہائی احترام بجالائے، اسی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی مضمر ہے۔ سچ ہے: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ فقہائے اسلام کی وضاحت کے مطابق اپنے سے بڑے کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا منع نہیں ہے البتہ اگر کوئی شخص ازراہ کبر و غرور یہ خواہش رکھتا ہے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں اور اس کے سامنے ہاتھ باندھے حالت قیام میں رہیں تو یہ یقیناً شرع کی نظر میں سخت ناپسندیدہ عمل ہے۔

(۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: مجھے میرے مرتبے سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو نصاریٰ نے ان کے رتبے سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں، اس لیے (میرے متعلق) یہی کہا کرو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔(39)

(۵) آپ ﷺ بے انتہا تواضع اور انکساری کے مالک تھے کہ ایک عام عورت اور دنیا کی نظروں میں حقیر سمجھی جانے والی ایک لونڈی بھی آپ ﷺ سے اپنے کام کروالیا کرتی تھی اور آپ ﷺ اسے انکار نہ کرتے جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کے اخلاق فاضلہ کا یہ حال تھا کہ مدینہ کی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور اپنے کسی بھی کام کے لیے جہاں چاہتی آپ کو لے جاتی تھی۔(40)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت وصداقت

صادق وامین کا لقب: آپ ﷺ کی زندگی کا یہ وہ روشن باب ہے جس کا انکار تاریخ کا کوئی بھی منصف یا آپ کا دشمن نہیں کر سکا۔اعلانِ نبوت سے پہلے ہی مکہ کے تمام لوگ آپ کو ﴿الصادق﴾ اور ﴿الامین﴾ کے لقب سے پکارتے تھے۔چناں چہ جب آپ ﷺ نے باذنِ الٰہی باقاعدہ اپنی نبوت ورسالت کا اعلان فرمانے اور لوگوں کو توحید کی دعوت دینے کے لیے کوہِ صفا کی پہاڑی پر جمع کیا اور ان سے پوچھا:"اے قریش! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمنوں کا ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے، تو کیا تم میری بات کا یقین کروگے؟" توسب نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں، ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا ہی پایا ہے، آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا)۔(41)

امانتوں کی حفاظت: آپ ﷺ امانت داری اور وعدہ خلافی سے بچنے کے معاملے میں اس قدر محتاط تھے کہ دشمن بھی اپنی قیمتی امانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس محفوظ رکھتے تھے۔چناں چہ مکہ کے کافر جو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے اور آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے، وہی لوگ اپنی قیمتی امانتیں حفاظت کے لیے آپ ہی کے پاس رکھواتے تھے۔ہجرت کی پر خطر رات جب آپ مدینہ روانہ ہونے لگے، تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے بستر پر لٹایا اور تاکید کی کہ صبح مکہ والوں کی امانتیں ان کے اصل مالکان کے سپرد کر کے مدینہ آجانا۔(42)

معاہدہ حدیبیہ اور وعدے کی پاسداری: صلح حدیبیہ کے موقع پر ابھی معاہدے کی تحریر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ابوجندل نامی ایک نوجوان مسلمان زنجیروں میں جکڑے ہوئے، کافروں کی قید سے بھاگ کر مسلمانوں کے

پاس مدد کی فریاد لے کر آئے۔ معاہدے کی ایک شرط یہ طے ہو چکی تھی کہ مکہ سے جو شخص بھی بھاگ کر مدینہ آئے گا اسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ اگرچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے یہ منظر انتہائی دل خراش تھا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: "اے ابو جندل! صبر کرو، اللہ تمہارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا۔ ہم معاہدہ توڑ نہیں سکتے، ہم نے عہد کیا ہے اور ہم عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔(43)

وعدہ خلافی سے شدید ممانعت: آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی ہمیشہ وعدہ پورا کرنے کی تلقین فرمائی اور منافق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بتائی کہ جب وہ وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے: منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اور جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔(44)

ابوسفیان کا اعتراف حقیقت: جب ابوسفیان (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اسلام کے سخت دشمن تھے) تجارت کے لیے ملکِ شام گئے، تو روم کے بادشاہ ہرقل نے ان سے آپ ﷺ کے بارے میں چند سوالات کیے۔ جب ہرقل نے پوچھا کہ "کیا تم نے نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے کبھی اس پر جھوٹ کا الزام لگایا ہے؟" تو ابوسفیان کو مجبوراً حقیقت کا اقرار کرنا پڑا کہ "نہیں"۔ اس پر ہرقل نے کہا کہ "میں جانتا ہوں کہ جو شخص انسانوں پر جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ کے بارے میں بھی جھوٹ نہیں بول سکتا"۔(45)

ابو جہل کا اعتراف حقیقت: ابو جہل، جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، نے ایک بار آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نجی گفتگو میں کہا تھا: محمد! ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، بل کہ آپ جو لائے ہیں ہم اسے جھٹلاتے ہیں۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾(46)

پس (اے نبی!) یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بل کہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کی سخاوت اور فیاضی

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے روشن نقوش میں سے ایک درخشاں اور لازوال باب آپ کا بے مثال **جود و سخا** ہے۔ آپ کی سخاوت کا انوکھا اور بے نظیر انداز تھا جس سے نہ کبھی عرب آشنا ہوئے تھے اور نہ ہی دنیا کی کوئی اور

تہذیب اس کی نظیر پیش کر سکی۔ آپ کے جود و کرم کا عالم یہ تھا کہ: اپنی ذات کی شدید ترین ضرورت کے باوجود دوسروں کو مقدم رکھتے۔ کشادہ دستی سے خرچ کرتے اور جو کچھ راہِ خدا میں لٹاتے اسے ہمیشہ کم سمجھتے۔ آپ کثیر سے کثیر عطا فرماتے مگر اسے کبھی زیادہ تصور نہ کرتے۔ آپ کے درِ اقدس سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ واپس نہ لوٹا، اور آپ اس بات سے شدید حیا فرماتے کہ کسی مانگنے والے کو نامراد واپس فرمادیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت انہوں نے بیان کیا کہ: کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے کوئی چیز مانگی ہو اور آپ نے اس کے دینے سے انکار کیا ہو۔ (47)

(۲) ایک بار ایک اعرابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا، تو آپ نے اسے اتنی کثیر تعداد میں بکریاں عطا فرما دیں کہ جو دو پہاڑوں کے درمیان کی پوری وادی کو بھر دیں۔ وہ شخص جب واپس اپنی قوم کے پاس لوٹا تو بے ساختہ پکار اٹھا: "اے میری قوم! اسلام قبول کر لو، کیوں کہ محمد (ﷺ) ایسی عطا سے نوازتے ہیں کہ انہیں کبھی فقر و افلاس کا خوف ہی نہیں ہوتا۔ (48)

(۳) ایک اور موقع پر آپ کی خدمت میں نوے ہزار درہم لائے گئے، تو آپ نے انہیں ایک معمولی چٹائی پر رکھا، اور خود کھڑے ہو کر انہیں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تمام سائلین کی جھولیاں بھر دیں اور تمام مال کو راہِ خدا میں تقسیم کر کے ہی دم لیا۔ (49)

(۴) بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، اور رمضان کے مہینہ میں آپ کی سخاوت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے، آپ نفع بخش چلتی ہوا سے بھی زیادہ بھلائی کے ساتھ سخی ہوتے تھے۔ (50)

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ کل کے لیے کوئی چیز بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ (51)

(۶) حضرت ابن شہاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوہ حنین میں رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ کو سو اونٹ عطا کیے، پھر سو دیے، پھر سو دیے۔ صفوان نے کہا: اللہ کی قسم! آپ نے مجھے اتنا کچھ دیا حالانکہ آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ مبغوض تھے، لیکن آپ مجھے مسلسل دیتے رہے یہاں تک کہ آپ مجھے سب سے

زیادہ محبوب بن گئے۔(یعنی جب وہ کفر پر تھے تو آپ سے بغض اور دشمنی رکھتے تھے، لیکن آپ نے اپنے حُسنِ اَخلاق اور کرم سے ان کے دل کو جیت لیا۔ (52)

(۷) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک عورت ایک چادر لے کر آئیں (جو اس نے خود بنی تھی) ان خاتون نے حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ! یہ چادر میں نے خاص آپ کے اوڑھنے کے لیے بنی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے وہ چادر ان سے اس طرح لی گویا آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ اسے تہد کے طور پر پہن کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ جماعت صحابہ میں سے ایک صاحب (عبدالرحمٰن بن عوف) نے اس چادر کو چھوا اور عرض کی یارسول اللہ! یہ مجھے عنایت فرما دیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اچھا۔ جتنی دیر اللہ نے چاہا آپ مجلس میں بیٹھے رہے پھر تشریف لے گئے اور اس چادر کو لپیٹ کر ان صاحب کے پاس بھجوا دیا۔ صحابہ نے اس پر ان سے کہا تم نے اچھی بات نہیں کی کہ نبی کریم ﷺ سے وہ چادر مانگ لی۔ تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی سائل کو محروم نہیں فرماتے۔ ان صاحب نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تو صرف نبی کریم ﷺ سے یہ اس لیے مانگی ہے کہ جب میں مروں تو یہ میرا کفن ہو۔ سہل رضی اللہ عنہ نے بیان کیا چناں چہ وہ چادر اس صحابی کے کفن ہی میں استعمال ہوئی۔ (53)

سماجی اور معاشرتی زندگی میں حُسنِ اَخلاق

مہمان نوازی: مہمان نوازی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا ایک نمایاں اور درخشاں باب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نہ صرف خود اس سنتِ ابراہیمی کو زندہ رکھا بل کہ امت کو اس کے آداب، فضائل اور حقوق سے بھی بھرپور انداز میں روشناس کرایا۔ یہاں تک کہ اسے صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں رکھا، بل کہ غیر مسلم مہمانوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ سیرت مبارکہ سے چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

(۱) غار حرا میں پہلی وحی نازل ہونے کے بعد جب آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو آپ نے ام المومنین سیدتنا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ کر فرمایا کہ مجھے چادر اڑھا دیں! مجھے چادر اڑھا دیں! چنانچہ انہوں نے آپ کو چادر اڑھا دی۔ آپ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا اب کیا ہو گا؟ مجھے تو اپنی جان کا ڈر ہو گیا ہے پھر آپ

نے سارا واقعہ انہیں سنایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا ایسا ہرگز نہ ہو گا، آپ کو خوشخبری ہو، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ اللہ کی قسم! آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں، آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، آپ کمزور و ناتواں کا بوجھ خود اٹھا لیتے ہیں، جنہیں کہیں سے کچھ نہیں ملتا وہ آپ کے یہاں سے پا لیتے ہیں۔ آپ مہمان نواز ہیں اور حق کے راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔(54)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کی عزت کرتے ہوئے اس کا حق ادا کرے۔ (55)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس طرح چھری اونٹ کے کوہان کی طرف تیزی سے جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے بھلائی اس گھر میں آتی ہے جس میں مہمان کثرت سے آتے ہیں۔(56)

(۴) نبی ﷺ فرماتے ہیں: تم میں سے سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو کھانا کھلاتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے۔(57)

(۵) اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ: اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں ہے جو میزبانی نہ کرے۔(58)

(۶) مہمان نوازی ہمارے آقا ﷺ کو کیوں نہ عزیز ہو کہ یہ پرودگارِ عالم جلّ شانہٗ کو بھی محبوب ہے اور اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں اس صفت کی تعریف فرمائی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ: ایک دن ایک غریب صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات سے دریافت فرمایا، لیکن اتفاق سے اس دن ان کے گھروں میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”آج رات اس مہمان کی میزبانی کون کرے گا؟“ اس پر انصاری صحابی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور مہمان کو اپنے گھر لے گئے۔ ان کی بیوی نے بتایا کہ گھر میں صرف بچوں کا تھوڑا سا کھانا موجود ہے۔ حضرت ابو طلحہ نے فرمایا: بچوں کو سلا دو، چراغ بجھا دو اور مہمان کو کھانا کھلا دو، آج رات ہم خود بھوکے سو جائیں گے۔ صبح جب وہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے، تو رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری دی کہ: اللہ تعالیٰ تمہاری اس ضیافت اور ایثار سے بہت خوش ہوا اور یہ

آیت نازل فرمائی جس کا مفہوم ہے: ترجمہ: اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، گو خود کتنی ہی سخت تنگی میں ہوں، اور جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا، وہی اصل کامیاب ہے۔(59)

پڑوسیوں کے حقوق

(۱) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ نیک سلوک کرے، اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا احترام اور اس کی خاطر داری کرے، اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔(60)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جنت میں نہ جائے گا جس کا پڑوسی اس کے خطرات سے محفوظ نہ ہو۔(61)

(۳) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک آدمی نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! فلاں عورت دن کو روزے رکھتی ہے، رات کو قیام کرتی ہے، اور صدقہ خیرات بھی کرتی ہے، لیکن پڑوسیوں کو زبان سے اذیت پہنچاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ عورت جہنمی ہے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: فلاں عورت صرف فرض نماز ادا کرتی ہے، اور پنیر کے ٹکڑے وغیرہ صدقہ کرتی ہے، لیکن پڑوسیوں کو اذیت نہیں پہنچاتی۔ آپ نے فرمایا: یہ عورت جنتی ہے۔(62)

(۴) رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: اللہ کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو۔ اور پڑوسیوں میں سب سے بہتر وہ ہے، جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔(63)

(۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: مجھے جبریل (علیہ السلام) لگاتار پڑوسی کے ساتھ (اچھی سلوک کا) پیغام دیتے رہے یہاں تک کہ میں نے یہ خیال کیا کہ وہ اسے (پڑوسی کو) وراثت کا حق دار قرار دیں گے۔(64)

رشتہ داروں سے صلہ رحمی

اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی و حسن سلوک سے پیش آنے والوں کی قرآن کریم میں تعریف فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ﴾(65)

ترجمہ: اور اللہ نے جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے وہ اسے جوڑتے ہیں، اور وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی کا کھٹکا رکھتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا:

﴿ فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾(66)

ترجمہ: پس اے میرے نبی! آپ رشتہ دار کو اس کا حق دیجیے، اور مسکین کو، اور مسافر کو یہ ان کے لیے بہتر ہے جو اللہ تعالی کی رضامندی چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

تو آیئے! اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ کے کچھ پہلو اس حوالے سے بھی ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ "رحم" کا تعلق رحمن سے جڑا ہوا ہے پس جو کوئی اس سے اپنے آپ کو جوڑتا ہے، اللہ پاک نے فرمایا کہ میں بھی اس کو اپنے سے جوڑ لیتا ہوں اور جو کوئی اسے توڑتا ہے میں بھی اپنے آپ کو اس سے توڑ لیتا ہوں۔ (67)

(معلوم ہوا کہ جو صلہ رحمی کرتے ہوئے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے گا، ان سے حسن سلوک سے پیش آئے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سے وابستہ کر لے گا اور جو قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو خود سے دور، بے تعلق اور اپنے لطف و کرم اور احسان و اکرام سے محروم کر دے گا)۔

(۲) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں، وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں، میں ان سے اچھا سلوک کرتا ہوں، وہ مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں۔ میں ان سے تحمل اور بردباری سے پیش آتا ہوں، وہ میرے ساتھ نادانی سے پیش آتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے کہا ہے، تو گویا ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہا ہے، اور ان کے مقابلے میں تیرے ساتھ ہمیشہ اللہ کی طرف سے ایک مددگار رہے گا جب تک تیرا رویہ یہی رہے گا۔ (68)

رشتے داروں میں حُسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ حق دار کون؟:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں میں سے (میری طرف سے) حسن معاشرت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہارا باپ، پھر جو تمہارا زیادہ قریبی (رشتہ دار) ہو، (پھر جو اس کے بعد) تمہارا قریبی ہو۔ (اسی ترتیب سے آگے حق دار بنیں گے۔ (69)

مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک

نبی کریم ﷺ کی رحمت کا سب سے درخشاں اور بے مثال باب دشمنوں کے ساتھ آپ کا رویہ ہے۔ جن لوگوں نے آپ کو وطن سے نکالا، آپ پر پتھر برسائے، آپ کے دندانِ مبارک شہید کیے، آپ کے صحابہ پر مصائب کے پہاڑ ڈھائے، جب وہ آپ کے سامنے مجرم بن کر کھڑے تھے، تو آپ نے بدلہ لینے کے بجائے رحمت کا مظہر بن کر انہیں معاف کر دیا۔

فتح مکہ کا تاریخی معافی نامہ: فتح مکہ کے دن جب قریش کے تمام سرکردہ سردار مسجدِ حرام میں اس خوف سے کانپ رہے تھے کہ اب نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، تو آپ نے وہ تاریخ ساز جملہ ارشاد فرمایا جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے قریش کے لوگو! تم کیا گمان کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہا: آپ اچھے بھائی ہیں اور اچھے بھتیجے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿اِذھبوا فأنتم الطلقاء﴾ جاؤ، تم سب آزاد ہو۔ (70)

طائف کے میدان میں رحمت کی دعا: آپ نے اس سے قبل یہ واقعہ پڑھا کہ جب طائف کے سفاک لوگوں نے آپ ﷺ کو پتھر مار کر لہولہان کر دیا، اور پہاڑوں کے فرشتے نے آ کر یہ اجازت چاہی کہ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو اس بستی پر الٹ دوں، تو سراپا رحمت نبی ﷺ نے اپنے خون سے لت پت جسم کے ساتھ یہ تاریخی کلمات کہے: نہیں! بل کہ مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گی۔ (71)

غزوہ احد کے دن مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کو شدید تکلیف دی، چنانچہ آپ کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا اور ان کے جسدِ مبارک کا مثلہ کیا گیا، اور درجنوں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ چنانچہ بعض صحابہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور تجویز پیش کی کہ آپ مشرکین کے خلاف بددعا کریں تاکہ اللہ انہیں اپنی طرف سے عذاب دے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا: بے شک میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، بل کہ میں تو دعوت دینے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل وانصاف

نبی کریم ﷺ کا عدل و انصاف اس قدر بے مثال تھا کہ آپ نے قانون کی حکمرانی کو ہر ذاتی رشتے، قبیلے اور مرتبے سے بالا رکھا، اور اپنی زندگی میں دوست و دشمن، امیر و غریب سب کے لیے مکمل مساوات قائم فرمائی ۔ذات پات، رنگ و نسل، امیر و غریب اور اپنے و بیگانے کے فرق کو ختم کر کے ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کیا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ کا عدل صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ غیر مسلموں اور شدید ترین دشمنوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ نے ہمیشہ عدل کا معاملہ فرمایا۔ قرآنِ مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعے امت کو یہی ہدایت فرمائی کہ:"اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل ترک کر دو، عدل کرو یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے"۔(72)

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے:"بے شک انصاف کرنے والے اللہ کے پاس، نور کے منبروں پر رحمن کے داہنے جانب ہوں گے، اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ یعنی وہ لوگ اپنے حکم، اپنے گھر والوں اور ان کاموں میں جو ان کے سپرد ہیں، انصاف کا اہتمام کرتے ہیں۔(73)

سب کے لیے یکساں اصول: نبی کریم ﷺ نے عدل وانصاف کے نفاذ میں کبھی کسی بھی قسم کی رعایت یا جانبداری نہیں برتی۔ چناں چہ حدیث پاک میں ہے کہ:"ایک مخزومی عورت کا معاملہ جس نے چوری کی تھی، قریش کے لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا اور انہوں نے کہا کہ نبی پاک ﷺ سے اس معاملہ میں کون بات کر سکتا ہے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا، جو آپ ﷺ کو بہت پیارے ہیں اور کوئی آپ سے سفارش کی ہمت نہیں کر سکتا؟ چناں چہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے بات کی تو آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی حدوں میں

سفارش کرنے آئے ہو؟۔ پھر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اس لیے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد (ﷺ) اس کا ہاتھ ضرور کاٹ ڈالتے۔ (74)

حضرت سواد بن غزیہ سے قصاص کا واقعہ: غزوہ بدر کے موقع پر نبی کریم ﷺ صفوں کو درست فرما رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ایک تیر تھا جس سے آپ ﷺ صفوں کو سیدھا کر رہے تھے۔ اسی دوران حضرت سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے پیٹ میں ہلکا سا تیر کا چوبھا دے کر فرمایا: "اے سواد! سیدھے ہو جاؤ۔" حضرت سواد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپ نے مجھے تکلیف دی ہے، اللہ نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، لہٰذا مجھے بدلہ (قصاص) لینے کی اجازت دیجیے۔" نبی کریم ﷺ نے فوراً اپنا شکم مبارک کھول دیا اور فرمایا: "سواد! اپنا بدلہ لے لو۔" حضرت سواد رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے (محبت میں) نبی کریم ﷺ کے شکم مبارک کو بوسہ دے دیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "اے سواد! تم نے ایسا کیوں کیا؟" انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! جنگ کا موقع ہے، معلوم نہیں زندگی ہے یا موت، میری آخری خواہش تھی کہ میری جِلد آپ کی جِلد سے مَس ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے لیے خیر کی دعا فرمائی۔ (75)

حضرت ابوذر غفاری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما: ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی، تو غصے میں آ کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان کی سیاہ رنگت کا طعنہ دیتے ہوئے کہہ دیا: "اے سیاہ عورت کے بیٹے!"۔ حضرت بلال نے رنجیدہ ہو کر یہ بات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کر دی۔ جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ حضرت ابوذر پر شدید ناراض ہوئے اور فرمایا: "اے ابوذر! تو نے اسے اس کی ماں کے نام پر عار دلائی؟ تیرے اندر ابھی تک جاہلیت کی بو باقی ہے۔" حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا،

وہ فوراً آئے، زمین پر اپنا سر رکھ دیا اور کہا: ”خدا کی قسم! جب تک بلال اپنے پاؤں سے میرا سر نہیں روند دیں گے، میں اپنا سر زمین سے نہیں اٹھاؤں گا۔“ (76)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا فدیہ: جب غزوہ بدر کے بعد قیدیوں سے فدیہ لیا جا رہا تھا، تو حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ (جو نبی کریم ﷺ کے چچا ہیں) بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ انصار نے رسول اللہ ﷺ سے ان کا فدیہ معاف کرنے کی درخواست کی تھی، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمادیا کہ: اس میں سے ایک درہم بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ تاکہ قانون کی مساوات اور انصاف کا اعلیٰ ترین اصول قائم رہے۔ (77)

دانت توڑنے کا قصاص: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ربیعہ بنت نضر نے ایک لڑکی کا دانت توڑ دیا، ان لوگوں نے قصاص کا مطالبہ کیا، ربیعہ کے لوگوں نے دوسرے فریق سے معافی کی درخواست کی، جسے ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، اب دونوں فریق بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، حضور ﷺ نے قصاص جاری کرنے کا حکم فرمایا، ان کے بھائی انس بن نضر نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! کیا ربیعہ کا دانت توڑ دیا جائے گا؟ اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، ایسا نہیں ہو سکتا، آپ ﷺ نے فرمایا: قصاص اللہ تعالیٰ کی کتاب کا فیصلہ ہے؛ چنانچہ دوسرے فریق راضی ہو گئے، اور انہوں نے معاف کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بعض ایسے بندے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا فرما دیتے ہیں۔ (78)

اولاد کے ساتھ انصاف کا حکم: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کے والد انہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام بطور ہبہ دیا ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا، کیا ایسا ہی غلام اپنے دوسرے لڑکوں کو بھی دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر (ان سے بھی) واپس لے لے۔ (79)

غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ

سرزمین عرب میں یہود کے علاوہ رسول کریم ﷺ کے تعلقات بطور سربراہِ حکومت نصاریٰ سے بھی قائم ہوئے۔ نجران کے عیسائی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سرکار کریم ﷺ نے انہیں جزیہ اور عارضی جنگی

سازوسامان کی فراہمی کے بدلے جو حقوق عطا کیے اس کی قدرے تفصیل یہ ہے: مسلمان ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں گے۔ ان کو تمام مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے۔ ان کا کوئی عبادت خانہ گرایا نہیں جائے گا، نہ ہی کسی پادری کو بے دخل کیا جائے گا اور نہ ان کے حقوق میں کوئی تبدیلی یا کمی بیشی ہوگی، نہ ہی اُن کی حکومت اور ملکیت میں، نہ انہیں ان کے دین سے ہٹایا جائے گا جب تک وہ معاہدہ کے پابند رہیں گے۔ ان شرائط کی پابندی کی جائے گی اور ان پر کوئی ظلم یا زیادتی نہیں ہوگی۔(80)

عیسائی مورخ یہ معاہدہ انصاف و رواداری نقل کرتے ہوئے ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ روتھ کرینسٹن اپنی کتاب World Faith میں لکھتی ہیں:

”کیا دنیا میں کسی فاتح قوم یا مذہب نے اپنی مفتوح قوموں کو اس سے بڑھ کر تحفظات کی ضمانت دی ہے جو ہادئ اسلام ﷺ کے ان الفاظ میں موجود ہے؟۔(World Faith by Ruth Cranston p.157 U.S.A)۔(81)

اخلاق نبوی ﷺ پر عمل نجات کا واحد ذریعہ ہے

آج کا پر آشوب دور اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم سیرتِ طیبہ اور اخلاقِ نبوی ﷺ کو محض عقیدت و محبت کی حد تک محدود نہ رکھیں، بل کہ اپنی ذاتی، خاندانی اور معاشرتی زندگی میں اس کے عملی نفاذ کو یقینی بنائیں۔ موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ اخلاقی بحران اور انسانی رشتوں کا زوال ہے، جہاں مفاد پرستی، بے حسی اور ناانصافی نے معاشرے کے سکون کو غارت کر دیا ہے۔ اس تاریک ماحول میں صرف اور صرف اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر ہی نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ ذاتی زندگی میں صبر و استقامت، خاندانی نظام میں عدل و رحمت اور معاشرتی معاملات میں رواداری، امانت داری اور حقوقِ انسانی کی پاسداری ہی وہ سنہرے اصول ہیں جو ہمیں اندرونی انتشار اور اخلاقی پستی سے نکال سکتے ہیں۔ لہٰذا، عصرِ حاضر کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے اور ایک پرامن، عادلانہ اور فلاحی معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے قول و فعل کو نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور اخلاق کریمانہ کے مطابق ڈھالیں، کیوں کہ یہی ہماری دنیا اور آخرت کی کامیابی کا واحد ضامن ہے۔

مصادر و مراجع

(1) اخرجہ الإمام البخاري في الأدب المفرد، الرقم:273

(2) ترمذی، حدیث:1162

(3)ترمذي، حديث:2003

(4)ترمذی/حدیث:2018

(5)ابوداود/حدیث:4798

(6)سورۃالقلم:4

(7)مسلم/حدیث746

(8)سورۃالتوبۃ:128

(9)سورۃالأنبياء:107

(10)سورۂآلِ عمران آیت159

(11)سورۃالاحزاب، آیت21

(12)لبقرۃ:263

(13)التوبۃ:114

(14)ابوداود/حدیث:4777

(15) صحيح بخاري/حدیث:6116

(16) صحيح مسلم/حدیث:2599

(17) صحيح بخاري/3477

(18) صحيح بخاري/حدیث3231

(19) صحيح بخاري/حدیث:5809

(20)سنن ترمذي/حدیث:1924

(21) صحيح بخاري/حدیث:676

(22) صحيح بخاري/حدیث:3331]

(23) صحيح مسلم/حدیث2316

(24)مسند ابي يعلى/385

(25) صحيح بخاري/حدیث:3560

(26) صحيح مسلم/حدیث:6050

(27) صحيح بخاري/حدیث:6089

(28)ابوداؤد/حدیث:930

(29) صحيح بخاري/حدیث220

(30) صحیح بخاري/حدیث:2768
(31)سنن اَبي داود/حدیث:4773
(32) صحیح بخاري/حدیث:6203
(33) صحیح بخاري/حدیث:6006
(34)سنن ابي داود/حدیث2549
(35) صحیح مسلم/حدیث:1955
(36)المستدرک/حدیث:3962
(37) صحیح بخاري/حدیث:4913
(38)سنن ابي داود/حدیث:5230
(39) صحیح بخاري/حدیث:3445
(40) صحیح بخاري/حدیث:6072
(41) صحیح بخاري/حدیث:4770
(42)سیرت ابن ہشام/1/484-485
(43)سیرت ابن ہشام/2/315-317
(44) صحیح بخاري/حدیث:33
(45) صحیح بخاري/حدیث:07
(46)سورۃ الانعام:۳۳
(47) صحیح بخاري/حدیث:6034
(48) صحیح مسلم/حدیث:6021
(49)شمائل ترمذي/281
(50) صحیح بخاري/حدیث:6
(51)سنن ترمذي/حدیث:2362
(52)سنن ترمذي/حدیث:666
(53) صحیح بخاري/حدیث:5810
(54) صحیح بخاري/حدیث:4953
(55)سنن ترمذي/حدیث:1967
(56)سنن ابن ماجه/حدیث:3356

(57) صحیح الجامع:3318
(58) صحیح الجامع:7492
(59)سورۃ الحشر/9
(60)سنن ابن ماجہ/حدیث:3672
(61) صحیح مسلم/46
(62)مسند احمد/2/440
(63)سنن الترمذی/1944
(64) صحیح البخاري/2015
(65)سورۃ الرعد/21
(66)سورۃ الروم/38
(67) صحیح بخاري/حدیث:5988
(68) صحیح مسلم/حدیث:2558
(69) صحیح مسلم/حدیث:6501
(70)سیرت ابن ہشام/230
(71) صحیح مسلم/حدیث:1795
(72)سورۃ المائدہ/8
(73) صحیح مسلم/حدیث 4721
(74) صحیح بخاری،6788
(75)سیرت ابن ہشام/2/272
(76) صحیح بخاری،حدیث:31
(77) صحیح بخاري/حدیث:3048
(78) صحیح بخاری/حدیث:3703
(79) صحیح البخاري/حدیث:2586
(80)ابوداؤد/1/266
(81)World Faith

تزکیۂ نفس اور تعلیمات نبوی

مفتی محمد انور عالم مصباحی، استاذ و مفتی دار العلوم غریب نواز، مرزا غالب روڈ، الہ آباد

انسان کا وجود مٹی اور روح کے ایک ایسے پر اسرار امتزاج کا نام ہے، جس میں خاکی بدن اسے پستی کی طرف کھینچتا ہے اور ربانی روح اسے بلندیوں کی جانب پکارتی ہے۔ اس کشمکش میں انسانی بقا اور ارتقا کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی باطنی دنیا کو کس حد تک آلودگیوں سے بچا کر اس کی اصل فطرت پر قائم رکھتا ہے۔ اسلام کی اخلاقی اور روحانی لغت میں اسی عمل کو 'تزکیۂ نفس' کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ثانوی درجے کی صوفیانہ مشق یا محض طریقت کا کوئی اضافی سبق نہیں، بلکہ قرآنِ حکیم کی رو سے یہ بعثتِ انبیا کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ سورۂ جمعہ میں نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان میں آیات کی تلاوت کے فوراً بعد تزکیہ کا ذکر آیا ہے، جس کے بعد کتاب اور حکمت کی تعلیم کا بیان ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے :

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (پ:۲۸. آیت:۲)

ترجمہ: وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انھیں پاک کرتے ہیں اور انھیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں اور بے شک وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔

اس قرآنی ترتیب سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرمانے کے بعد انھیں پاک کرتے ہیں۔ یعنی انھیں باطل عقیدوں، مذموم اخلاق، قبیح عناصر، دورِ جاہلیت کی خباثتوں اور ناپسندیدہ اعمال سے پاک کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں کتاب و حکمت یعنی قرآن و سنت کے احکام و اسرار کا علم عطا فرماتے ہیں"۔ اس سے پتہ یہ چلا کہ جب تک دل کا برتن پاک نہ ہو، اس میں علم اور حکمت کا نور نہیں ٹھہر سکتا، گویا تزکیہ وہ اولین شرط ہے جو انسان کو وحی (قرآن و سنت) کے فہم کے قابل بناتی ہے۔

لغوی اعتبار سے تزکیہ کے دو بنیادی مفہوم ہیں: پاک وصاف کرنا اور نشو و نما دینا۔ جس طرح ایک ماہر باغبان کسی پودے کی بہترین افزائش کے لیے اس کے گرد لگی ہوئی خودرو جڑی بوٹیوں اور خاردار جھاڑیوں کو کاٹ دیتا ہے تاکہ پودا پوری طرح پنپ سکے، بالکل اسی طرح تزکیہ کا عمل انسانی روح کو حسد، تکبر، کذب، دغا، ریاکاری اور فساد و نفرت جیسی باطنی غلاظتوں سے پاک کر کے اس میں شکر، تواضع، اخلاص، خیر، صلاح، خوف، رضا اور تقویٰ و طہارت جیسی خوبیوں کے پھول کھلاتا ہے۔

قرآنی فلسفۂ حیات میں تزکیہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سورۃ الشمس میں کائنات کی مختلف نشانیوں کی مسلسل گیارہ قسمیں کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانی کامیابی کو کسی معاشی یا مادی پیمانے سے نہیں بلکہ تزکیۂ نفس سے مشروط کیا، اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ یقیناً مراد پا گیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، اور نامراد رہا وہ جس نے اسے گناہوں میں چھپا دیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا﴾ (سورۃ الشمس۔ آیت:10)

ترجمہ: بیشک مراد کو پہنچا جس نے اُسے ستھرا کیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔

یہ قرآنی اسلوب بتاتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام ایک طرف اور انسان کے باطن کی طہارت ایک طرف ہے۔ یعنی نفس کو برائیوں سے پاک کرنا (تزکیۂ نفس) کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کو گناہوں میں چھپا دینا ناکامی کا سبب ہے۔

تعلیماتِ نبوی ﷺ میں تزکیے کا طریقہ کار دیگر قدیم روحانی سلسلوں اور مذاہب سے یکسر مختلف اور بے حد منفرد ہے۔ قدیم فلسفوں میں نفس کو مارنا یا دنیا سے کٹ کر جنگلوں اور غاروں میں بیٹھ جانا روحانیت کی معراج سمجھی جاتی تھی، مگر نبی اکرم ﷺ نے اس رہبانیت کو مسترد کر دیا۔ اسوۂ نبوی میں تزکیہ سماج سے کٹ کر نہیں بلکہ سماج کے اندر رہ کر انجام پاتا ہے۔ ایک مسلمان بازار میں تجارت کرتے ہوئے، خاندان کے معاملات میں مصروف رہتے ہوئے اور میدانِ جنگ میں شمشیر زنی کرتے ہوئے بھی اپنے نفس کے تزکیے کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے تزکیۂ نفس کی بنیادی چیز کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً فَإِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ﴾ (بخاری شریف)

بیشک انسان کے جسم کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو سارا جسم صحیح ہے اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سن لو! وہ دِل ہے۔

یہ حدیثِ مبارکہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ انسانی اعمال کا سارا کنٹرول اس کے باطن میں ہے، اور جب تک یہ باطن مصفیٰ و مزکیٰ نہ ہو، ظاہری اعمال مقبول خداوندی کی سعادت و شرف اور فلاح دارین کی نورانیت و تابندگی نہیں پاسکتے ہیں۔ یعنی اعمال و عبادات میں صلاح و فلاح کا بنیادی ذریعہ قلب و باطن کے تصفیہ و تزکیہ میں ہے۔

جدید دور کی نفسیات نے جب انسان کے داخلی رویوں کا مطالعہ شروع کیا تو اس نے 'سیلف ایکچوئلائزیشن' (Self-Actualization) یعنی ذات کی تکمیل کا تصور پیش کیا، جس کا محور عموماً انا کی تسکین اور انفرادی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔ مگر تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں تزکیہ "انا" کو فربہ کرنے کا نہیں بلکہ اسے رضائے الٰہی کے تابع کرنے کا نام ہے۔ اس عمل کے دو بڑے مراحل ہیں جنہیں علمائے اخلاق "تخلیہ" اور "تحلیہ" کہتے ہیں۔ تخلیہ دل کو غیر اللہ اور بری صفات سے خالی کرنے کا نام ہے، اور تحلیہ اسے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے آراستہ کرنے کا عمل ہے۔ جب کوئی انسان اس نبوی بھٹی سے کندن بن کر نکلتا ہے تو وہ محض ایک فرد نہیں رہتا بلکہ معاشرے کے لیے ایک تناور سایہ دار درخت بن جاتا ہے۔ اس کا غصہ، اس کی محبت، اس کی دوستی اور اس کی

دشمنی، سب کچھ ذات کے تنگ خول سے نکل کر دینی و اخلاقی اصولوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع ہو جاتے ہیں۔

آج کا انسان، جو مادی ترقی کی انتہاؤں کو چھو لینے کے باوجود شدید داخلی تنہائی، ڈپریشن اور عدم تحفظ و سکون کا شکار ہے، دراصل اسی تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب سے محرومی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ ہم نے اپنے خاکی وجود کو سنوارنے کے لیے تو طب، سرجری اور کاسمیٹکس کے حیرت انگیز علوم ایجاد کر لیے، مگر اس وجود کے اندر دھڑکنے والے قلب میں انوار الٰہی، تجلیات ربانی اور روحانی و عرفانی نور لانے کے طریقوں کو چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں باہر سے روشن نظر آنے والا انسان اندر سے کھنڈر بن گیا۔ تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں تزکیۂ نفس وہ واحد راستہ ہے جو انسان کی اس بکھری ہوئی داخلی کائنات کو دوبارہ ترتیب دے سکتا ہے۔ یہ وہ باطنی قطب نما ہے جو قدم قدم پر بھٹکنے والے انسان کو اس کے اصل مرکز کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور اسے یاد دلاتا ہے کہ اس کی اصل معراج محض جسم کو پالنا نہیں بلکہ اپنی روح کو اس مقام تک پہنچانا ہے جہاں اسے اپنے خالق سے 'نفسِ مطمئنہ' کا خطاب مل سکے، اور تجلیاتِ الٰہیہ سے اپنے باطنی احوال کو منور و مزکیٰ کر کے دارین کی سعادت و کامیابی حاصل کر سکے۔

رب کائنات جل جلالہ اپنے فضل و کرم سے اور اپنے حبیب رسول اکرم ﷺ کے صدقے میں ہم سب کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب جیسی عظیم نعمتوں سے آراستہ فرمائے اور مسلک و مذہب کی خدمات بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

سیرت اور ٹیکنالوجی

مصنوعی ذہانت اور سیرتِ رسول ﷺ کی اخلاقی تعلیمات

ڈاکٹر مفتی خالد ایوب مصباحی شیرانی، (چیرمین: تحریک علمائے ہند)

مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) اکیسویں صدی کی سب سے بڑی تکنیکی انقلابی قوت بن چکی ہے۔ تعلیم، طب، تجارت، صنعت، صحافت، تحقیق، عدلیہ، معیشت، دفاع اور ذرائع ابلاغ سمیت زندگی کا تقریباً ہر شعبہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ AI نے معلومات تک رسائی، فیصلوں کی رفتار اور انسانی صلاحیتوں میں بے مثال اضافہ کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ جھوٹی معلومات، رازداری کی خلاف ورزی، تعصب، علمی سرقہ، ڈیپ فیک، بے روزگاری اور اخلاقی انحطاط جیسے سنگین مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ مصنوعی ذہانت صرف ایک طاقت ور آلہ (Tool) ہے؛ اس کے استعمال کی خیر و شر کا دار و مدار اسے استعمال کرنے والے انسان کے کردار، اخلاق اور مقاصد پر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سیرتِ رسول اکرم انسانیت کو ایسی جامع اخلاقی رہ نمائی فراہم کرتی ہے جو ہر دور اور ہر نئی ٹیکنالوجی کے لیے یکساں قابلِ عمل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اسلام میں علم کو اخلاق سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام نے علم کو عبادت قرار دیا، لیکن ساتھ ہی اسے صدق، امانت، عدل، رحمت اور تقویٰ کے تابع رکھا ہے۔ اگر جدید AI انہی اصولوں کی پابند ہو تو وہ انسانیت کی عظیم خدمت کر سکتی ہے، اور اگر ان اخلاقی حدود سے

آزاد ہو جائے تو وہ ظلم، فریب اور استحصال کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے مناسب محسوس ہو تا ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ہم سیرت النبی سے مستفاد چند اصولوں سے استفادہ کریں۔

سیرت کا پہلا اصول؛ صدق:-

آج AI کے ذریعے چند لمحوں میں ہزاروں مضامین، تصاویر اور ویڈیوز تیار ہو جاتی ہیں، مگر ہر تیار شدہ مواد درست اور قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ بعض اوقات AI غلط حوالہ، من گھڑت واقعہ یا غیر مصدقہ معلومات بھی پیش کر دیتا ہے۔ ایسے ماحول میں نبی کریم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ خبر کو تحقیق کے بغیر قبول نہ کیا جائے، جھوٹ سے مکمل اجتناب کیا جائے اور بغیر علم کے کوئی بات نہ کہی جائے۔ دلیل کے طور پر درج ذیل تعلیمات پیش کی جا سکتی ہیں:

(الف) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۔﴾ (1)

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر پشیمان ہونا پڑے۔

(ب) ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (2)

جس چیز کا تمھیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، بے شک کان، آنکھ اور دل، سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اس بابت ایک عام ترین غلطی جس کی حدیث پاک میں نہ صرف اصلاح کی گئی ہے بلکہ ایک اصول دے کر ہمیشہ کے لیے یہ عقدہ ہی کھول دیا گیا ہے، دیکھیے:

(ج) ﴿كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ﴾(3)

کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات آگے بیان کر دے۔

سچائی اور جھوٹ کے بارے میں نبوی تعلیم کتنی واضح ہے:

(د) ﴿عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ. وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ﴾ (4)

سچائی کو لازم پکڑو، کیوں کہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور جھوٹ سے بچو، کیوں کہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔

بہت سی اسلامی تعلیمات میں سے یہ کچھ اصولی سی باتیں ہیں، جو آج کے ڈیجیٹل دور میں معلومات کی تصدیق (Fact-checking) کی بنیاد بنتی ہیں۔ اگر اس سلسلے میں ایک ایک گوشے پر مکمل تفصیلات جمع کی جائیں تو کتابی مضمون بنے۔

دوسرا اصول؛ امانت اور ذمہ داری:-

اے آئی کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ لوگوں کا ذاتی ڈیٹا، تصاویر، تحریریں اور دیگر نجی معلومات بڑے پیمانے پر جمع، محفوظ اور استعمال کی جا رہی ہیں۔ سیرتِ نبوی ﷺ اس حوالے سے ہمیں امانت، رازداری اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کا ایسا جامع اخلاقی نظام عطا کرتی ہے، جو آج کے ڈیجیٹل دور میں بھی پوری طرح رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے امانت کی ادائیگی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (5)

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کے سپرد کرو۔

اسی طرح دوسروں کی نجی زندگی میں مداخلت سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَجَسَّسُوا﴾ (سورہ حجرات:12) اور ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو۔

نبی کریم ﷺ نے بھی رازداری کو امانت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِالْحَدِيثِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ﴾(6)

جب کوئی شخص کوئی بات کہے، پھر (یہ ظاہر کرنے کے لیے) ادھر اُدھر دیکھے تو وہ بات امانت ہے۔

مزید فرمایا: ﴿كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ﴾(7)

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے۔

اور ارشاد فرمایا:﴿لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ﴾(8)

اس شخص کا ایمان ہی کامل نہیں، جس میں امانت داری نہیں۔

کیا ان تعلیمات کی روشنی میں ہمیں یہ ہدایت نہیں ملتی کہ ڈیجیٹل دور میں صارفین کا ذاتی ڈیٹا، نجی معلومات، تصاویر اور تخلیقی مواد بھی ایک امانت ہیں، جنھیں بلا اجازت استعمال کرنا، افشا کرنا یا ان سے ناجائز فائدہ اٹھانا اسلامی اخلاق کے منافی ہے!

اسی طرح دوسروں کی علمی و تخلیقی کاوشوں (Intellectual Property) کا احترام اور ان کے حقوق کی حفاظت بھی عدل و امانت کا تقاضا ہے۔ لہٰذا مصنوعی ذہانت کے استعمال میں Privacy، Data Protection اور Intellectual Property Rights کا احترام صرف قانونی ذمہ داری نہیں بلکہ سیرتِ نبوی ﷺ کی تعلیمات اور اسلامی اخلاقیات کا بھی لازمی تقاضا ہے۔

تیسرا اصول؛ عدل و انصاف :-

مصنوعی ذہانت کو درپیش اہم اخلاقی چیلنجز میں سے ایک Bias (تعصب یا جانب داری) ہے۔ اگر AI کو غیر متوازن یا جانب دارانہ ڈیٹا پر تربیت دی جائے تو اس کے فیصلوں میں بھی نسل، زبان، مذہب، جنس، قومیت یا سماجی و معاشی طبقے کے حوالے سے امتیازی رویے پیدا ہو سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں بعض افراد یا طبقات کے ساتھ ناانصافی کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے AI کی تیاری اور استعمال میں انصاف، غیر جانب داری (Neutrality) اور مساوات (Fairness) کو بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

سیرتِ نبوی ﷺ عدل و انصاف کے اسی عالم گیر تصور کی تعلیم دیتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (9)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کرو، یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

اسی طرح فرمایا:﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾(10)

بے شک اللہ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں ہر قسم کے نسلی، قبائلی اور معاشرتی تعصبات کا خاتمہ فرمایا۔ حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى﴾(11)

لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

یہ اسلامی تعلیمات اس بات کی متقاضی ہیں کہ مصنوعی ذہانت کے الگورتھمز، تربیتی ڈیٹا (Training Data) اور فیصلہ سازی کے نظام کو اس انداز سے تیار کیا جائے کہ وہ کسی فرد یا گروہ کے ساتھ مذہب، نسل، زبان، جنس یا سماجی حیثیت کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہ کرے۔ چناں چہ Fairness، Neutrality، Equality اور Non-discrimination صرف جدید AI Ethics کے تقاضے نہیں بلکہ سیرتِ نبوی ﷺ کے عطا کردہ اصولِ عدل و انصاف کا عملی اظہار بھی ہیں۔

چوتھا اصول: رحمت، انسانیت اور انسانی وقار:-

سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک بنیادی امتیاز یہ ہے کہ آپ کی بعثت کسی ایک قوم، نسل یا خطے کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے رحمت بن کر ہوئی۔ چناں چہ مصنوعی ذہانت کی ترقی کا اصل مقصد بھی صرف تجارتی منافع، انسانی محنت کا متبادل پیدا کرنا یا ٹیکنالوجی کی برتری ثابت کرنا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ انسانیت کی خدمت، انسانی تکالیف میں کمی، علاج و تشخیص میں سہولت، معذور افراد کی معاونت، معیاری تعلیم کی فراہمی، غربت کے خاتمے اور معاشرے کی فلاح و بہبود ہونا چاہیے۔ وہ ٹیکنالوجی جو انسان کے لیے آسانی، رحمت اور خیر کا ذریعہ بنے، اسلامی تعلیمات کی روح سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾(12)

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔

اسی طرح بطورِ اصول ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾(13)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

یہ آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ہر ایسی ایجاد، علم یا ٹیکنالوجی جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہو، اسلامی مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی انسانوں کے لیے نفع رسانی کو بہترین عمل قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ﴾(14)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب انسان وہ ہے، جو لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: ﴿ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ﴾(15)

زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔

اسی طرح انسانی وقار (Human Dignity) کا تحفظ بھی سیرتِ نبوی ﷺ کا بنیادی اصول ہے۔ قرآنِ مجید نے اعلان فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾(16)

بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت و کرامت عطا فرمائی ہے۔

مزید فرمایا: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾(17)

اور تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔

نیز ارشاد ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ﴾(18)

اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔

ان تعلیمات کی روشنی میں مصنوعی ذہانت کے ذریعے Deepfakes تیار کرنا، کردار کشی کرنا، بلیک میلنگ، نفرت انگیز مواد پھیلانا، جھوٹی نسبتیں قائم کرنا یا کسی فرد کی عزت و شہرت کو نقصان پہنچانا صریح اسلامی اخلاق کے خلاف ہے۔ AI کو ایسا ذریعہ بننا چاہیے جو انسان کی عزت، تحفظ، اعتماد اور فلاح میں اضافہ کرے، نہ کہ اس

کی شخصیت، وقار اور سماجی حیثیت کو مجروح کرے۔ یہی سیرتِ نبوی ﷺ کی رحمت، خدمتِ انسانیت اور احترامِ انسان کا تقاضا ہے، اور یہی اسلامی اخلاقیات پر مبنی AI کی حقیقی بنیاد بھی ہے۔

پانچواں اصول؛ اعتدال، تدبر اور انسانی ذمہ داری:-

سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک نمایاں اصول اعتدال ہے۔ اسلام ہر معاملے میں توازن، میانہ روی اور اسباب اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی اعتدال مصنوعی ذہانت کے استعمال میں بھی مطلوب ہے۔ اگرچہ AI تحقیق، تعلیم، طب، صنعت اور دیگر شعبوں میں ایک مؤثر معاون ثابت ہو رہا ہے، لیکن اس پر غیر معمولی انحصار انسان کی فکری، علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو کمزور کر سکتا ہے۔ آج یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ لوگ اپنی سوچ، تحقیق، تحریر، تجزیے اور فیصلہ سازی کے بجائے ہر معاملے میں AI پر اعتماد کرنے لگے ہیں، جس سے تنقیدی فکر، اجتہادی بصیرت اور علمی خود مختاری متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔

قرآنِ کریم انسان کو غور و فکر، تدبر اور عقل کے استعمال کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ﴾(19)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾(20)

بے شک اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

مزید فرمایا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾(21)

جس چیز کا تمھیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔

یہ آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام انسان کو محض تقلید یا انحصار کی نہیں بلکہ شعوری غور و فکر، تحقیق اور ذمہ دارانہ فیصلہ سازی کی تعلیم دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اسباب اختیار کرنے اور توکل کے درمیان توازن قائم کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ﴾(22)

پہلے اونٹنی کو باندھو، پھر اللہ پر توکل کرو۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے:﴿الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ﴾(23)
عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور آخرت کے لیے عمل کرے۔

یہ احادیث اس امر کی طرف رہ نمائی کرتی ہیں کہ اسلام انسان کو اپنی عقل، بصیرت اور ذمہ داری کو ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

لہٰذا مصنوعی ذہانت کو انسانی عقل و شعور کا معاون (Assistant) سمجھا جانا چاہیے، متبادل (Replacement) نہیں۔ تحقیق، تدریس، افتا، عدالتی فیصلوں، سائنسی مطالعات اور تخلیقی کاموں میں AI سے استفادہ ضرور کیا جائے، لیکن حتمی تجزیہ، علمی نقد، اخلاقی فیصلہ اور ذمہ داری انسان ہی کے پاس رہنی چاہیے، ورنہ ٹیکنالوجی پر حد سے زیادہ انحصار انسانی فکر، تخلیقی صلاحیت اور اخلاقی ذمہ داری کو مفلوج کر سکتا ہے۔ یہی اعتدال اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے اور یہی AI کے ذمہ دارانہ استعمال کی بنیاد۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مصنوعی ذہانت بذاتِ خود نہ خیر ہے اور نہ شر؛ اس کا اخلاقی رخ اسے استعمال کرنے والے انسان کے ایمان، کردار، نیت اور مقصد پر منحصر ہے۔ سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ اس حقیقت کی طرف رہ نمائی کرتی ہے کہ ہر علم، ہر طاقت اور ہر نئی ایجاد اس وقت تک خیر و برکت کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جب تک وہ اخلاقی اقدار اور الٰہی ہدایات کی پابند نہ ہو۔ اسی لیے اسلام نے علم کے ساتھ حکمت، طاقت کے ساتھ ذمہ داری اور اختیار کے ساتھ جواب دہی کو لازم قرار دیا ہے۔

قرآنِ مجید انسان کو اس کی ہر بات اور ہر عمل کی جواب دہی یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (24)

انسان جو بات بھی زبان سے نکالتا ہے، اس پر ایک نگراں فرشتہ موجود ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾(25)

بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

یہ قرآنی اصول اس امر کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ انسان اپنی معلومات، فیصلوں اور ٹیکنالوجی کے استعمال سمیت ہر عمل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی احساسِ ذمہ داری کو اسلامی معاشرے کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ﴾(26)

تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ انسان اپنے اختیار میں دی گئی ہر قوت اور ہر وسیلے کے استعمال کے بارے میں جواب دہ ہے اور مصنوعی ذہانت بھی انہی وسائل میں سے ایک ہے۔

اس لیے اگر مصنوعی ذہانت کو سیرتِ نبوی ﷺ کے عطا کردہ آفاقی اصولوں، یعنی صدق، امانت، عدل، رحمت، احترامِ انسانیت، تحفظِ حقوق، اعتدال اور احساسِ جواب دہی کے تابع رکھا جائے تو یہ علم، تحقیق، تعلیم، طب، معیشت اور خدمتِ انسانیت میں غیر معمولی ترقی اور خیر کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لیکن اگر اسے اخلاقی حدود، دینی اقدار اور انسانی ذمہ داری سے آزاد کر دیا جائے تو یہی طاقت جھوٹ، ظلم، تعصب، استحصال، پرائیویسی کی پامالی، فکری انحراف اور انسانی وقار کی تباہی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

لہٰذا مستقبل کی دنیا کو صرف Artificial Intelligence کی نہیں بلکہ Artificial Intelligence with Prophetic Ethics کی ضرورت ہے؛ ایسی مصنوعی ذہانت جو محض ذہین (Intelligent) نہ ہو بلکہ اخلاقی (Ethical)، عادل (Just)، امانت دار (Trustworthy) اور انسان دوست (Human-Centered) بھی ہو۔

یہی وہ تصور ہے جو سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں انسانیت کے سامنے پیش کرتی ہے۔ بلاشبہ ٹیکنالوجی ترقی کی رفتار کو تیز کر سکتی ہے، لیکن اس ترقی کو صحیح سمت صرف اخلاق عطا کرتے ہیں؛ کیوں کہ ٹیکنالوجی انسان کی صلاحیتوں کو بڑھاتی ہے، مگر سیرتِ نبوی ﷺ ان صلاحیتوں کو انسانیت کی خدمت کا راستہ دکھاتی ہے۔

مصادر و مراجع

(1) سورہ حجرات:6
(2) سورہ اِسرا:36
(3) صحیح مسلم
(4) صحیح بخاری:6094- صحیح مسلم:2607
(5) سورہ نسا:58
(6) سنن ابی داؤد،4868-ترمذی،1959
(7) صحیح مسلم،2564
(8) مسند أحمد
(9) سورہ مائدہ:8
(10) سورہ نحل:90
(11) مسند احمد
(12) سورہ انبیا:107
(13) سورہ مائدہ:2
(14) المعجم الاوسط للطبرانی
(15) ترمذی،1924
(16) سورہ اسرا:70
(17) سورہ حجرات:12
(18) سورہ حجرات:11
(19) سورہ نسا:82
(20) سورہ روم:24
(21) سورہ اسرا:36
(22) جامع الترمذی،2517
(23) ترمذی،2459
(24) سورہ ق:18
(25) سورہ اسرا:36
(26) صحیح البخاری،893- صحیح مسلم،1829

ڈیجیٹل شہرت کا فتنہ اور سیرتِ نبوی ﷺ

مفتی محمد عباس ازہری مصباحی، دارالعلوم اہل سنت فیض النبی، بستی، یوپی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی فطرت پر پیدا فرمایا ہے جس میں عزت، محبت، قبولیت اور قدر و منزلت کی خواہش رکھی گئی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اسے پہچانا جائے، اس کی بات سنی جائے، اس کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے اور معاشرے میں اسے احترام حاصل ہو۔ یہ جذبہ اپنی اصل کے اعتبار سے فطری ہے، لیکن اسلام نے اس جذبے کو ایک پاکیزہ رخ عطا کیا ہے۔

اگر انسان عزت اور قبولیت کو اللہ تعالیٰ کی رضا، خدمتِ دین، خیر خواہیِ انسانیت اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے استعمال کرے تو یہی جذبہ اس کے لیے بلندیِ کردار کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب یہی خواہش نفس کی تسکین، خود نمائی، تعریف پسندی اور دنیاوی مقبولیت کا مقصد بن جائے تو یہ انسان کے باطن کے لیے ایک خطرناک آزمائش بن جاتی ہے۔

ہر زمانے کے کچھ نمایاں فتنے رہے ہیں۔ کسی دور میں مال و دولت کی محبت نے انسان کو آزمائش میں ڈالا، کسی عہد میں اقتدار اور غلبے کی خواہش نے دلوں کو متاثر کیا، اور کسی زمانے میں ظاہری شان و شوکت انسان کی کمزوری کا سبب بنی۔ موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ اور بالخصوص ڈیجیٹل دنیا نے شہرت کے حصول کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔

آج ایک چھوٹا سا موبائل آلہ انسان کے ہاتھ میں ایک اسٹیج، ایک کیمرہ اور ایک نشریاتی ذریعہ بن چکا ہے۔ چند سیکنڈ کی ویڈیو، ایک تصویر یا ایک تحریر چند لمحوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک بڑی سہولت ہے، لیکن ہر بڑی سہولت کی طرح یہ بھی ایک بڑی آزمائش ہے۔

ڈیجیٹل ذرائع نے علم کی اشاعت، قرآن و سنت کی تعلیم، دعوتِ دین، اصلاحِ معاشرہ اور خیر کے فروغ کے بے شمار مواقع پیدا کیے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے خود نمائی، ریاکاری، جھوٹی مقبولیت، شہرت کی طلب اور نفس کی پیروی کے راستے بھی کھول دیے ہیں۔

آج بعض اوقات کامیابی کا معیار بدلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ علم کی گہرائی، کردار کی مضبوطی، تقویٰ، اخلاص اور خدمت کے بجائے فالوورز، لائکس، ویوز اور وائرل ہونے کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے کامیابی اور عزت کا معیار بالکل واضح کر دیا ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾(1)

ترجمہ: "بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

یہ آیت اعلان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار شہرت، دولت، منصب یا لوگوں کی تعریف نہیں، بلکہ تقویٰ، اخلاص اور صالح کردار ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ اس حقیقت کی سب سے روشن مثال ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ وہ عظیم ہستی ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خود بلند فرمایا، جن کی محبت کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا، اور جن کا نام قیامت تک دنیا کے ہر خطے میں بلند ہوتا رہے گا۔ لیکن اس عظیم مقام کے باوجود آپ ﷺ کی زندگی سراپا تواضع، اخلاص اور عبدیت تھی۔

آپ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کو مقصد نہیں بنایا، بلکہ ہمیشہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کی کوشش فرمائی۔ یہی وہ نبوی منہج ہے جس کی روشنی میں آج کے ڈیجیٹل دور کے انسان کو اپنی نیت، اپنے مقاصد اور اپنے ذرائع کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اصل سوال یہ نہیں کہ ہم ڈیجیٹل ذرائع استعمال کرتے ہیں یا نہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے:

کیا ہم ان ذرائع کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے استعمال کر رہے ہیں، یا یہ ذرائع ہمیں اپنی خواہشات اور شہرت کی طلب کا غلام بنا رہے ہیں؟

انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ دوسروں کی نگاہ میں قابلِ احترام بننا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا جائے، اس کی محنت کو سراہا جائے اور لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ اسلام اس فطری خواہش کو ختم نہیں کرتا، بلکہ اسے ایک بلند مقصد سے وابستہ کرتا ہے۔

اسلام انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کی تعریف کا محتاج بننے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب بنے، کیونکہ لوگوں کے دل بدلتے رہتے ہیں، ان کی آراء تبدیل ہوتی رہتی ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کی رضا دائمی کامیابی ہے۔

دنیا کی شہرت ایک سایے کی مانند ہے، جو کبھی انسان کے ساتھ چلتی ہے اور کبھی وقت کے بدلنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ کتنے ہی نامور لوگ وقت کے ساتھ گمنام ہو گئے، کتنی ہی مقبول شخصیات تاریخ کے صفحات میں محدود ہو کر رہ گئیں، لیکن جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے زندگی گزاری، ان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے باقی رکھا۔

قرآنِ کریم انسان کو یہ حقیقت یاد دلاتا ہے کہ عزت کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾(2)

ترجمہ: جو شخص عزت چاہتا ہے تو (جان لے کہ) تمام عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔

یہ آیت انسان کو ایک بنیادی حقیقت سمجھاتی ہے کہ عزت کا سرچشمہ مخلوق نہیں بلکہ خالق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو عزت عطا فرما دے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ذلیل نہیں کر سکتی، اور اگر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہ ہو تو دنیا کی تمام شہرتیں بھی انسان کو حقیقی کامیابی نہیں دے سکتیں۔

آج ڈیجیٹل دنیا میں انسان بعض اوقات اپنی قدر کا اندازہ نمبروں سے لگانے لگتا ہے۔ کتنے لوگوں نے دیکھا؟ کتنے لوگوں نے پسند کیا؟ کتنے لوگوں نے شیئر کیا؟ لیکن قرآن کا معیار اس سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن انسان کو یاد دلاتا ہے کہ اصل کامیابی لوگوں کی تعداد نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت ہے۔

اسلام شہرت کو مطلقاً منع نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص کو علم، دعوت، خدمت یا خیر کے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہو جائے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر عاجزی اختیار کرے تو یہ شہرت اس کے لیے باعثِ خیر ہو

سکتی ہے۔ لیکن مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان شہرت کو مقصد بنا لیتا ہے۔ جب اس کی کوشش کا مرکز یہ بن جائے کہ لوگ اسے پہچانیں، اس کی تعریف کریں، اس کا نام بلند ہو اور وہ دوسروں سے ممتاز نظر آئے، تو یہی خواہش روحانی نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ﴾(3)

ترجمہ: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ عمل کی ظاہری شکل سے زیادہ اہم اس کے پیچھے موجود نیت ہے۔ ایک ہی کام دو افراد انجام دے سکتے ہیں؛ ایک کا مقصد اللہ کی رضا ہو سکتا ہے اور دوسرے کا مقصد لوگوں کی تعریف۔ ظاہر میں دونوں کا عمل ایک جیسا ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں کا مقام مختلف ہوگا۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا ہر باب ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی دنیاوی مقبولیت کو اپنا مقصد نہیں بنایا۔ مکہ مکرمہ کے دور میں جب آپ ﷺ نے توحید کی دعوت پیش کی تو آپ کو مخالفت، تکلیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر آپ ﷺ کا مقصد صرف دنیاوی کامیابی یا لوگوں کی رضا ہوتا تو آپ بہت سے سمجھوتے کر سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے حق کے پیغام پر ثابت قدمی اختیار فرمائی۔

آپ ﷺ کی دعوت کا مرکز یہ تھا کہ انسان اپنے رب کو پہچانے، اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بنائے اور آخرت کی کامیابی حاصل کرے۔

اسی لیے قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی ذمہ داری کو یوں بیان فرمایا:

﴿وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾

ترجمہ: "اور آپ کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے۔"

یعنی رسول اللہ ﷺ کا مقصد اپنی ذات کی مقبولیت حاصل کرنا نہیں، بلکہ اللہ کا پیغام پہنچانا تھا۔

آج جب ہر شخص کے پاس اپنی بات دنیا تک پہنچانے کا موقع موجود ہے، اخلاص کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک عالم کی تقریر، ایک مصنف کی تحریر، ایک داعی کی ویڈیو یا ایک خیر کے کام کی تشہیر؛ سب کا تعلق نیت سے ہے۔ اگر مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا، دین کی خدمت اور لوگوں کی اصلاح ہے تو یہی ذرائع اجر کا سبب

بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر مقصد صرف تعریف، شہرت اور اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہے تو یہی ذرائع انسان کے لیے آزمائش بن سکتے ہیں۔ اسی لیے ہر صاحبِ اثر شخص کو اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہیے:

"میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں، کیا اس کا مقصد حق کو نمایاں کرنا ہے یا اپنی ذات کو؟" یہ سوال انسان کو ڈیجیٹل شہرت کے فتنوں سے بچانے کے لیے ایک مضبوط پیمانہ ہے۔

اسلام نے انسان کے ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کی اصلاح پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کی قدر صرف اس کی ظاہری صورت سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے موجود نیت، اخلاص اور مقصد بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک شخص بظاہر بہت بڑا نیک عمل انجام دے سکتا ہے، لیکن اگر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے بجائے لوگوں کی تعریف، اپنی بڑائی یا شہرت کی خواہش ہو تو وہ عمل اپنی روح کھو دیتا ہے۔

اسی لیے سیرتِ نبوی ﷺ کا سب سے نمایاں سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا تھوڑا عمل بھی عظیم بن جاتا ہے، اور دکھاوے کے لیے کیا گیا بڑا عمل بھی بے وزن ہو سکتا ہے۔ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کو بنائے۔ وہ نیکی اس لیے نہ کرے کہ لوگ اسے نیک کہیں، بلکہ اس لیے کرے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتا ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (4)

ترجمہ: اور انہیں حکم یہی دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ عبادت کی اصل روح اخلاص ہے۔ نماز، روزہ، صدقہ، علم، دعوت اور خدمت؛ ہر عمل اسی وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتا ہے جب اس میں خلوص شامل ہو۔ ریا کا مطلب ہے کہ انسان کوئی عمل لوگوں کو دکھانے یا ان سے تعریف حاصل کرنے کے لیے کرے۔

یہ باطن کی ایسی بیماری ہے جو بظاہر نیکی کے پردے میں ہوتی ہے، اس لیے اس سے بچنا زیادہ مشکل ہے۔ انسان کبھی کبھی اپنے عمل کو درست سمجھتا رہتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے بجائے لوگوں کی توجہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس خطرے سے امت کو خبر دار فرمایا:

﴿إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ﴾(5)

صحابۂ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿الرِّيَاءُ﴾ ریاکاری۔"

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت کے لیے جس خطرے کا اظہار فرمایا، ان میں ایک بڑا خطرہ ریاکاری ہے۔ کیونکہ یہ انسان کے عمل کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی جو عبادت بھی لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ○ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ○ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ﴾(6)

ترجمہ: "پس خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے، جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو دکھاوا کرتے ہیں۔"

یہ آیات ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ جب نماز جیسی عظیم عبادت بھی اگر ریا سے متاثر ہو جائے تو وہ خطرناک بن جاتی ہے، تو وہ اعمال جن کا مقصد ہی لوگوں کی تعریف حاصل کرنا ہو، ان کے بارے میں انسان کو کتنا محتاط ہونا چاہیے۔ پہلے زمانے میں انسان محدود حلقے میں دکھاوے کا شکار ہوتا تھا، لیکن آج ڈیجیٹل ذرائع نے اس دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے۔

اب ایک تصویر، ایک ویڈیو، ایک تقریر یا ایک خدمت کا اعلان چند لمحوں میں ہزاروں افراد تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ سہولت اگر صحیح نیت کے ساتھ استعمال ہو تو دعوت اور اصلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے، لیکن اگر مقصد صرف اپنی تعریف، شہرت اور مقبولیت حاصل کرنا ہو تو یہی ذریعہ ریا کا سبب بن سکتا ہے۔

یہاں ایک اہم فرق سمجھنا ضروری ہے:

اگر کسی خیر کے کام کو اس مقصد سے ظاہر کیا جائے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی ترغیب حاصل کریں، کسی ضرورت مند کی مدد ہو یا کسی مفید بات کو عام کیا جائے تو یہ درست مقصد ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر دل کا مقصد یہ ہو کہ لوگ مجھے نیک، بڑا یا ممتاز سمجھیں، تو یہ خطرناک کیفیت ہے۔ ڈیجیٹل دنیا میں کام کرنے والے ہر شخص کو اپنے دل کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے:

- اگر کوئی میری تعریف نہ کرے تو کیا میں یہ کام پھر بھی کروں گا؟
- اگر میرا نام ظاہر نہ ہو تو کیا مجھے خوشی ہوگی کہ خیر کا کام ہو گیا؟
- اگر کسی دوسرے کے ذریعے یہی بات پھیل جائے تو کیا میرا دل خوش رہے گا؟

یہ سوالات انسان کے اخلاص کا آئینہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللَّهُ بِهِ، وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللَّهُ بِهِ﴾(7)

ترجمہ: "جو شخص لوگوں کو سنانے کے لیے عمل کرے، اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت لوگوں کو سنا دے گا، اور جو دکھاوے کے لیے عمل کرے، اللہ تعالیٰ اس کا دکھاوا ظاہر کر دے گا۔"

یہ حدیث انسان کو خبردار کرتی ہے کہ دنیا کے سامنے اپنی تصویر بنانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حقیقت درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

ڈیجیٹل دور میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ انسان اپنی آواز کو بلند کرنے سے پہلے اپنے دل کی اصلاح کرے۔ سوشل میڈیا پر موجودگی سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت حاصل ہو۔

شہرت وقتی ہے، اخلاص دائمی ہے۔ تعریف محدود ہے، اللہ کی رضا لا محدود ہے۔ لوگوں کی نگاہ بدل سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

اسی اخلاص کی تعلیم ہمیں سیرتِ نبوی ﷺ میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اخلاص، تواضع اور عبدیت کا حسین ترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ وہ عظیم ہستی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا، جن کے ذکر کو قیامت تک کے لیے بلند کر دیا، اور جن کی اتباع کو اپنی

محبت کا ذریعہ قرار دیا۔ لیکن اس عظیم مقام کے باوجود آپ ﷺ کی زندگی میں عاجزی، انکساری اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کامل بندگی کا ایسا نمونہ نظر آتا ہے جو قیامت تک انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

یہی سیرتِ نبوی ﷺ کا وہ روشن پہلو ہے جو ڈیجیٹل شہرت کے دور میں انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ حقیقی عظمت ظاہری نمائش میں نہیں بلکہ اللہ کے سامنے جھکنے میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کو لوگوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنایا، بلکہ ہمیشہ اپنی شناخت کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سے جوڑا۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے مقام کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ﴾(8)

ترجمہ: "بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا۔"

غور کیجیے! اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے لیے سب سے پہلے لفظ "عبد" استعمال فرمایا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے بلند مقام بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا راز یہی تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی ذات کو نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو نمایاں کیا۔

لوگ فطری طور پر اپنے محبوبوں کی تعریف کرتے ہیں، اور صحابۂ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ سے بے مثال محبت تھی۔ لیکن آپ ﷺ نے ہمیشہ امت کو اعتدال کا راستہ دکھایا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ، فَقُولُوا عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ﴾(9)

ترجمہ: میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جیسے نصاریٰ نے ابنِ مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا۔ میں تو اللہ کا بندہ ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

یہ حدیث سیرتِ نبوی ﷺ کے ایک عظیم اصول کو واضح کرتی ہے کہ اسلام انسان کو عزت دیتا ہے، مگر انسان کو اپنی ذات کا پرستار بننے سے روکتا ہے۔

آج کے دور میں جب شخصیت سازی، ذاتی تشہیر اور اپنی تصویر کو نمایاں کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، یہ نبوی تعلیم ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اصل مقصد حق کو نمایاں کرنا ہے، اپنی ذات کو نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں فاتحین کی ایک طویل فہرست موجود ہے، لیکن فتح کے وقت رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل سب سے منفرد ہے۔

فتحِ مکہ کے موقع پر وہ شہر آپ ﷺ کے سامنے تھا جہاں سے آپ ﷺ کو تکالیف دی گئیں، مخالفت کی گئی اور ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر کوئی دنیاوی حکمران ہوتا تو اپنی قوت اور کامیابی کا اظہار کرتا، لیکن رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور شکر کے ساتھ داخل ہوئے۔

سیرت کی روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ فتح کے موقع پر انتہائی انکساری کے ساتھ تشریف لے گئے، آپ کا سر مبارک اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا ہوا تھا۔

یہ منظر اعلان کر رہا تھا کہ: جس دل میں اللہ کی عظمت ہوتی ہے، وہاں اپنی بڑائی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ رسول اللہ ﷺ صرف مجمع میں ہی نہیں بلکہ گھر کے اندر بھی تواضع کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیا کرتے تھے؟

آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

" آپ ﷺ اپنے گھر والوں کے کام میں مشغول رہتے تھے، اور جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔" (صحیح بخاری)

یہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کے سامنے عرب کے سردار حاضر ہوتے تھے، لیکن گھر میں آپ ﷺ ایک نرم مزاج، محبت کرنے والے اور خدمت گزار انسان کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ عظمت کا تعلق سہولتوں، ظاہری شان یا لوگوں کی توجہ سے نہیں، بلکہ اخلاق اور کردار سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا مرکز ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ﴾ (10)

ترجمہ: "آپ فرما دیجیے: یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، بصیرت کے ساتھ۔"

یہ آیت دعوت کے اسلوب کو واضح کرتی ہے کہ داعی کا کام لوگوں کو اپنی ذات کی طرف متوجہ کرنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ آج جب ایک شخص اپنی بات کو چند لمحوں میں دنیا تک پہنچا سکتا ہے، اسے رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم کو سامنے رکھنا چاہیے:

- ❖ میری کوشش کا مرکز اللہ کا پیغام ہو، میری ذات نہیں۔
- ❖ میری شہرت مقصد نہ ہو، اگر خیر پھیل جائے تو یہی کامیابی ہے۔
- ❖ میری پہچان تعریفوں سے نہیں، میرے کردار سے ہو۔
- ❖ میری مقبولیت لوگوں میں نہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہو۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ:

عظمت خود کو بڑا ثابت کرنے میں نہیں، بلکہ اللہ کے سامنے جھک جانے میں ہے۔ بلندی لوگوں کی نگاہوں میں نہیں، بلکہ اللہ کی رضا میں ہے۔ اصل شہرت وہ نہیں جو دنیا میں پھیل جائے، بلکہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو جائے۔

یہی نبوی اصول ڈیجیٹل شہرت کے فتنے سے بچنے کے لیے سب سے مضبوط رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے انسان کو صرف عبادات کا طریقہ نہیں سکھایا بلکہ زندگی کے ہر شعبے کے لیے رہنمائی عطا فرمائی ہے۔ دعوت، ابلاغ، گفتگو، تعلقات اور ذرائعِ رابطہ؛ ہر میدان میں سیرتِ نبوی ﷺ ایک کامل نمونہ پیش کرتی ہے۔

آج کے ڈیجیٹل دور میں انسان کے پاس پیغام پہنچانے کے بے شمار ذرائع موجود ہیں۔ ایک تحریر، ایک ویڈیو، ایک تقریر یا ایک تصویر چند لمحوں میں ہزاروں افراد تک پہنچ سکتی ہے۔ ایسے دور میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ابلاغ کا انداز سیرتِ نبوی ﷺ کے اصولوں کے مطابق ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں پیغامِ حق پہنچانے کو اولین مقصد بنایا، لیکن اس کے ساتھ حکمت، اخلاص، حسنِ اخلاق اور مخاطب کی رعایت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا بنیادی مقصد انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنا تھا۔ آپ ﷺ

نے کبھی اپنی ذات کی بڑائی، اپنی شہرت یا اپنی مقبولیت کے لیے دعوت نہیں دی، بلکہ ہمیشہ توحید، ہدایت اور اصلاح کی طرف بلایا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (11)

ترجمہ: "اور انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔"

یہ آیت داعی کے لیے بنیادی اصول فراہم کرتی ہے کہ دعوت کا مرکز اللہ تعالیٰ کی رضا ہو، نہ کہ اپنی ذات کی مقبولیت۔ رسول اللہ ﷺ کی گفتگو اور دعوت میں حکمت، نرمی اور دلوں کو جوڑنے کا انداز نمایاں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (12)

ترجمہ: "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلائیے۔"

یہ آیت آج کے ڈیجیٹل ماحول میں بھی مکمل رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ کسی پوسٹ، تبصرے یا ویڈیو میں سختی، تحقیر، طنز اور جذباتی ردعمل کے بجائے حکمت اور حسنِ اخلاق کو اختیار کرنا نبوی طریقہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کی گفتگو واضح اور الگ الگ ہوتی تھی، ہر سننے والا اسے سمجھ لیتا تھا۔ (13)

آپ ﷺ نہ غیر ضروری طوالت اختیار فرماتے تھے اور نہ ایسی گفتگو فرماتے جس میں مقصدیت نہ ہو۔ یہ اصول آج کے ڈیجیٹل ابلاغ میں بھی اہم ہے۔ مختصر مگر جامع، مؤثر مگر بااخلاق، واضح مگر حکمت بھری گفتگو ہی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

ڈیجیٹل دنیا میں سب سے بڑا مسئلہ تیزی سے پھیلنے والی غیر مصدقہ معلومات کا ہے۔ اسلام نے ہمیشہ خبر کی تحقیق اور ذمہ داری کی تعلیم دی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ (14)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔"

یہ آیت سوشل میڈیا استعمال کرنے والے ہر مسلمان کے لیے ایک واضح اصول ہے کہ کسی بھی خبر، تصویر یا دعوے کو آگے بڑھانے سے پہلے تحقیق ضروری ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اختلاف کے باوجود اخلاق کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ ﷺ کا اندازِ گفتگو دلوں کو جوڑنے والا تھا۔

قرآنِ کریم میں آپ ﷺ کے اخلاق کی گواہی دی گئی:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورۃ القلم:4)

ترجمہ: "اور بے شک آپ عظیم اخلاق پر ہیں۔"

آج ڈیجیٹل دنیا میں گفتگو کے اندر تلخی، تمسخر، الزام اور بدزبانی عام ہو رہی ہے۔ ایسے ماحول میں سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ حق بات بھی حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش کی جائے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں آج کے ابلاغ کے چند بنیادی اصول یہ ہیں:

1۔ نیت کی اصلاح: ہر تحریر، تقریر اور ویڈیو سے پہلے مقصد واضح ہو کہ اللہ کی رضا مطلوب ہے۔

2۔ حق اور تحقیق: صرف وہی بات پیش کی جائے جو درست اور فائدہ مند ہو۔

3۔ حکمت اور نرمی: مخاطب کو عزت دی جائے، کیونکہ دل جیت کر بات زیادہ اثر کرتی ہے۔

4۔ شخصیت کے بجائے پیغام کو نمایاں کرنا: دعوت کا مرکز دین ہو، داعی کی ذات نہیں۔

5۔ اخلاقی ذمہ داری: ہر لفظ اور ہر تصویر کے اثرات کو سامنے رکھا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا دعوتی منہج ہمیں سکھاتا ہے کہ ابلاغ صرف الفاظ پہنچانے کا نام نہیں، بلکہ دلوں تک خیر پہنچانے کا نام ہے۔ڈیجیٹل دنیا میں کامیاب داعی وہ نہیں جس کی آواز سب سے زیادہ بلند ہو، بلکہ وہ ہے جس کے پیغام میں اخلاص، حکمت اور خیر خواہی ہو۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا اصول یہ ہے کہ انسان خود نمایاں ہونے کے بجائے حق کو نمایاں کرے؛ اپنی تعریف کے بجائے اللہ کی حمد کو عام کرے، اور شہرت کے بجائے ہدایت کو مقصد بنائے۔

ڈیجیٹل دور میں ہر انسان کسی نہ کسی درجے میں ابلاغ کا حصہ بن چکا ہے۔ خاص طور پر علماء، خطباء، مصنفین، داعیانِ دین اور نوجوان نسل کے پاس یہ موقع موجود ہے کہ وہ اپنی آواز، علم اور صلاحیتوں کو خیر کے فروغ کے

لیے استعمال کریں۔ لیکن جس قدر اثر و رسوخ بڑھتا ہے، اسی قدر ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ سوشل میڈیا پر موجودگی صرف مقبولیت کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک امانت ہے۔ جو شخص لوگوں تک پہنچتا ہے، اس کے الفاظ، انداز اور طرزِ عمل کا اثر دوسروں کے دلوں اور سوچ پر پڑتا ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں ایسے ابلاغ کے لیے واضح اصول عطا کرتی ہے کہ کس طرح پیغام پہنچایا جائے اور کس طرح دل کو شہرت کے فتنوں سے محفوظ رکھا جائے۔ علماء انبیائے کرام کے وارث ہیں۔ ان کی بنیادی ذمہ داری علم کو پہنچانا، حق کی وضاحت کرنا اور لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔ لیکن دعوت کا یہ عظیم مقام اسی وقت بابرکت بنتا ہے جب اس کے ساتھ اخلاص، تقویٰ اور تواضع شامل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً﴾(15)

ترجمہ: "میری طرف سے پہنچاؤ، اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔"

یہ حدیث دعوت کی ذمہ داری کو واضح کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پہنچانے والا اپنی ذات کو نہیں بلکہ اللہ کے دین کو نمایاں کرے۔ ایک داعی کے لیے سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ لوگ اس کی بات سنیں، اس کی تعریف کریں اور اس کی مقبولیت بڑھنے لگے، تو وہ اس مقبولیت کو اپنی کمال نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے۔ رسول اللہ ﷺ علم، مقام اور عظمت کے باوجود سب سے زیادہ متواضع تھے۔

آپ ﷺ صحابۂ کرام کے درمیان ایسے بیٹھتے کہ کوئی اجنبی شخص آتا تو پہچان نہ پاتا کہ مجلس میں اللہ کے رسول کون ہیں۔ یہ تواضع ہمیں سبق دیتی ہے کہ علم انسان کو بڑا نہیں بناتا بلکہ اللہ کے سامنے زیادہ جھکنے والا بناتا ہے۔

آج اگر کسی عالم یا داعی کو ڈیجیٹل دنیا میں شہرت حاصل ہو جائے تو اسے نبوی طریقے کو سامنے رکھنا چاہیے: تعریف سے خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ تنقید پر صبر کا دامن نہ چھوڑے۔ اپنی ذات کے بجائے دین کی خدمت کو ترجیح دے۔ مقبولیت کو آزمائش سمجھے، اعزاز نہیں۔

نوجوان آج کے دور میں سب سے زیادہ ڈیجیٹل ذرائع سے وابستہ ہیں۔ ان کے ہاتھ میں موبائل فون صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ علم، دعوت اور تعمیرِ شخصیت کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ نوجوانوں کو مقصد والی زندگی کا درس دیتی ہے۔ صحابۂ کرام کی نوجوان نسل نے اپنی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے وقف کر

دیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ، جو مکہ کے خوش حال نوجوانوں میں شمار ہوتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد دعوت و تبلیغ کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ مدینہ منورہ میں اسلام کی تعلیم پہنچانے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کی خدمات تاریخ کا روشن باب ہیں۔

یہ واقعہ نوجوانوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اصل پہچان لباس، شہرت اور ظاہری چمک سے نہیں بلکہ مقصد، کردار اور خدمت سے بنتی ہے۔ اگر سوشل میڈیا کو سیرتِ نبوی ﷺ کے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ خیر کا عظیم ذریعہ بن سکتا ہے۔ مثلاً: قرآن و حدیث کی تعلیم عام کرنا۔ علمی مضامین اور مفید تحریریں نشر کرنا۔ نوجوانوں کی دینی و اخلاقی تربیت کرنا۔ معاشرتی اصلاح کے لیے مثبت پیغام دینا۔ لوگوں کی مشکلات کے حل میں مدد کرنا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مقصد واضح ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا اصول تھا کہ: پیغام اہم ہے، پیغام پہنچانے والے کی ذات نہیں۔ انسان کو جب لوگوں کی محبت اور قبولیت حاصل ہوتی ہے تو اس کا امتحان شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ شہرت کبھی کبھی انسان کے اندر چھپی ہوئی کمزوریوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔

سلف صالحین شہرت سے ڈرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت ہو، لیکن ان کے دلوں میں خود پسندی پیدا نہ ہو۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعا مشہور ہے:

"اے اللہ! مجھے ان لوگوں کے گمان سے بہتر بنا دے جو میرے بارے میں جانتے ہیں، اور میری ان باتوں کو بخش دے جنہیں لوگ نہیں جانتے۔"

یہ دعا ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان اپنی تعریفوں پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اپنی اصلاح کی فکر کرے۔

ڈیجیٹل دور کے لیے چند عملی اصول

1۔ پوسٹ کرنے سے پہلے نیت کا جائزہ۔ کیا یہ بات اللہ کی رضا کے لیے ہے یا صرف توجہ حاصل کرنے کے لیے؟

2۔ خاموش عمل کی عادت۔ کچھ نیکیاں ایسی بھی ہوں جنہیں صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہو۔

3۔ علم کے بغیر اظہار سے بچنا۔ ہر موضوع پر رائے دینا ضروری نہیں۔

4۔ اختلاف میں ادب قائم رکھنا۔ حق بات بھی حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش کی جائے۔

5۔اپنی ذات کو مرکز نہ بنانا۔لوگوں کو اللہ، رسول ﷺ اور حق کی طرف بلانا اصل مقصد ہو۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان کی اصل کامیابی اس میں نہیں کہ دنیا اسے کتنی پہچانتی ہے، بلکہ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتنا قبول فرماتا ہے۔ڈیجیٹل دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شہرت کے پیچھے نہ بھاگیں، بلکہ خدمت، اخلاص اور خیر کے راستے پر چلیں۔

جو شخص اللہ کے لیے کام کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے کام میں برکت عطا فرماتا ہے۔جو اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے بجائے حق کو نمایاں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذکر کو عزت کے ساتھ بلند فرماتا ہے۔ڈیجیٹل دور نے انسان کے طرزِ زندگی، رابطوں اور اظہار کے انداز کو یکسر بدل دیا ہے۔ آج ہر شخص اپنے خیالات، سرگرمیوں اور صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔یہ آزادی جہاں ایک عظیم موقع ہے،وہیں ایک بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ایک مسلمان کے لیے اصل سوال یہ نہیں کہ وہ جدید ذرائع استعمال کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو کس مقصد، کس نیت اور کس اخلاق کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں ایسے انسان کی تربیت کرتی ہے جو دنیا کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے دل کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھے،لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اخلاص کو اپنا شعار بنائے اور مقبولیت ملنے کے باوجود عاجزی کو نہ چھوڑے۔ڈیجیٹل دنیا کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ انسان کی توجہ مسلسل لوگوں کی طرف رہنے لگتی ہے۔وہ یہ دیکھنے لگتا ہے کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں، کیا پسند کر رہے ہیں اور کیا تبصرہ کر رہے ہیں۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں سکھاتی ہے کہ مومن کا دل سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہونا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"اگر تم اللہ پر ایسا توکل کرو جیسا توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تمہیں اسی طرح رزق عطا فرمائے گا جیسے پرندوں کو عطا فرماتا ہے،وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔(16)

یہ حدیث انسان کو اعتماد، یقین اور اللہ پر بھروسے کا درس دیتی ہے۔اسی طرح ڈیجیٹل دنیا میں بھی مسلمان کو لوگوں کی توجہ کا محتاج نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنا مقصد بنانا چاہیے۔

آج کا انسان اپنی ظاہری تصویر بنانے میں بہت مشغول ہے، لیکن سیرتِ نبوی ﷺ انسان کو اپنے اندر کی اصلاح کی دعوت دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"خبردار! جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے، اور جب وہ خراب ہو جائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے، سن لو! وہ دل ہے۔"(17)

ڈیجیٹل دور میں سب سے زیادہ ضرورت دل کی حفاظت کی ہے، کیونکہ انسان کا اصل مقام اس کے فالوورز، تصاویر یا شہرت سے نہیں بلکہ اس کے دل کے اخلاص سے متعین ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف حسنِ اخلاق تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾(18)

ترجمہ: اور بے شک آپ عظیم اخلاق پر ہیں۔

ایک مسلمان کی ڈیجیٹل موجودگی بھی اس کے اخلاق کی عکاس ہونی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ:

گفتگو میں شائستگی اختیار کرے۔ اختلاف میں تہذیب نہ چھوڑے۔ کسی کی تحقیر نہ کرے۔ جھوٹی خبر نہ پھیلائے۔ دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال رکھے۔ کیونکہ زبان سے نکلنے والے الفاظ کی طرح ڈیجیٹل دنیا میں لکھے گئے الفاظ بھی اثر رکھتے ہیں۔

ڈیجیٹل دور میں ہر چیز کو ظاہر کرنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ ایسے ماحول میں ضروری ہے کہ مسلمان کچھ اعمال ایسے بھی کرے جنہیں صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کی فضیلت بیان فرمائی جن کی نیکیاں دکھاوے سے پاک ہوتی ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں جگہ پانے والوں میں ایک شخص وہ بھی ہے: جس نے صدقہ کیا اور اسے اتنا چھپایا کہ بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہوا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔(19)

یہ تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ ہر خیر کا اعلان ضروری نہیں، بعض نیکیاں چھپانے میں زیادہ روحانی فائدہ ہے۔

اسلام انسان کو بے مقصد زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہر انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس کی صلاحیتیں کس کام کے لیے ہیں۔

نوجوان اگر اپنی توانائی کو صرف تفریح، نمائش اور مقبولیت کے حصول میں لگا دیں تو یہ ایک بڑا نقصان ہے۔ لیکن اگر یہی صلاحیتیں علم، دعوت، تحقیق، خدمت اور اصلاح کے لیے استعمال ہوں تو یہی نوجوان امت کا سرمایہ بن سکتے ہیں۔

سیرتِ نبوی ﷺ میں نوجوان صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم کی زندگیاں اس کی روشن مثال ہیں۔ انہوں نے اپنی جوانی کو مقصد، ایمان اور خدمت کے لیے وقف کیا۔

ایک مثالی مسلمان کو چاہیے کہ وہ ڈیجیٹل دنیا میں داخل ہوتے وقت چند اصولوں کا عہد کرے:

میں اپنی بات حق اور خیر کے لیے استعمال کروں گا۔

میں اپنی شہرت کے بجائے دین کی سربلندی کو مقصد بناؤں گا۔

میں لوگوں کی تعریف سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو اہمیت دوں گا۔

میں اپنے الفاظ کو امانت سمجھوں گا۔

میں سیرتِ نبوی ﷺ کے اخلاق کو اپنی آن لائن زندگی کا حصہ بناؤں گا۔

ڈیجیٹل دور میں کامیاب مسلمان وہ نہیں جس کی آواز سب سے زیادہ پھیلی ہوئی ہو، بلکہ وہ ہے جس کی زندگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مقبول ہو۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں سکھاتی ہے:

شہرت مانگنے سے نہیں، خدمت کرنے سے ملتی ہے۔ عزت دکھاوے سے نہیں، اخلاص سے ملتی ہے۔ دلوں پر اثر الفاظ کی کثرت سے نہیں، کردار کی پاکیزگی سے ہوتا ہے۔ اگر مسلمان سیرتِ نبوی ﷺ کے اصولوں کو اختیار کرلے تو ڈیجیٹل دنیا فتنہ نہیں بلکہ خیر، دعوت اور اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

ڈیجیٹل دور انسان کے لیے امکانات اور آزمائشوں دونوں کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف یہ علم، دعوت، اصلاح اور خیر کے فروغ کا وسیع میدان فراہم کرتا ہے، تو دوسری طرف یہی میدان نفس، خود نمائی اور شہرت کی خواہش کو بڑھانے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

اس لیے اصل مسئلہ ڈیجیٹل ذرائع کا استعمال نہیں، بلکہ دل کی کیفیت اور نیت کا مسئلہ ہے۔ ایک ہی ذریعہ کسی کے لیے صدقۂ جاریہ بن سکتا ہے اور کسی کے لیے نفس کی تسکین کا سامان۔ سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ انسان دنیا کے وسائل استعمال کرے، لیکن اپنے دل کو ان وسائل کا غلام نہ بننے دے۔ انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ نہیں کہ دنیا اسے پہچان لے، بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالے۔ دنیا کی تعریف محدود ہے، لوگوں کی رائے بدلتی رہتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا دائمی کامیابی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس حقیقت کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی شہرت کا مطالبہ نہیں کیا، کبھی لوگوں کی تعریف کو اپنا مقصد نہیں بنایا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی اور بندوں کی خیر خواہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾(20)

ترجمہ: اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ ﷺ نے اپنا ذکر بلند کیا، بلکہ فرمایا کہ ہم نے بلند کیا۔

یہ اصول ہر مسلمان کے لیے رہنمائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے کام میں برکت عطا فرماتا ہے اور اسے ایسی عزت عطا فرماتا ہے جو صرف ظاہری شہرت سے حاصل نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہت سے ایسے اعمال ملتے ہیں جو آپ ﷺ نے خاموشی سے انجام دیے۔ آپ ﷺ غریبوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کی مدد فرماتے، بیماروں کی عیادت کرتے، لوگوں کے مسائل حل فرماتے، لیکن آپ ﷺ کا مقصد کبھی یہ نہیں تھا کہ لوگ آپ کی تعریف کریں۔ یہی اخلاص تھا جس نے آپ ﷺ کے کردار کو قیامت تک کے لیے زندہ کر دیا۔ آج کے دور میں ضرورت ہے کہ مسلمان ایسی نیکیاں بھی کرے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہو، کیونکہ یہی اعمال دل کو ریا اور خود نمائی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ڈیجیٹل شہرت کا علاج: چند نبوی اصول

1۔ نیت کی مسلسل اصلاح

ہر تحریر، ہر ویڈیو، ہر تقریر اور ہر پیغام سے پہلے انسان اپنے دل سے سوال کرے:

کیا میں اللہ کی رضا چاہتا ہوں یا لوگوں کی توجہ؟

اگر یہ کام مشہور نہ ہو تو کیا میں اسے پھر بھی انجام دوں گا؟

یہ سوالات انسان کو اپنے نفس کا محاسبہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

2۔ تواضع اختیار کرنا

مقبولیت ملنے کے بعد سب سے بڑا خطرہ تکبر کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ (صحیح مسلم)

لہٰذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ عزت عطا فرمائے، اسے اور زیادہ عاجزی اختیار کرنی چاہیے۔

3۔ علم اور عمل میں توازن

ڈیجیٹل دنیا میں معلومات کی فراوانی ہے، لیکن صرف معلومات کافی نہیں۔ اسلام علم کے ساتھ عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی علم، عمل، اخلاق اور عبادت کا کامل امتزاج تھی۔ ایک مسلمان کی پہچان صرف اس کی باتوں سے نہیں بلکہ اس کے کردار سے ہونی چاہیے۔

4۔ وقت کی حفاظت

ڈیجیٹل دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ وقت ہے، اور یہی سب سے بڑا نقصان بھی بن سکتا ہے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے وقت کو مقصد کے ساتھ استعمال کرے۔ علم حاصل کرے، خیر پھیلائے، اپنے خاندان اور معاشرے کے حقوق ادا کرے، اور فضول مشغولیات سے بچے۔ آج ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم ڈیجیٹل دنیا میں کس کردار کے ساتھ موجود ہوں گے۔ کیا ہم صرف اپنی شخصیت دکھانے کے لیے موجود ہوں گے؟ یا اللہ تعالیٰ کے پیغام، علم، خیر اور اصلاح کے سفیر بنیں گے؟ سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں دوسرا راستہ دکھاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سکھایا: مقبولیت کے بجائے اخلاص تلاش کرو۔ تعریف کے بجائے اللہ کی رضا تلاش کرو۔ اپنی ذات کے بجائے حق کو نمایاں کرو۔ دنیا کی نگاہ کے بجائے آخرت کی کامیابی کو مقصد بناؤ۔

ڈیجیٹل شہرت ایک آزمائش ہے۔ یہ انسان کو بلندی بھی دے سکتی ہے اور گراوٹ کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ فیصلہ اس بات سے ہو گا کہ انسان اس نعمت کو کس نیت اور کس طریقے سے استعمال کرتا ہے۔

اگر ڈیجیٹل ذرائع سیرتِ نبوی ﷺ کے اصولوں کے تابع ہو جائیں تو یہ دعوت، تعلیم، اصلاح اور خیر کے عظیم ذرائع بن سکتے ہیں۔ اور اگر یہ نفس، ریا اور خود نمائی کے تابع ہو جائیں تو یہی ذرائع انسان کے اخلاص اور روحانی سکون کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔

لہٰذا ہر مسلمان کو یاد رکھنا چاہیے:

اصل کامیابی یہ نہیں کہ لوگ ہمیں جانیں، بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پہچان لے۔ اصل عزت یہ نہیں کہ ہمارا نام دنیا میں مشہور ہو، بلکہ یہ ہے کہ ہمارا عمل اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو۔ اصل شہرت یہ نہیں کہ ہمارا ذکر زبانوں پر ہو، بلکہ یہ ہے کہ ہمارا ذکر اللہ تعالیٰ کے ہاں خیر کے ساتھ ہو۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد یہ نہیں کہ وہ دنیا میں کتنا نمایاں ہو، بلکہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنا مقبول ہو۔ دنیا کی نگاہیں محدود ہیں، لوگ صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ دلوں کے راز اور اعمال کی حقیقت کو جانتا ہے۔

ڈیجیٹل دور نے انسان کو اپنی پہچان بنانے کے بے شمار مواقع دیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی پیدا ہوا ہے کہ انسان اپنی اصل شخصیت بنانے کے بجائے صرف ایک ظاہری تصویر بنانے میں مشغول ہو جائے۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یہ عظیم سبق دیتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو نمائش کا میدان نہ بنائے بلکہ کردار کی تعمیر کا ذریعہ بنائے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا، لیکن آپ ﷺ کی زندگی میں عاجزی، رحم، محبت اور انکساری کا ایسا نمونہ ملتا ہے جو قیامت تک انسانیت کے لیے رہنما ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ، فَقُولُوا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ﴾(21)

ترجمہ: میں تو اللہ کا بندہ ہوں، پس مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

یہ اعلان اس بات کی علامت ہے کہ اسلام میں سب سے بلند مقام بھی عبدیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

آج کے ڈیجیٹل دور میں جب انسان اپنی شناخت، شہرت اور مقبولیت کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے، سیرتِ نبوی ﷺ اسے یاد دلاتی ہے کہ اصل پہچان بندگیِ الٰہی ہے۔ دنیا میں ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا نام باقی رہے، لوگ اسے یاد رکھیں اور اس کے کاموں کو سراہیں۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ صرف وہی نام باقی رہتے ہیں جن کے پیچھے اخلاص، خدمت اور خیر کا جذبہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے نام کو بلند کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذکر کو ایسا بلند فرمایا کہ قیامت تک کروڑوں انسان آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾(22)

ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ وہ عزت ہے جو کسی دنیاوی منصوبہ بندی یا تشہیر سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

آج کے مسلمان کو چاہیے کہ وہ جدید ذرائع کو ترک نہ کرے بلکہ انہیں سیرتِ نبوی ﷺ کے اصولوں کے مطابق استعمال کرے۔ اس کا ڈیجیٹل کردار درج ذیل صفات کا حامل ہونا چاہیے:

1۔ اخلاص -- ہر پیغام اور ہر کوشش کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہو۔

2۔ صداقت -- جھوٹی خبر، غیر مصدقہ بات اور غلط معلومات سے بچا جائے۔

3۔ حکمت -- بات کو ایسے انداز میں پیش کیا جائے جو دلوں کو قریب کرے۔

4۔ تواضع -- کامیابی اور مقبولیت کے باوجود خود کو اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھا جائے۔

5۔ خیر خواہی -- دوسروں کی اصلاح، فائدہ اور رہنمائی کو مقصد بنایا جائے۔

ایک مخلص انسان کی کوشش یہ نہیں ہوتی کہ لوگ اسے یاد رکھیں، بلکہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے خیر باقی رہے۔ ایک عالم کی اصل کامیابی یہ نہیں کہ کتنے لوگ اسے جانتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ کتنے دلوں میں علم کی روشنی پیدا ہوئی۔ ایک مصنف کی کامیابی یہ نہیں کہ کتنی کتابیں مشہور ہوئیں، بلکہ یہ ہے کہ کتنی زندگیاں بدلیں۔ ایک داعی کی کامیابی یہ نہیں کہ کتنے لوگ اسے سنتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ کتنے لوگ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتے ہیں۔

ڈیجیٹل دنیا ایک آئینہ ہے۔ اس میں انسان اپنی تصویر بھی دکھا سکتا ہے اور اپنی حقیقت بھی ظاہر کر سکتا ہے۔ اگر انسان کا مقصد صرف اپنی تعریف حاصل کرنا ہو تو یہ دنیا اسے کچھ وقت کے لیے شہرت دے سکتی ہے، لیکن اگر مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور مخلوق کی بھلائی ہو تو یہی ذریعہ اس کے لیے صدقۂ جاریہ بن سکتا ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یہی سبق دیتی ہے: اپنی ذات کو نہیں، حق کو نمایاں کرو۔ اپنی شہرت کو نہیں، اللہ کی رضا کو مقصد بناؤ۔ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں جگہ بنانے کی فکر کرو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص، تواضع، حسنِ اخلاق اور سیرتِ نبوی ﷺ کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

مصادر و مراجع

(1) سورۃ الحجرات:13
(2) سورۃ فاطر:10
(3) صحیح بخاری، صحیح مسلم
(4) سورۃ البینۃ:5
(5) مسند احمد
(6) سورۃ الماعون:4-6
(7) صحیح بخاری، صحیح مسلم
(8) سورۃ الفرقان:1
(9) صحیح بخاری
(10) سورۃ یوسف:108
(11) سورۃ البینۃ:5
(12) سورۃ النحل:125
(13) سنن ابی داؤد
(14) سورۃ الحجرات:6
(15) صحیح بخاری
(16) سنن ترمذی
(17) صحیح بخاری، صحیح مسلم
(18) سورۃ القلم:4
(19) صحیح بخاری، صحیح مسلم

آن لائن پرائیویسی اور اسلامی اقدار

عالمہ عافیہ عمران

انسان فطرتاً ایک سماجی مخلوق ہے جسے دوسروں کے ساتھ رابطے، تبادلۂ خیال اور تعلق کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی جبلت میں اپنی خلوت اور نجی زندگی کو محفوظ رکھنے کا جذبہ بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ ماضی میں انسان کی نجی اور عوامی زندگی کے درمیان ایک واضح اور مضبوط لکیر موجود تھی۔ گھر کی چار دیواری کو ایک ایسا محفوظ حصار سمجھا جاتا تھا جہاں بیرونی دنیا کی مداخلت ناممکن تصور ہوتی تھی اور انسان اپنے خاندانی معاملات میں مکمل طمانیت محسوس کرتا تھا۔ تاہم، موجودہ دور کے مواصلاتی ذرائع، سمارٹ فونز اور سوشل میڈیا کے بے پناہ پھیلاؤ نے اس تفریق کو بڑی حد تک مٹا دیا ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ہماری نجی محفلیں، خاندانی معاملات، خوشی و غمی کے لمحات اور ذاتی مصروفیات محض چند کلکس کے فاصلے پر پوری دنیا کے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود ہیں۔ بظاہر یہ ایک عالمی رابطے اور جدیدیت کی دلکش شکل ہے، لیکن اگر اس رجحان کو اسلامی تعلیمات، انسانی نفسیات اور معاشرتی استحکام کے کڑے معیار پر پرکھا جائے تو یہ طرزِ عمل ہماری عزت، حیا اور ذہنی سکون کے لیے کئی خاموش مگر سنگین خطرات کو جنم دے رہا ہے۔

اسلام کا خاندانی اور سماجی نظام جن بنیادی اقدار پر استوار ہے، ان میں حیا اور پردہ کو مرکزی اور عباداتی حیثیت حاصل ہے۔ جب ہم قرآنِ مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو سورۂ نور کی آیت 31 میں اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ملتا ہے کہ:

”اور ایمان والی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی عصمت کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو خود ظاہر ہو جائے۔“

اس قرآنی حکم کو محض لباس کے ظاہری پہلو تک محدود کر دینا اس کی وسعت کو کم کرنے کے مترادف ہو گا۔ در حقیقت، یہ آیت ایک مکمل طرزِ حیات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں انسان کی شخصیت، اس کا خاندانی وقار اور اس کی نجی زندگی کا تحفظ بدرجہ اُتم شامل ہے۔ پردہ صرف جسم کو چھپانے کا نام نہیں، بلکہ یہ گھر کے بھید، خاندانی رازوں اور انفرادی خلوت کو غیروں کی نگاہوں سے بچانے کا ایک خدائی نظام ہے۔ جب ہم سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز پر اپنی ذات اور گھر والوں کی بلا ضرورت نمائش کرتے ہیں، تو نادانستہ طور پر ہم اس روحانی اور اخلاقی حصار کو توڑ رہے ہوتے ہیں جو اسلام نے ہماری خلوت کے تحفظ کے لیے قائم کیا ہے۔

آج کے مادہ پرست معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگ اپنی ذاتی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کو محض دوسروں کی توجہ، دادِ تحسین اور وقتی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے عام کر رہے ہیں۔ روزمرہ کے معمولات، دستر خوان پر سجے کھانوں کی تصاویر، سفر کی تفصیلات سے لے کر بچوں کی معصوم حرکات تک، ہر چیز کو اسکرین کی زینت بنا دیا گیا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف انسان کو ایک مستقل نفسیاتی دباؤ اور مسابقت کی دوڑ میں مبتلا رکھتا ہے بلکہ خاندانی رازداری کو بھی بری طرح مجروح کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

"حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو حیا کا تقاضا صرف یہ نہیں کہ انسان کا لباس باوقار ہو، بلکہ اس کی گفتگو، اس کے روزمرہ کے رویے اور آج کے دور میں اس کے ڈیجیٹل وجود میں بھی وہ شرم و حیا، وقار اور احتیاط جھلکنی چاہیے۔

مزید برآں، اپنی نجی زندگی کی بے تحاشا نمائش کئی معاشرتی اور روحانی امراض کو بھی جنم دیتی ہے۔ دینِ اسلام میں نظرِ بد اور حسد کے حوالے سے بڑی واضح تنبیہات موجود ہیں اور انہیں برحق قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم اپنی خوشیوں، کامیابیوں اور خاندانی سکون کی تصاویر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، تو ضروری نہیں کہ دیکھنے والی ہر آنکھ محبت اور شفقت کی ہو۔ بہت سے لوگ احساسِ کمتری یا حسد کا شکار ہو سکتے ہیں، اور یہ نادانستہ نمائش خود

ہمارے اپنے لیے نظرِ بد اور خاندانی انتشار کا سبب بن سکتی ہے۔ اسلام ہمیں اعتدال اور سادگی کا درس دیتا ہے اور بلاوجہ کی نمود و نمائش سے سختی سے منع کرتا ہے۔

ہمیں یہ تلخ اور تکنیکی حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں شیئر کی گئی کوئی بھی چیز کبھی مکمل طور پر محو نہیں ہوتی۔ اسے باآسانی محفوظ کیا جاسکتا ہے، سیاق و سباق سے ہٹا کر پیش کیا جاسکتا ہے اور غیر اخلاقی یا مجرمانہ مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دنیاوی قانون جسے آج کے ترقی یافتہ دور میں پرائیویسی کا حق کہہ کر متعارف کروایا جارہا ہے اور جس کے تحفظ کے لیے روزانہ نئے قوانین وضع کیے جارہے ہیں، اسلام نے اسے صدیوں پہلے امانت، پردہ پوشی اور ستر کے جامع تصور کے ذریعے پیش کر دیا تھا۔ انسان کی ذاتی زندگی اور اس کا خاندان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک امانت ہے، اور اس امانت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اسے غیر متعلقہ افراد کی نگاہوں، تجسس اور مداخلت سے بچا کر رکھا جائے۔

جدید ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کا استعمال بذاتِ خود کوئی ممنوع یا برا عمل نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ اس کے بے دریغ، غیر محتاط اور لاپرواہ استعمال کا ہے۔ ایک باشعور اور ذمہ دار مسلمان کی حیثیت سے یہ امر ناگزیر ہے کہ ہم سوشل میڈیا کو اپنی ذات کی غیر ضروری نمائش اور سستی شہرت کا ذریعہ بنانے کے بجائے، اسے علم، خیر، دین کی دعوت اور مثبت افکار کے فروغ کے لیے استعمال کریں۔ ہماری اصل کامیابی اس میں ہرگز نہیں کہ ورچوئل دنیا (Virtual World) کے سراب میں ہمارے کتنے فالوورز یا مداح ہیں، بلکہ حقیقی اور ابدی کامیابی اس میں ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عزت، حیا اور تقویٰ کی کس حد تک حفاظت کی۔ جب ہم اپنی آن لائن زندگی کو ان پختہ اخلاقی اور دینی اصولوں کے تابع کر لیتے ہیں، تو ہم جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی رازداری، خاندانی سکون اور دینی تشخص، دونوں کو مکمل طور پر محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

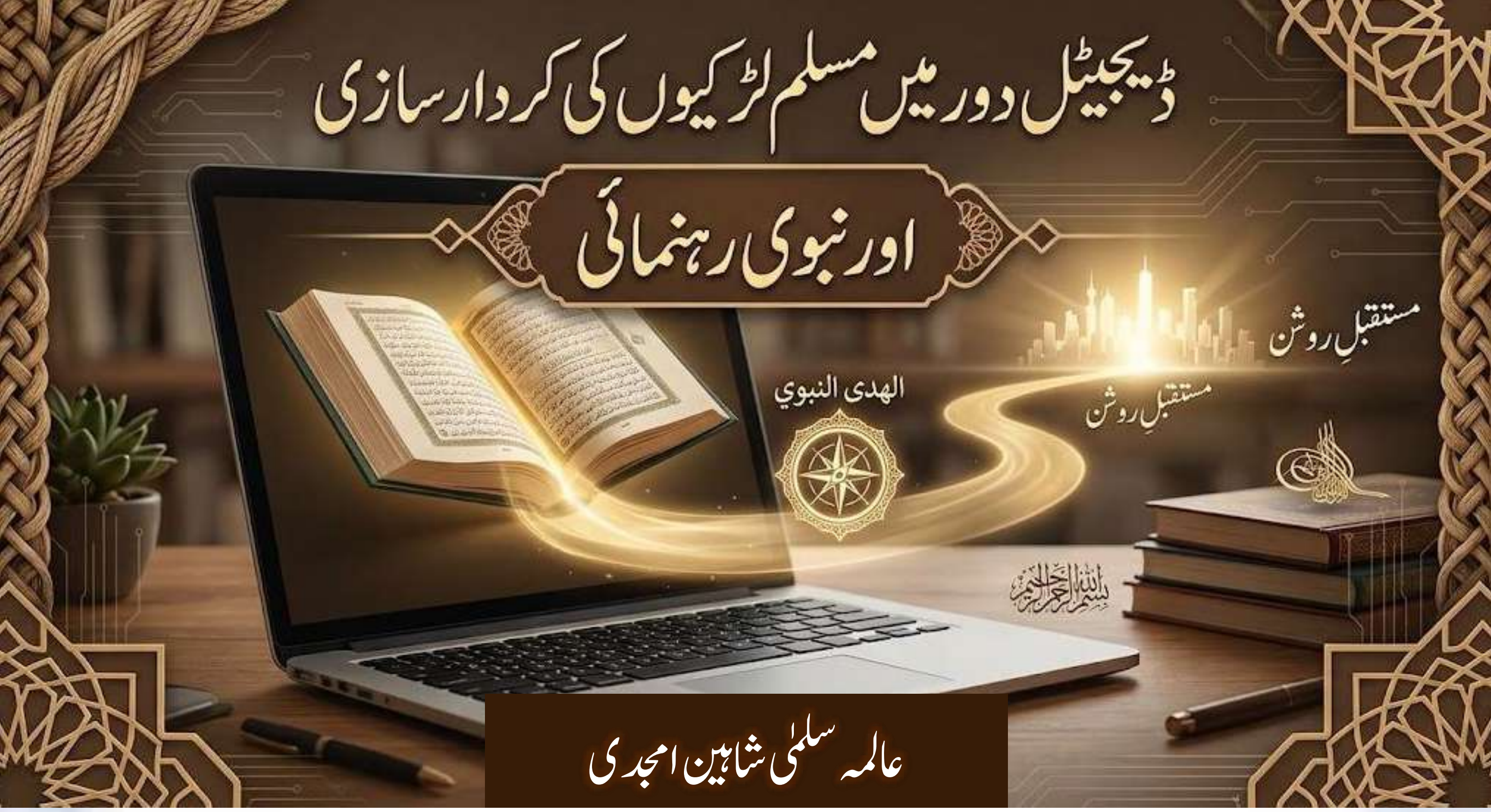

ڈیجیٹل دور میں مسلم لڑکیوں کی کردار سازی اور نبوی رہنمائی

عالمہ سلمیٰ شاہین امجدی

اکیسویں صدی کو بجا طور پر ڈیجیٹل انقلاب کی صدی کہا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ، مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence)، سوشل میڈیا اور اسمارٹ فون نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ تعلیم، تجارت، ابلاغ، تحقیق اور سماجی روابط سب ڈیجیٹل ذرائع سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ اس تبدیلی نے جہاں ترقی کے بے شمار مواقع پیش کیے ہیں، وہیں اخلاقی، سماجی اور نفسیاتی مسائل بھی جنم دیے ہیں۔ ان اثرات سے سب سے زیادہ نوجوان نسل، خصوصاً مسلم لڑکیاں، متاثر ہو رہی ہیں۔

اسلام عورت کو معاشرے کی معمار اور آنے والی نسلوں کی بہترین تربیت گاہ قرار دیتا ہے۔ اسی لیے مسلم لڑکی کی کردار سازی صرف اس کی ذاتی ضرورت نہیں بلکہ خاندان، معاشرے اور امتِ مسلمہ کی فکری و اخلاقی تعمیر کا بنیادی تقاضا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾ ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو، بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے، بیشک اللہ جاننے والا خبر دار ہے۔ (الحجرات:13)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انسان کی اصل عظمت اس کے کردار، تقویٰ اور اخلاق میں ہے، نہ کہ ظاہری خوب صورتی یا شہرت میں۔

مسلم لڑکی کے کردار کی اسلامی بنیادیں:

اسلام میں ایک باکردار مسلم لڑکی کی شخصیت ایمان، تقویٰ، حیا، علم، صبر، دیانت داری اور احساسِ ذمہ داری پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا مسلم لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جدید تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کو بھی اپنی شخصیت کا حصہ بنائے۔

ڈیجیٹل دور کے اہم چیلنجز:

موجودہ دور میں سوشل میڈیا پر غیر اخلاقی مواد، بے پردگی، مادہ پرستی اور مغربی طرزِ زندگی کو کامیابی کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جس سے نوجوان ذہن متاثر ہوتے ہیں۔ فلٹرز، ایڈیٹنگ ایپس اور مصنوعی حسن کے رجحانات نے بہت سی لڑکیوں میں احساسِ کمتری، ذہنی دباؤ اور خود اعتمادی کی کمی پیدا کر دی ہے۔ بلا مقصد سوشل میڈیا کا استعمال قیمتی وقت کو ضائع کرتا ہے، جس سے تعلیم، عبادت، مطالعہ اور خاندانی ذمہ داریاں متاثر ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ سائبر بُلنگ، آن لائن بلیک میلنگ، شناخت کی چوری اور جعلی اکاؤنٹس جیسے خطرات بھی مسلم لڑکیوں کی عزت، ذہنی سکون اور مستقبل کے لیے ایک بڑا چیلنج ہیں۔

سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں حل:

رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہر دور کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کے زمانے میں ڈیجیٹل ذرائع موجود نہیں تھے، لیکن اس سلسلے میں بھی آپ کی مقدس تعلیمات مکمل رہنمائی موجود ہے۔

علم کو زندگی کا مقصد بنایا جائے، کیوں کہ علم انسان کو صحیح اور غلط میں فرق کرنا سکھاتا ہے۔

حیا اور پردے کو صرف لباس تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ گفتگو، تصاویر، ویڈیوز اور آن لائن رویے میں بھی اختیار کیا جائے۔

دیانت داری، سچائی اور ذمہ داری کو ہر ڈیجیٹل سرگرمی کا حصہ بنایا جائے اور جھوٹی خبروں، افواہوں اور غیر اخلاقی مواد سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

اعتدال اختیار کرتے ہوئے سوشل میڈیا کے استعمال کا وقت محدود رکھا جائے تاکہ تعلیم، عبادت، مطالعہ اور خاندان کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

سوشل میڈیا کا استعمال روزانہ ایک متوازن وقت تک محدود رکھا جائے۔

تعلیمی، تحقیقی اور دینی ویب سائٹس سے استفادہ کیا جائے۔

والدین اور معلمات نوجوان لڑکیوں کی رہنمائی کریں اور ان کے ساتھ اعتماد پر مبنی تعلق قائم کریں۔

آن لائن دنیا میں بھی اسلامی حیا، پردہ، اخلاق اور ذمہ داری کو اپنی شناخت بنایا جائے۔

اپنی شخصیت کی بنیاد ظاہری خوب صورتی کے بجائے علم، کردار، صلاحیت اور تقویٰ پر رکھی جائے۔

ڈیجیٹل دور ایک حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے فوائد سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے نقصانات سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بچا جائے۔ اگر مسلم لڑکی قرآن و سنت کی تعلیمات، سیرتِ نبوی ﷺ کے عملی نمونے اور اعلیٰ اخلاق کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لے تو وہ نہ صرف اپنے کردار کی حفاظت کر سکتی ہے بلکہ معاشرے میں مثبت تبدیلی لانے اور آنے والی نسلوں کی بہترین تربیت کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ یہی ایک باوقار، باشعور اور کامیاب مسلم لڑکی کی حقیقی پہچان ہے۔

سیرت طیبہ اور معاشرہ

اکیسویں صدی میں سیرت نبوی ﷺ کی معنویت

مولانا ڈاکٹر محمد عرفان محی الدین قادری ربانی، اسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی-پی جی کالج، حیدر آباد

اکیسویں صدی سائنس کی حیرت انگیز ترقیات سے عبارت ہے، عہد جدید میں جو عالمگیر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان کی مثال ماضی میں نہیں ملتی ہے، حیات انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اس کے اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں. دور جدید میں کچھ ایسے اہم انقلابات آئے جن کی وجہ سے دنیا کا فکری منظر نامہ اور ثقافتی افق، سماجی تنظیم، بین الاقوامی تعلقات سب کچھ بدل گیا، مواصلات کے ترقی یافتہ وسائل اور حمل و نقل کے انتہائی ترقی یافتہ ذرائع نے دنیا کو ایک گاؤں میں بدل دیا ہے، عصر حاضر میں جہاں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور مواصلاتی نظام نے دنیا کو سمیٹ کر گلوبل ویلیج میں تبدیل کر دیا ہے. وہاں مغرب کی ننگی و کھوکھلی تہذیب کی یلغار سے دنیا کا کوئی ملک اور کوئی معاشرہ محفوظ نہ رہ سکا. آج دنیا کی ہر مسافت چند گھنٹوں کی مسافت ہے اور کسی پیغام کا ایک سرے سے دوسرے سرے پر جانا چند لمحوں کا معاملہ ہے۔ اس طرح دولت کی فراوانی سے لوگوں کی آمد و رفت اور سیر و سیاحت، اسی طرح نقل و حرکت میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا ہے۔ ماضی قریب تک یہ ممکن تھا کہ ایک شخص اپنے ملک سے بلکہ اپنے شہر سے باہر قدم نکالے بغیر اپنی پوری حیات مستعار کا سفر ختم کر لے اور اس کا تعلق دوسرے مذہب، دوسرے تمدن اور اجنبی اقوام سے بالکل نہ ہو لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ مادہ پرستی، بے ضمیری، بے دینی اور خواہشات نفسی عام ہو گئی ہے ۔ اخلاقی و تہذیبی زوال نے انسانی اقدار کو پامال کر دیا ہے. معاشرہ لوٹ کھسوٹ، دہشت گردی، استحصال پسندی کا مرتکب ہو گیا ہے. باپ، بیٹا، ماں، بیٹی، ساس بہو، شاگرد، استاد اور بھائی بھائی کے مقدس رشتے اپنا وقار کھو چکے ہیں۔ دنیا سودی کاروبار کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ انسانوں کے مابین خلوص، بھائی چارہ، رواداری اور

ایثار و قربانی کا احساس باقی نہ رہا۔ آپسی میل جول، فلاح و بہبود اور ہمدردی کے بجائے بے حیائی عام ہو گئی ہے۔ دولت کمانے کی لالچ میں انسانیت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ خون سستا اور پانی مہنگا ہو گیا ہے۔ ہر طرف قتل و غارت گری، مذہب کے نام پر دنگا فساد، خون خرابا، ذات پات کے نام پر عناد و دشمنی، فرقہ ورانہ منافرت کا سبب آج کی مہذب دنیا میں زندگی بسر کرنے والا ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اس لیے اکیسویں صدی میں ہر انسان کی کامیابی سیرت طیبہ ﷺ میں مضمر ہے۔

سرور کائنات ﷺ کی حیات طیبہ نیک نمونہ عمل ہے، قرآن کریم نے اس کو مسلمانوں کیلئے "اسوہ حسنہ" قرار دیا ہے۔ یہ لفظ اپنے معنی کی وسعتوں کے اعتبار سے انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے، اسے زندگی کے کسی ایک شعبے کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح لفظ "سیرت" بھی اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے، بعض حلقوں میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سیرت یا مطالعہ سیرت کا صرف یہ مطلب ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کو تاریخی تسلسل اور جغرافیائی پس منظر میں سمجھ لیا جائے، آپ کی ولادت کب ہوئی، کس طرح آپ کی پرورش ہوئی، پہلی وحی کب آئی، ابتداء میں کون کون لوگ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے، ہجرت کب ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے، کون سا غزوہ کس سن میں ہوا، اور اس کا نتیجہ کیا رہا، آپ کے بعض حسی معجزات، آپ کی بعثت اور دعوت کے نتیجے میں دنیا میں کیا سیاسی، جغرافیائی اور معاشی انقلابات آئے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے امور بھی "سیرت" کا حصہ ہیں مگر "سیرت" کے معنی اور مفہوم کی حدیں صرف یہیں آکر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ سیرت کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ سیرت قرآنی تعلیمات کی عملی تصویر کا نام ہے، اسلامی عقائد، اسلامی اعمال، اسلامی اخلاق، فرد کا نظام حیات، معاشرے کے مسائل، بین الاقوامی تعلقات و روابط، امن کے تقاضے، جنگی قوانین وغیرہ یہ سب کے سب سیرت کے موضوعات میں شامل ہیں۔ اور سیرت طیبہ کو اسی وسیع مفہوم میں "اسوہ حسنہ" قرار دیا گیا ہے، اگر سیرت پاک صرف واقعات کو تاریخی تسلسل سے بیان کرنے کا نام ہو، اور اس میں انسانی ہدایت کے گوشوں پر گفتگو نہ ہو تو پھر وہ "اسوہ حسنہ" یا بہترین نمونہ کیسے ہو گی؟ تاریخ میں اپنے اپنے میدانوں میں عظیم اور عبقری شخصیات کی سوانح اور سرور کائنات ﷺ کی سوانح کو یہی بنیادی نقطہ جدا کر دیتا ہے، تاریخ انسانی کی دیگر عظیم شخصیات کی سوانح انسان کی تاریخی معلومات میں

اضافے کا سبب بنتی ہے لیکن سرور کائنات ﷺ کی مقدس زندگی کا مطالعہ انسان کو آفاقی سعادتوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔

عربی زبان میں لفظ سیرت یا "سیرۃ" اس کے صیغہ فعل سار یسیر سیرا سے نکلا ہے۔ جس کے معنی چلنے پھرنے یا سفر کرنے کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی طریقہ شکل وصورت راستہ روش اور چال چلن کے بھی ہیں۔ کسی ایک انسان کی سیرت کا مطلب اس کی زندگی کے سفر کا راستہ ہے جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل طے کرتا ہے۔ ماں کی کوکھ سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس لیے سیرت کا لفظ سوانح حیات کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ تاریخ بیان کرنے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ تاریخ بیان کرنے کے معنی میں بھی اور ذاتی زندگی کے معاملات بیان کرنے کے معنی میں بھی۔ قرآن میں بھی لفظ سیرت کا استعمال مختلف معنوں میں ہوا ہے۔ مثلاً سورہ طٰہ آیت 21 میں لفظ سیرت آیا ہے ﴿قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ﴾ جو حالت وہیئت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح سورہ نحل آیت 36 میں لفظ سیروا آیا ہے ﴿فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ جہاں اس کا مطلب چلنے پھرنے کے ہیں۔

اصطلاحی معنوں میں لفظ سیرت کا مطلب نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی کے احوال بیان کرنا ہے۔

احادیث میں لفظ سیرت قرآن پاک کی طرح بعض احادیث میں لفظ سیرت اپنی اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چند احادیث میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے لیے صحابۂ کرام نے بھی لفظ سیرت کا لفظ استعمال فرمایا.

مسند امام احمد بن حنبل میں حدیثیں ایسی موجود ہیں جس میں سیرت کا لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

﴿حَدَّثَنَا عَبدُ اللهِ حَدَّثَنِي سُرَيْجُ بْنُ يُونُسَ حَدَّثَنَا مَرْوَانُ الْفَزَارِيُّ أَخْبَرَنَا عَبدُ الْمَلِكِ بْنُ سَلْعٍ عَنْ عَبْدِ خَيْرٍ قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُولُ قَامَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ فَذَكَرَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ قُبِضَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاسْتُخْلِفَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَعَمِلَ بِعَمَلِهِ وَسَارَ بِسِيرَتِهِ حَتَّى قَبَضَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ذَلِكَ ثُمَّ اسْتُخْلِفَ

عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى ذَلِكَ فَعَمِلَ بِعَمَلِهِمَا وَسَارَ بِسِيرَتِهِمَا حَتَّى قَبَضَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ذَلِكَ﴾(1)

حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ ﷺ کی روح قبض کی گئی تو آپ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب کیے گئے. حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ جیسا کام کیا اور آپ ﷺ کی "سیرت" پر چلے۔ حتی کہ اللہ تعالی نے آپ کی روح کو قبض کر لیا اور آپ رضی اللہ تعالی عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے. حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں جیسا کام کیے اور ان کی "سیرت" پر چلے حتی کہ اللہ عزوجل نے ان کی روح کو بھی قبض کر لی۔

عصر حاضر میں لفظ سیرت عربی زبان میں اس کا ہم معنی حیات ہے۔ اور اردو زبان میں حالات زندگی یا سوانح حیات کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور سیرت کے معنی سنت، طریقہ اور کردار کے ہیں۔ اس لیے یہ زندگی یا حالات زندگی سے قدرے مختلف چیز ہے۔ سیرت میں انسان کی سوچ وبچار، طبعی رجحان اور اس کی فکر اور خیالات پر عمل کرنے کا طریقہ کار، اس سے ہونے والے اثرات کے تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں جبکہ زندگی میں کسی شخص کی ولادت سے لے کر وفات تک تمام اہم حالات وواقعات شامل ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ کی زندگی صرف واقعات پر مبنی نہیں ہے. آپ ﷺ کی زندگی کا درخشاں پہلو منصب رسالت کا بھی ہے، جس سے پوری انسانیت کو رہنمائی حاصل ہوئی اور یہ بھی سیرت رسول ﷺ کا حصہ ہے۔ سیرت رسول ﷺ پر کام کرنا اصل میں سیرت نگاری کے اہم فریضے کا سرانجام دینا ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے اور ہر مسلمان خواہش مند ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی مدحت بیان کرے. آپ ﷺ کے حالات زندگی اور عظیم الشان شخصیت کو بہتر طور پر اپنے انداز میں بیان کرے۔(2)

عالمگیریت بذریعہ سیرت نگاری

آج دنیا گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کر چکی ہے. اور ایک جگہ پر ہونے والے واقعہ باقی ممالک پر بھی اثر انداز ہوتا ہے. اور دنیا عالم گیر نظام کی ضرورت محسوس کر رہی ہے. مختلف ترقی یافتہ ممالک کی عالم گیریت کے نام پر اپنے

اپنے مقاصد و محرکات کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی بنا پر کہیں استحصال کی صورت پائی جاتی ہے اور کہیں روز بروز ترقی کی بڑھتی ہوئی شرح دیکھنے میں آتی ہے۔ قیام کے لیے چند نکات کا پایا جانا از حد ضروری ہے کہ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ دنیا میں مساوات انسانی کے اصول کو ہر صورت میں پورا کیا جائے۔

دوسری چیز جو عالمگیریت کے قیام کے لیے لازمی ہے۔ وہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کے اصولوں کو ہر حال میں قبول کیا جائے اور ہر انسان کو یکساں طور پر عدل و انصاف تک رسائی کا حق دیا جائے۔ یہ بھی مساوات ہی کا لازمی جز و ہے کہ انصاف ہر انسان کی دسترس میں ہو۔

تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہر انسان کو پر امن، سکون بنا کسی امتیاز کے حاصل ہونا چاہیے۔

چوتھی ضروری چیز یہ ہے کہ علم کے حصول پر تمام لوگوں کو برابر حق کا حاصل ہونا چاہیے اور اس میں کسی شعبہ تعلیم پر کسی قسم کا امتیازی سلوک روا نہیں ہونا چاہیے۔

پانچویں اور آخری ضروری نکتہ، اہم بات یہ ہے کہ تمام انسانوں سے معاملات، اخلاق اور تہذیب و تمدن کی بنیاد پر طے کیے جائیں۔ اگر پانچوں نکات عالمگیریت کے قیام کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ تو پھر اسی عالمگیریت کا واحد نمونہ اگر کہیں بھی حقیقی طور پر پیش ہوتا نظر آتا ہے تو وہ صرف دین اسلام کی اصولوں میں اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی سیرت مبارکہ میں ہے۔(3)

سیرت نگاری سے منشیات کی روک تھام

منشیات کا بے دریغ استعمال دور حاضر میں پائے جانے والے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے۔ عدم سکون و اطمینان اور ذہنی انتشار پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ آج کے دور میں انسان بہت سے مادی وسائل و ذرائع کی فراوانی کے باوجود سکون قلب سے محروم ہے۔ سکون کی تلاش میں انسان کئی طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔ ان مختلف طریقہ کار میں سے ایک طریقہ منشیات کا استعمال بھی ہے۔ اگر اکثر اوقات لوگ ذہنی کرب سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت تک کو گلے لگا لیتے ہیں۔ دنیا بھر میں منشیات کی روک تھام کے لیے مختلف مہمیں چلائی جارہی ہیں تاکہ اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود اس برائی میں کمی کے باوجود روز بروز

اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ تجربہ کے مطالعے کے سے پتہ چلتا ہے نبی کریم ﷺ نے آج سے صدیوں پہلے منشیات کا اس انسداد کے لیے رہنمائی فرمائی۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿کل مسکر خمر و کل مسکر حرام﴾(4)

اورنشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ ایک جگہ آپ نے ارشاد فرمایا: ﴿ما أسکرہ کثیرہ فقلیلہ حرام﴾(5)

جس چیز کا کثیر حصہ نشہ لائے اس کا تھوڑا حصہ بھی حرام ہے۔

﴿لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْخَمْرِ عَشْرَةً عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةُ إِلَيْهِ وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَآكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُشْتَرِي لَهَا وَالْمُشْتَرَاةُ لَهُ﴾(6)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا. رسول ﷺ نے شراب کے بارے میں دس افراد پر لعنت فرمائی. نکالنے والے، جو نکلوائے اور پینے والے، لے جانے والوں پر، اور جس کی طرف لے جائی جائے اور پلانے والوں پر بیچنے والوں پر اور اس کی قیمت کھانے والوں پر خریدنے والوں پر اور جس کے لیے وہ خریدی جائے۔

دنیا واقعی انسداد منشیات چاہتی ہے اور اس نشے کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے تاکہ دنیا کو اس برائی سے ہمیشہ کے لیے بچایا جاسکے اور زندگی کو پر امن بنایا جاسکے، تو سیرت النبی ﷺ کی ہدایات واحکام پر عمل کرنا لازمی ہو گا. اس کے لیے سیرت نگاری از حد ضروری ہے۔ سیرت نگاری کے ضمن میں ان پہلوئوں کو موضوع بحث بنا کر منشیات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر بھی اختیار کیا جاسکتی ہیں اور نئی نسل کو اس زہر اور اخلاقی برائی سے بچایا جاسکتا ہے۔(7)

سیرت نگاری کا ایک اور اسلوب جو بہت بعد میں پیدا ہوا وہ مناظرانہ اسلوب تھا۔ جس سے مراد وہ اسلوب تھا جو مسلمان مسالک یا مدارس سے فکر کے مابین مناظروں کی وجہ سے وجود میں آیا۔ مناظروں کے نتیجے میں مسلمانوں میں مختلف رائے رکھنے والے لوگوں نے سیرت کے مختلف واقعات کی تعبیر، اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کی۔ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دلائل دیے اور دوسروں کے نقطہ نظر پر تنقید کی۔

امام احمد رضا کی سیرت نگاری اور بین المسالک مکالمہ.

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کا ایسا دور تھا جب مختلف مسالک اور مکاتیب فکر کے درمیان مناظرانہ ماحول عام تھا۔ اس ماحول میں اکثر علمی مکالمہ مجادلے کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ نے اپنی علمی و فکری کاوشوں سے نہ صرف عقائد اہلسنت کی حفاظت کی بلکہ اس سیرت نگاری کے ذریعے بھی ایک ایسا انداز اپنایا جس میں دلائل محبت رسول ﷺ اور علمی استناد کے ساتھ ساتھ بین المسالک مکالمے کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

بین المسالک مکالمے کا انداز: سیدی اعلی حضرت علیہ الرحمہ کے ہاں بین المسالک مکالمہ محض اختلافات کی نفی نہیں بلکہ اس علمی وضاحت اور دلیل کی بنیاد پر ہے۔ ان کا یہ اسلوب تھا کہ مخالف مسلک کے دلائل اصل ماخذ ہیں اور ان کا نقل کر کے کامل مدلل جواب دیا جائے۔ اس میں علمی وقار اور اعتقادی جلال دونوں جھلکتے ہیں۔ مثلا علم غیب نبوی ﷺ پر انہوں نے نہ صرف قرآنی آیات اور احادیث بلکہ سلف صالحین کے اقوال بھی پیش کیے اور واضح کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو عطائی غیب حاصل ہے اور اس پر اعتراض کرنے والوں کا موقف کمزور ہے۔

سیرت اور وحدت امت:

حضرت محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے نزدیک سیرت نگاری کا ایک مقصد امت کو نبی اکرم ﷺ کی کامل اتباع کی طرف متوجہ کرنا ہے. اور وہ یہ باور کراتے ہیں کہ اگر امت سیرت مصطفی ﷺ کو معیار بنا لے تو باہمی اختلافات ختم ہو جائیں گے یہی پہلو بین المسالک مکالمے کا اصل پیغام ہے۔ مکالمہ اور دفاعی پہلو اگرچہ سیدی اعلی حضرت علیہ الرحمہ کے دور میں مناظرانہ فضا غالب تھی۔ تاہم ان کی سیرت نگاری میں مکالمہ رد اعتراضات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مثلا وہ نبی کریم ﷺ کے مقام شفاعت، نورانیت کے حوالے سے مخالفین کی شبہات کا ازالہ کرتے ہیں. یہ دراصل علمی مکالمہ ہے جو سیرت کے دلائل کی بنیاد پر قائم ہے۔

عصر حاضر کے لیے سبق: آج کے تناظر میں امام احمد رضا کی سیرت نگاری ہمیں یہ سبق دیتی ہے. بین المسالک مکالمہ جذباتی یا منفی انداز میں نہیں بلکہ علمی، تحقیقی دلائل قرآن و سنت، محبت رسول ﷺ اور ادب اختلاف کے ساتھ کیا جائے. یہی اسلوب حقیقی مکالمے کو فروغ دیتا ہے. امام احمد رضا کی سیرت نگاری میں بین المسالک مکالمہ ایک اہم جہت ہے۔ انہوں نے سیرت النبی ﷺ کو مرکزی وحدت بنایا اور مخالفین کے ساتھ علمی دلائل

پر مبنی گفتگو کی۔ ان کی تصانیف اس بات کا عملی نمونہ ہیں کہ سیرت مصطفی ﷺ نہ صرف اعتقادی و روحانی رہنمائی فراہم کرتی ہے بلکہ امت کے مختلف مسالک کے درمیان مکالمے اور باہمی تفاہم کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ (8)

عائلی زندگی میں رونما ہونے والے نزاع کی اصلاح

﴿حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ، قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم بَيْتَ فَاطِمَةَ، فَلَمْ يَجِدْ عَلِيًّا فِي الْبَيْتِ فَقَالَ " أَيْنَ ابْنُ عَمِّكِ " . قَالَتْ كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ شَىْءٌ، فَغَاضَبَنِي فَخَرَجَ فَلَمْ يَقِلْ عِنْدِي. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم لإِنْسَانٍ " انْظُرْ أَيْنَ هُوَ " . فَجَاءَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ، هُوَ فِي الْمَسْجِدِ رَاقِدٌ، فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ مُضْطَجِعٌ، قَدْ سَقَطَ رِدَاؤُهُ عَنْ شِقِّهِ، وَأَصَابَهُ تُرَابٌ، فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم يَمْسَحُهُ عَنْهُ وَيَقُولُ " قُمْ أَبَا تُرَابٍ، قُمْ أَبَا تُرَابٍ "﴾ (9)

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ انہوں نے بیان کیا "رسول ﷺ فاطمہ کے گھر تشریف لائے اور علی رضی اللہ عنہما کو گھر میں نہ پایا۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا" ﴿أَيْنَ ابْنُ عَمِّكِ ؟﴾ تمہارا عم زاد کہاں ہے؟ انہوں نے عرض کیا ﴿" كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ شَىْءٌ، فَغَاضَبَنِي فَخَرَجَ فَلَمْ يَقِلْ عِنْدِي"﴾. میرے اور ان کے درمیان کچھ چیز یعنی کھٹ پٹ تھی. تو مجھ سے خفا ہو کر کر باہر نکل گئے ہیں اور میرے ہاں قیلولہ نہیں کیا۔ رسول ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا ﴿انْظُرْ أَيْنَ هُوَ﴾ دیکھو وہ کہاں ہیں۔ اس شخص نے واپس آکر عرض کیا "يَا رَسُولَ اللَّهِ، هُوَ فِي الْمَسْجِدِ رَاقِدٌ﴾. یارسول اللہ ﷺ وہ مسجد میں لیٹے ہوئے ہیں۔

﴿فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ مُضْطَجِعٌ، قَدْ سَقَطَ رِدَاؤُهُ عَنْ شِقِّهِ، وَأَصَابَهُ تُرَابٌ، فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم يَمْسَحُهُ عَنْهُ وَيَقُولُ " قُمْ أَبَا تُرَابٍ، قُمْ أَبَا تُرَابٍ ".﴾

پھر نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ لیٹے ہوئے تھے، اور ان کے (دوسرے) پہلو سے چادر گر گئی تھی اور جسم پر مٹی لگ گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ جسم سے دھول جھاڑ رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرما رہے تھے ابو تراب اٹھو ابو تراب اٹھو۔

حدیث شریف کے حوالے سے سات باتیں۔ حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ کی اپنی صاحبزادی کی عائلی زندگی سے دلچسپی واضح ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل سات باتیں خصوصی طور پر قابل توجہ ہیں.

☆ آنحضرت ﷺ نے بیٹی کے گھر تشریف لاتے ہی اپنے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں عدم موجودگی کا نوٹس لیا۔

☆ آنحضرت ﷺ نے صاحبزادی سے ان کے شوہر (رضی اللہ عنہ) کے متعلق دریافت کرتے فرمایا۔ تمہارے چچا کا بیٹا کہاں ہے؟ آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تمھارے شوہر کہاں ہیں؟

اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر کرتے ہیں.

﴿و كأنه صلي الله عليه وسلم فهم ما وقع بينهما ، فأراد استعطافها عليه بذكر القرابة القريبة بينهما﴾(10)

اور شاید کہ آنحضرت ﷺ دونوں کے درمیان کچھ کھٹ پٹ کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے بیٹی کے دل میں ان کے لیے محبت کے جذبات ابھارنے کے خاطر رشتے داری کا ذکر فرمایا۔

☆ اس صورت حال سے آگاہی پر آنحضرت ﷺ نے خاموشی اختیار نہ کی۔ بلکہ فوراً ہی معاملے کی اصلاح کی خاطر کوشاں ہوئے۔ ایک شخص کو داماد محترم رضی اللہ عنہ کی تلاش میں ارسال فرمایا.

☆ ان کی جگہ معلوم ہونے پر انہیں اپنے پاس نہیں بلایا، بلکہ خود ان کے پاس تشریف لے گئے۔

☆ آنحضرت ﷺ نے ان سے نہ باز پرس فرمائی اور نہ ہی کسی قسم کی خفگی کا اظہار کیا۔

☆ اپنے دست مبارک سے داماد محترم کے جسم پر لگی ہوئی مٹی کی جھاڑ پونچھ فرمائی۔

☆ آنحضرت ﷺ نے داماد کو خوش کرنے کا خاطر از راہ مزاح (أبا تراب) لقب سے پکارا. اور یہ لقب اس قدر پسند آیا۔ بقول سہل بن سعد رضی اللہ عنہ. ﴿إن كانت أحب أسماء علي رضي الله عنه إليه لأبو تراب﴾(11)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں ان کا سب سے پیارا نام ابو تراب تھا۔

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سہل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں روٹھے ہوئے شخص سے ایسا مزاح کرنا ثابت ہوتا ہے جس سے وہ ناراض نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ موانست ہو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی شرح میں تحریر کرتے ہیں:

اس میں نبی کریم ﷺ کا عظیم اخلاق جلوہ گر ہے کیونکہ وہ خود علی رضی اللہ کو راضی کرنے کی خاطر ان کے پاس تشریف لے گئے اور خوش کرنے کی غرض سے مٹی کو ان کی پشت سے صاف کیا۔ ان کے مناسب حال کنیت سے از راہ مزاح انہیں پکارا۔ اپنے ہاں صاحبزادی کے بلند مقام کے باوجود بیٹی کو خفا کرنے کی بناپر علی رضی اللہ عنہ کی سرزنش نہ فرمائی. اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان (یعنی دامادوں) کے ساتھ باہمی محبت کی بقا کی خاطر ان کے ساتھ نرمی کرنا اور سرزنش نہ کرنا، مستحب ہے، کیونکہ سرزنش کی بناء پر عام طور پر دلوں میں کینہ پیدا ہوتا ہے. ہاں وہ لوگ جو اس بات سے منزہ ہوں ان کا معاملہ الگ ہے. دوسرے مقام پر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس قصے کے متعلق لکھتے ہیں:

اس میں داماد کی عزت و تکریم اور اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنا ثابت ہوتا ہے۔

انتہائی دکھ کی بات ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے برعکس بیٹیوں کے بعض نادان خیر خواہ باپ ایسے موقعوں پر آستینیں چڑھا کر بیچ میں کود پڑتے ہیں اور کچھ منہ زور، لیکن بزعم خود بہت زیادہ عقل و دانش والی مائیں جلتی پر تیل ڈال کر بیٹیوں کے گھر کو برباد کر دیتی ہیں۔(12)

سیرتِ نبوی ﷺ اور اقوام متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف:

The Sustainable Development Goals (SDGs) are 17 global objectives adopted by the United Nations in 2015 to end poverty, protect the planet, and ensure prosperity for all by 2030.

سیرتِ نبوی ﷺ اقوامِ متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف کی روح اور بنیاد فراہم کرتی ہے کیونکہ آپ ﷺ کی زندگی بنی نوع انسان کے لیے ایک جامع اخلاق، سماجی اور معاشی ضابطہ حیات ہے۔ اقوامِ متحدہ نے 2015 میں پائیدار ترقی کے جو 17 اہداف مقرر کیے تھے، ان کی عملی مثالیں 1400 سال پہلے مدینہ منورہ کی فلاحی ریاست اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں واضح طور پر ملتی ہیں۔

ذیل میں پائیدار ترقی کے اہم ترین اہداف اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ان کا تقابلی جائزہ پیش ہے۔

۔سماجی اور معاشی اہداف 1 (Social & Economic Goals)

1.SDG :No Poverty – End poverty in all its forms everywhere
2.SDG: Zero Hunger – End hunger, achieve food security, improve nutrition, and promote sustainable agriculture

غربت اور بھوک کا خاتمہ (SDG 1 & 2)

آپ ﷺ نے زکوٰۃ، صدقات اور مواخاتِ مدینہ (بھائی چارے) کا ایسا نظام قائم کیا جس سے دولت کی منصفانہ تقسیم ہوئی۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "وہ مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو"۔

3. SDG : Good Health and Well-Being – Ensure healthy lives and promote well-being for all at all ages
4. SDG : Quality Education – Ensure inclusive and equitable quality education and promote lifelong learning opportunities for all

بہتر صحت اور تعلیم (SDG 3 & 4)

آپ ﷺ نے صفائی کو "نصف ایمان" قرار دے کر صحت عامہ کی بنیاد رکھی۔ غزوہ بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ طے کیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، جو سب کے لیے معیاری تعلیم کی بہترین مثال ہے۔

5. SDG : Gender Equality – Achieve gender equality and empower all women and girls

صنفی مساوات (SDG 5)

آپ ﷺ نے دورِ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم کا خاتمہ کیا۔ خواتین کو وراثت، تعلیم اور کاروبار کا حق دے کر معاشرے کا معزز حصہ بنایا۔

10. SDG : Reduced Inequalities – Reduce inequality within and among countries

16. SDG : Peace, Justice, and Strong Institutions – Promote peaceful and inclusive societies, provide access to justice for all, and build effective, accountable, and inclusive institutions at all levels

مساوات اور انصاف (SDG 10 & 16)

خطبہ حجتہ الوداع میں آپ ﷺ نے واشگاف الفاظ میں رنگ، نسل اور زبان کے فرق کو ختم کر کے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا اور فرمایا کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔

۔ماحولیاتی اور قدرتی وسائل کے اہداف (Environmental Goals) 2

6. SDG : Clean Water and Sanitation – Ensure availability and sustainable management of water and sanitation for all

صاف پانی اور سینیٹیشن (SDG 6)

آپ ﷺ نے پانی کے ضیاع کو سختی سے منع فرمایا۔ یہاں تک کہ بہتی ندی کے کنارے بیٹھ کر بھی وضو میں اسراف سے روکا۔ مدینہ میں پانی کے کنویں (جیسے بئرِ رومہ) وقف کروا کر پانی تک عوامی رسائی ممکن بنائی۔

15. SDG :Life on Land – Protect, restore, and promote sustainable use of terrestrial ecosystems, manage forests sustainably, combat desertification, halt and reverse land degradation, and halt biodiversity loss

پائیدار زراعت اور زمین کا تحفظ (SDG 15)

آپ ﷺ نے شجرکاری کی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا: "اگر قیامت قائم ہو رہی ہو اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں پودا ہو، تو وہ اسے لگا دے۔" آپ ﷺ نے بنجر زمین کو آباد کرنے والے کو اس کا مالک قرار دیا۔

12. SDG : Responsible Consumption and Production – Ensure sustainable consumption and production patterns

ذمہ دارانہ استعمال :(SDG 12)

اسلام کا بنیادی اصول ہی اعتدال پسندی اور قناعت ہے۔ آپ ﷺ نے اسراف (فضول خرچی) اور ذخیرہ اندوزی سے سختی سے منع فرمایا تاکہ وسائل سب کو مل سکیں۔

سیرتِ نبوی ﷺ اور پائیدار ترقی کے اہداف کا تقابلی جائزہ (جدول)

اقوامِ متحدہ کا ہدف - (SDGs) سیرتِ نبوی ﷺ سے عملی مثال اور رہنمائی

اقوامِ متحدہ کا ہدف (SDGs)	سیرتِ نبوی ﷺ سے عملی مثال
SDG 1: No Poverty غربت کا خاتمہ۔	مواخاتِ مدینہ کے تحت انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنانا
SDG 4: Quality Education معیاری تعلیم۔	علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دینا
SDG 5: Gender Equality صنفی مساوات۔	خواتین کے حقوق، مہر اور وراثت میں حصے کا تعین کرنا
SDG 6: Clean Water and Sanitation صاف پانی۔	پانی کے ضیاع کی ممانعت اور عوامی کنوؤں کا قیام
SDG 15: Life on Land زمینی حیاتیات کا تحفظ۔	جنگ کے دوران بھی درختوں کو کاٹنے اور فصلیں جلانے کی سخت ممانعت
SDG 16: Peace, Justice, and Strong Institutions امن اور انصاف -	میثاقِ مدینہ کے ذریعے مختلف مذاہب کے درمیان پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ

خلاصہ یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف مادی اور دنیاوی خوشحالی پر توجہ دیتے ہیں، جبکہ سیرتِ نبوی ﷺ ان اہداف کو انسانیت کی خدمت اور رضائے الٰہی کے حصول کے طور پر پیش کرتی ہے، جس سے پائیدار ترقی کے نتائج دنیا اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتے ہیں۔

مصادر و مراجع

(1) مسند أحمد بن حنبل: مسند علي بن أبي طالب رضي الله عنه، رقم الحديث: 1055
(2) سیرت نگاری میں ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی کا منہج: ص، 11
(3) محاضرات سیرت: ص، 30
(4) صحیح مسلم: رقم الحديث، 5219
(5) جامع الترمذي: رقم الحديث، 1865
(6) جامع الترمذي: رقم الحديث، 1295
(7) سیرت نگاری میں ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی کا منہج: ص، 19
(8) امام احمد رضا کی سیرت نگاری، ص: 97
(9) صحیح البخاري: رقم الحديث، 441
(10) فتح الباري، جلد اول، ص: 536
(11) صحیح البخاري: رقم الحديث، 6204
(12) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت والد: ص، 77

مفتی محمد جنید مصباحی، کان پور

انسانی حقوق کا تصور اسلام میں نہایت مکمل صورت میں موجود ہے جسے قرآن و حدیث میں الگ الگ مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اسلام نے اس دور میں حقوق کی بات کی تھی جب پوری دنیا میں حقوق کیا ظلم سے بچنے بچانے کا بھی کوئی باقاعدہ نظام موجود نہ تھا، ظلم و سرکشی عام تھی، انارکی پھیلی ہوئی تھی، جس کو جو صحیح لگتا تھا وہ کر گزرتا تھا، مظلوموں کی دادرسی تو کجا آواز تک نہیں اٹھائی جاسکتی تھی، آپ ساتویں صدی عیسوی کی پوری دنیا کی صورت کو ذہن میں رکھیے اور پھر اسی پس منظر کو ذہن میں لے کر عرب کے بیابان میں پہنچیے جہاں محمد عربی ﷺ نے اسلام کی دعوت شروع کی، جو ایک طرف ایک معبود کی عبادت پر مشتمل تھی، تو دوسری طرف ظلم کے خاتمے، انارکی کی بیخ کنی، مظلوموں کی فریادرسی، اقامت عدل اور احیائے حقوق پر مشتمل تھی، محمد عربی ﷺ کا یہ نظام اپنے زمانے سے صدیوں آگے تھا۔ جی ہاں! میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں اور یہ کہنے میں حق بجانب بھی ہوں کہ محمد عربی ﷺ کا یہ نظام صدیوں آگے تھا کیوں کہ جن اقدار کو آٹھویں صدی میں اتنے مکمل اور واضح انداز میں اتنی تفصیل کے ساتھ نہ صرف بیان کیا تھا بلکہ ریاست مدینہ ان اقدار پر قائم فرما کر دنیا کو یہ دکھا دیا تھا کہ اگر محمد عربی ﷺ کسی کام کو کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو نائب پروردگار کو نہ تو حالات کی مخالف ہوا روک سکتی ہے نہ دورِ جہالت کی تاریکی آڑے آسکتی ہے۔ نہ ظلم و بربریت کا غلبہ دعوت محمدی کو دبا سکتا ہے بلکہ ﴿یریدون لیطفئو ا نور اللہ﴾۔ اور وہی ہوا کہ جہالت کی گھٹاٹوپ تاریک شب میں کفر کی خطرناک آندھیوں کی زد میں محمد عربی ﷺ نے رسالت محمدی کا ایسا چراغ جلایا کہ پوری دنیا نورِ ایمان

سے روشن ہو گئی، پرانے فخر ختم ہو گئے، قبائلی عصبیت کی کوئی حیثیت نہ رہی، بچیوں کو زندگی کا سویرا نصیب ہوا، غلاموں کو انسانوں کا درجہ، عورتوں کو ان کا مقام ملا، بوڑھوں کو زندہ رہنے کے جواز ملے، غریبوں کو برابری کا درجہ ملا، پس ماندہ طبقے سے ناروا سلوک بند ہوا، حتیٰ کہ جانوروں کو بھی تحفظ حاصل ہوا۔

بس فرق یہ ہے کہ جس چیز کو آج حقوق انسانی کے نام سے بیان کیا جاتا ہے، اسلام میں اسے حقوق العباد کہا جاتا ہے اسلام نے سوسائٹی میں بسنے والے ہر شخص کے حقوق خوب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اسلام میں حقوق العباد کو اس قدر اہمیت و تقدس حاصل ہے کہ حقوق اللہ کے بارے میں تو یہ ہے کہ اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو اللہ رب العزت کی بارگاہ سے معافی کی امید لگائی جاسکتی ہے لیکن اگر کوئی حقوق العباد کے معاملے میں محبوس ہوا اور کسی انسان کا کوئی حق تلف کرنے کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں جب تک کہ صاحبِ حق سے اپنا معاملہ بے باق نہ کرلے۔ امیر ہوں یا غریب، بچے ہوں یا بوڑھے، مرد ہوں یا خواتین، آزاد ہوں یا غلام، مزدور ہوں یا آقا، والدین ہوں یا اولاد، بیوی ہو یا شوہر، یتیم ہوں یا بیوہ، پڑوسی ہوں یا رشتے دار، اپنے بیگانے ، حتیٰ کہ جانوروں تک کے حقوق بھی چھوڑے نہیں گئے بلکہ بیان کیے گئے علاوہ ازیں دنیا کے جتنے بھی نظام حقوقِ انسانی کی بات کرتے ہیں وہ صرف باتوں کی حد تک ہی جاسکتے ہیں، ان کے نفاذ کے لیے کوئی تحریک نہیں ہوتی جب کہ اسلام کی خاصیت یہ ہے کہ اسلام نہ صرف ان حقوق کا بیان کرتا ہے بلکہ اپنی طاقت کا استعمال کر کے ان حقوق کا نفاذ یقینی بناتا ہے۔ دوسری ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب بھی کسی نظام میں حقوق کی بات کی گئی وہ ظلم و استبداد سے تنگ آکر ایک بغاوتی انداز میں کی گئی اور جب تک بغاوتی صورت پیدا نہیں ہو یہ تب تک لوگوں نے اس طرف توجہ نہیں کی لیکن اسلام تنہا ایسا دین ہے جس نے حقوقِ انسانی کی بات بغاوت و خروج کے دباؤ میں آکے نہیں کی بلکہ اسلام از خود آگے بڑھا اور حقوقِ انسانی کو یقینی بنانے کی جدوجہد شروع کی اور زمانۂ رسالت اور خلافت راشدہ میں حقوقِ انسانی ایسی مکمل صورت میں نظر آتے ہیں کہ آج کی جدید ترقی یافتہ دنیا بھی اتنا مکمل نظام نہیں بنا پائی ہے۔

دنیا کے نظام حقوق اس طور پر چلتے ہیں کہ اگر کسی کا کوئی حق تلف ہو جائے تو با قاعدہ وہ مقدمہ دائر کر کے عدالت سے اپنے حق کی بازیابی کے لیے کوششیں کرتا ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ جب مقدمہ دائر کرنے کی بات آتی ہے

تو آدمی دوڑ بھاگ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنے بہت سارے حقوق چھوڑ بھی دیتا ہے۔ اس طرح حق تلفی کرنے والے کو سوائے بڑے معاملات کے جواب دہی بہت کم کرنی پڑتی ہے اور چھوٹے چھوٹے حقوق کی تو کسی کو پرواہ ہی نہیں۔

ایک جہت تو اوپر بیان کی گئی کہ اسلام نے بد نظمی اور انارکی کے زمانے میں نظام حقوق دنیا کے سامنے رکھا ۔دوسری جہت یہ ہے کہ یہ نظام حقوق کسی احتجاج کے رد عمل کے طور پر وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اسلام نے خود آگے بڑھ کر یہ نظام حقوق دنیا کے سامنے پیش کر کے دنیا کو حقوق سے روشناس کرایا ہے اور یہ سب سے پہلا باضابطہ منشور حقوق ہے۔

پھر اسلام کا نظام حقوق ایک خوبی یہ بھی رکھتا ہے کہ اسلام نے سب کو ایک ہی ڈنڈی سے نہیں ہانکا ہے بلکہ جس کی جتنی ذمہ داری بنتی ہے اس کی ذمہ داری اور اس کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی سماجی حیثیت اور ذمہ داری کے مطابق اس کو حق دیا ہے۔

تیسری جہت یہ ہے کہ اسلام نے حقوق کے تحفظ پر اخروی ثواب بھی متعین کیا ہے کہ اگر بندہ کسی کا کوئی حق ادا کرے تو اس کو ثواب بھی ملتا ہے تو ادائیگی حقوق کے لیے ثواب کے یہ وعدے موٹیویشن پیدا کرتے ہیں اس طرح اسلام نے ادائیگی حقوق کو صرف ایک دنیاوی معاملے کی حد تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اخروی معاملہ بنا کر اس نظام حقوق کو اور زیادہ مستحکم کر دیا ہے کہ یہ ثواب اسے ادائیگی حقوق کی طرف پیش قدمی کرنے کی وجہ بھی دیتے ہیں اور اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کا حق مارنا بھی چاہے تو جس طرح ادائیگی حقوق پر ثواب مرتب ہوتا ہے اسی طرح کسی کی حق تلفی کرنے پر بندہ مستحق وعید بھی ہوتا ہے اس طرح اسلام نے حقوق کے معاملے کو صرف ایک دنیاوی معاملہ بنا کے نہ چھوڑا کہ اگر کوئی دنیا میں کسی کا کوئی حق تلف کر لے اور پھر مظلوم فریاد دادرسی نہ لگائے تو اس کا حق بغیر کسی بدل اور تاوان کے یہیں دنیا میں ہی ختم ہو جائے اور ظالم کو اپنے کیے کی کوئی جواب دہی نہ کرنے پڑے اس طرح ظالم اپنی سرکشیوں میں بغیر کسی جواب دہی کے بڑھتے چلے جائیں اور مظلوموں کو کوئی حق نہ مل سکے بلکہ نظام حقوق ایسا مکمل ہے کہ مظلوم دنیا میں بھی اپنے معمولی سے حق کے لیے آواز بلند کر سکتا ہے اور دنیا کی حکومت اگر اس کی دادرسی نہ بھی کرے تو بھی اس کا حق ضائع اور برباد نہیں ہوتا ہے کہ بلکہ یہ معاملہ خدائی عدالت میں پیش ہونے کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن ہر انسان کو ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب بھی دینا پڑے گا اور اس نظام حقوق میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی کا کوئی حق ادا کرتا ہے تو وہ

صرف دینے والا نہیں ہوتا کہ اس کا اس ادائیگی حق سے کوئی فائدہ نہ ہونے والا ہو بلکہ معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دینے والا اللہ پاک کی جانب سے مستحق ثواب ہوتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں درج کی جاتی ہیں جن کا صلہ قیامت میں بھی اس کو ملے گا اور اگر اللہ چاہے تو دنیا میں بھی اس کو منفعت حاصل ہوگی تو اسلام کا نظام حقوق اس طرح انفرادی حیثیت رکھتا ہے کہ حق کی ادائیگی کی ترغیب بھی دلاتا ہے اور حق تلفی سے ڈراتا بھی ہے تو اگر کوئی بندہ ایسے مقام پر رہتا ہے جہاں حکومتی نظام حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ بھی دے تو بھی اسلام بندے کے اندر خود یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اس کو حق ادا کرنا چاہیے اس طرح اسلام کا نظام حقوق بغیر حکومتی مدد کے بھی خوب کارگر ثابت ہوا ہے جب کہ باقی نظاموں کو حکومت کی سرپرستی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی حکومتی سرپرستی کے باوجود زیادہ حد تک کامیاب ہوا ہے کیوں کہ یہ صرف اور صرف عدلیہ کی مداخلت سے ہی کارگر ہو سکتا ہے، انفرادی حیثیت سے اس کی تاثیر زیادہ نہیں ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں عدل کمزور ہوتا ہے وہاں حقوق کا معاملہ بھی کمزور رہتا ہے۔ اس طرح اسلام کے نظام حقوق میں ذمہ داری بھی ہے، محاسبہ بھی ہے اور جزا بھی ہے اور یہ معاملہ انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اجتماعی اہمیت بھی۔

اسلام نے کچھ حقوق عمومی طور سے تمام انسانوں کے لیے بیان کیے ہیں اور کچھ حقوق سماج کے الگ الگ طبقات کے لیے بھی ان کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کیے ہیں۔

عمومی حقوق میں جیسے سماجی برابری کا جو تصور پیارے آقا ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں پیش فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر۔

اسی طرح عورتوں کے حوالے سے اللہ پاک نے قرآن مقدس میں بیان فرمایا کہ اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق۔(1)

اللہ پاک نے فرمایا: جس نے کسی جان کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے بدلے کے بغیر کسی شخص کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کو (قتل سے بچا کر) زندہ رکھا اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔(2)

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: مسلمان کی سب چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام ہیں، اس کا مال، اس کی آبرو اور اس کا خون۔(3)

اسی طرح ایک اور حدیث ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا "پھر بلاشبہ اللہ نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتوں کو حرمت والا قرار دیا ہے، سوا اس کے حق کے، جیسا کہ اس دن کی حرمت اس شہر اور اس مہینہ میں ہے۔(4)

دوسری حدیث پاک ہے: جس کے ذِمّے اپنے بھائی کی عزّت یا کسی اور شے کے معاملے میں ظُلم ہو، اُسے لازِم ہے کہ (قیامت کا دن آنے سے پہلے) یہیں دنیا میں اس سے معافی مانگ لے، کیونکہ وہاں (یعنی روزِ محشر اس کے پاس) نہ دینار ہوں گے اور نہ دِرْہم، اگر اس کے پاس کچھ نیکیاں ہوں گی، تو بقدر اُس کے حق کے، اِس سے لے کر اُسے دی جائیں گی، اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو اُس (مظلوم) کے گناہ اِس (ظالم) پر رکھے جائیں گے۔(5)

نظام حقوق کی بات کی جائے اور اسلام کے نظام میراث پر گفتگو نہ کی جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی کہ اسلام نے جس وقت نظام میراث پیش کیا اس وقت اس طرح کا کوئی نظام موجود نہ تھا بلکہ میراث تو بہت دور کی بات سماج کے کئی طبقات تو زندگی کے بنیادی حق سے بھی محروم تھے اس زمانے میں اسلام نے مکمل صورت میں نظام حقوق پیش کیا۔ اسلام میں حقوق کی اہمیت کیا ہے اس کو واضح کرنے کے لیے کچھ شواہد پیش خدمت ہیں جن سے یہ اندازہ ہو گا کہ اسلام کا نظام حقوق کتنا پریکٹکل ہے، ملاحظہ ہو:

اللہ پاک کا ارشاد ہے: اور رشتہ داروں کو ان کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو۔(6)

اللہ پاک کا ارشاد ہے: اور ان کے مالوں میں حق تھا منگتا اور بے نصیب کا۔(7)

بخاری کی حدیث ہے: عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ! کیا میری یہ اطلاع صحیح ہے کہ تم (روزانہ) دن میں روزے رکھتے ہو اور رات بھر عبادت کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ! نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، روزے بھی رکھو اور بغیر روزے بھی رہو۔ رات میں عبادت بھی کرو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔(8)

مسلم شریف کی حدیث ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" : مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں۔ "پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا" : جب تم اس سے ملو تو اس کو سلام کرو اور جب وہ تم کو دعوت دے تو قبول کرو اور جب وہ تم سے نصیحت طلب کرے تو اس کو نصیحت کرو، اور جب اسے چھینک

آئے اور الحمدللہ کہے تو اس کے لیے رحمت کی دعا کرو۔ جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرو اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے پیچھے (جنازے میں) جاؤ۔(9)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" : کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ "انہوں نے عرض کیا، جس شخص کے پاس درہم ہوں نہ مال و متاع، آپ ﷺ نے فرمایا" : میری امت میں سے مفلس وہ شخص ہے جو روز قیامت نماز، روزے اور زکوۃ لے کر آئے گا اور وہ بھی آجائے گا جسے اس نے گالی دی ہو گی، جس کسی پر بہتان لگایا ہو گا، جس کسی کا مال کھایا ہو گا، جس کسی کا خون بہایا ہو گا اور جس کسی کو مارا پیٹا ہو گا، اس (مظلوم) کو اس کی نیکیوں میں سے نیکیاں دے دی جائیں گی، اور اگر اس کے ذمے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں تو ان (حق داروں) کے گناہ لے کر اس شخص پر ڈال دیے جائیں گے پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔(10)

یہ چند شواہد جو پیش کیے گئے ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں حقوق کی کیا اہمیت ہے۔

مصادر و مراجع

(1) البقرہ:228
(2) المائدہ:32
(3) ابو داؤد:4882
(4) بخاری 6785
(5) بخاری:2449
(6) بنی اسرائیل:26
(7) الذریت:19
(8) صحیح بخاری، 5199
(9) مسلم 5651
(10) مشکاۃ:5127

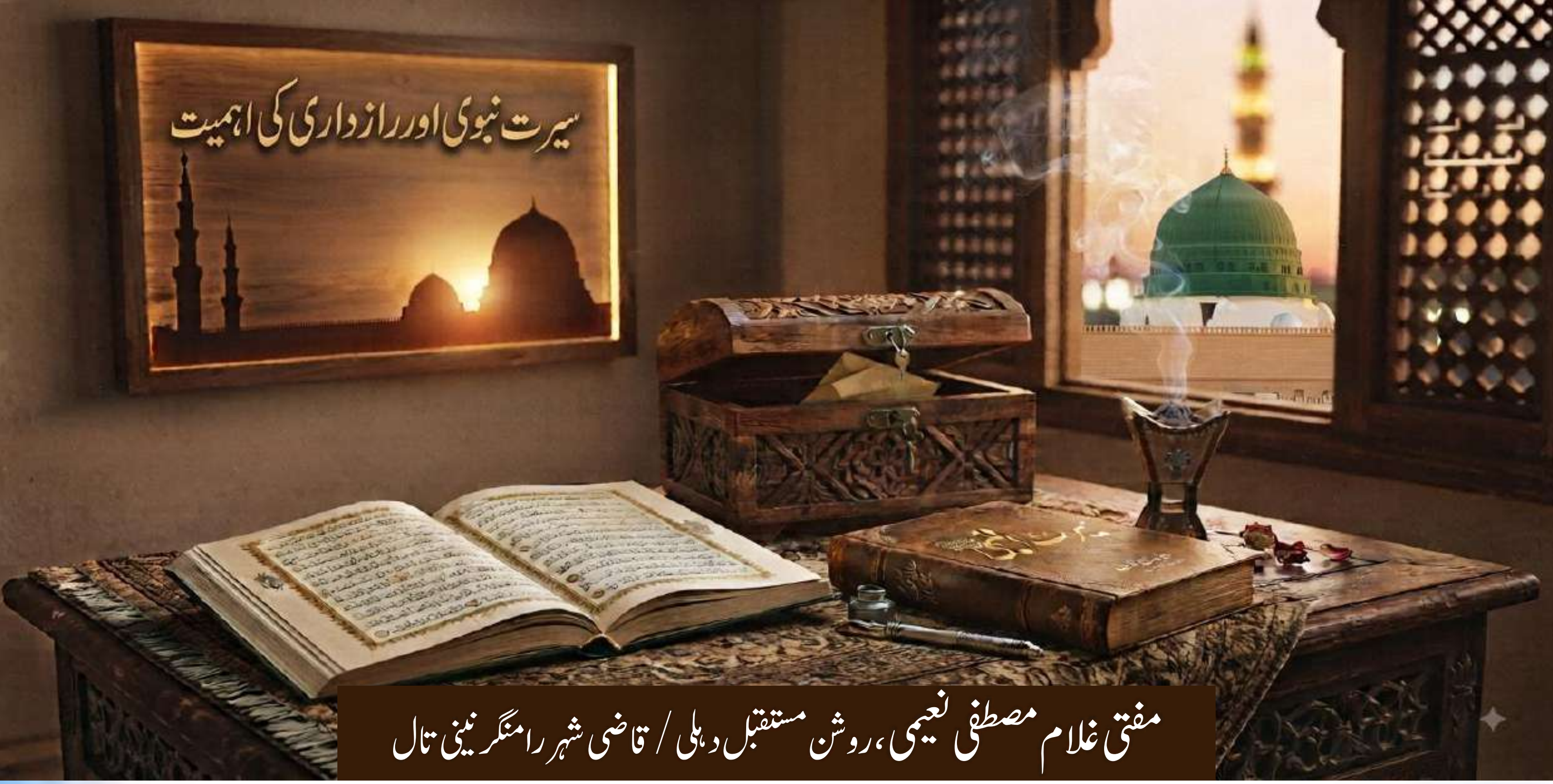

سیرت نبوی اور رازداری کی اہمیت

مفتی غلام مصطفی نعیمی، روشن مستقبل دہلی / قاضی شہر رامنگر نینی تال

ہمارا دین اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اس دین کی خوبی یہ ہے اس میں جہاں عقائد اور عبادات پر زور دیا گیا ہے وہیں اخلاقیات پر بھی اپنے ماننے والوں کی بھرپور رہنمائی کی گئی ہے۔ اخلاقیات کے باب ہی میں سے ایک اہم گوشہ رازداری کا بھی ہے۔ یعنی انسان اپنی اور دوسرے لوگوں کی ذاتی اور نجی نوعیت کی بات چیت کو پردہ راز میں رکھے۔ کسی دوسرے پر انہیں ظاہر نہ کرے۔ اسی عادت اور خوبی کا نام راز داری ہے۔ جب تک مسلمان اس خوبی سے متصف رہے تو عزتیں ان کے قدموں پر نثار رہیں لیکن جیسے جیسے مسلمان رازداری کی اہمیت سے غفلت برتتے گیے چیزیں بدلتی چلی گئیں اور آج مسلمان تاریخ کے بے حد نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں ضرورت ہے کہ سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لیں، خامیوں کو دور کریں اور اچھائیوں کو اختیار کریں۔

مسلمانوں کے زوال میں بہت سارے اسباب و عوامل شامل ہیں۔ جن میں ایک بڑا سبب رازداری سے غفلت برتنا بھی ہے۔ جس کی بنا پر ہمارے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے کام متاثر ہوتے آئے ہیں۔ رازداری کی اہمیت نہ سمجھنے اور اس کی حفاظت نہ کرنے کی بنا پر ہمارے زیادہ تر کام ابتدا ہی میں ناکام ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے دورِ زوال لگاتار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ویسے تو غور و فکر کا عمل دورِ عروج میں بھی جاری رہنا چاہیے تاکہ زوال کو راہ نہ

ملے، مگر زمانہ زوال میں اسبابِ زوال کی نشان دہی اور انہیں دور کرنے کی غور وفکر کرنا از حد ضروری ہے تاکہ زوال کی تاریکی ختم ہو اور عروج کا سورج طلوع ہو۔

رازداری کی اہمیت:

﴿إذا حدث الرجل الحديث ثم التفت فهي أمانة﴾(1)

جب تم میں سے کوئی آدمی بات بیان کرے پھر (اسے راز میں رکھنے کے لیے) دائیں بائیں دیکھے تو وہ بات تمہارے پاس امانت ہے۔

دوسرے مقام پر حضور پاک یوں فرماتے ہیں:

﴿استعينوا على قضاء حوائجكم بالكتمان فإن كل ذي نعمة محسود﴾(2)

لوگوں سے چھپا کر اپنے مقاصد کی کامیابی پر مدد طلب کرو کیوں کہ ہر نعمت والا حسد کیا جاتا ہے۔

ان روایات میں دو اہم نکتوں کی نشان دہی کی گئی ہے؛

۱/ راز امانت ہے۔

۲/ رازداری کامیابی کی بنیاد ہے۔

پہلی روایت کا تعلق انسانوں کے اس طبقے سے ہے جس کا اپنا تو کوئی راز نہیں ہوتا لیکن اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے راز میں شریک کرلیا جاتا ہے۔ اس انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ راز کو امانت سمجھے اور کسی طرح کی خیانت نہ کرے اگر خیانت کی تو دنیا میں اپنا بھرم کھوئے گا اور آخرت میں اللہ کو جواب دہ ہوگا۔

دوسری روایت کا تعلق ان انسانوں سے ہے جو کسی اہم کام کی تکمیل میں جٹے ہیں، انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بنیادی مقاصد کو ہر کس وناکس سے کہتے نہ پھریں بلکہ بہ کمال حکمت مقاصد کو پوشیدہ رکھیں، پھر لوگوں سے مقاصد کے حصول کے لیے مدد طلب کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ مقاصد ظاہر ہوجانے سے سب کچھ ابتدا میں ہی ختم ہوجائے۔

انسانوں کے دو طبقے:

اگر ہم اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں تو ہمیں اپنے آس پاس موجود_ انسانوں میں دو بنیادی طبقے نظر آئیں:

۱۔ کام کرنے والے

۲۔ کام نہ کرنے والے

رسول کریم ﷺ نے کام کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے مقاصد کی کامیابی تک رازداری کا خصوصی اہتمام کریں۔ کسی پر بھی اپنے دل کا راز ظاہر نہ کریں۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے سفر دیگر افراد کی ضرورت پیش آئے تو اچھی طرح چھان پھٹک کریں۔ ایک دم ان پر اپنے مقاصد ظاہر نہ کریں بلکہ پوشیدہ رکھیں تاکہ کامیابی کی راہ میں مشکلات نہ آئیں۔

کام نہ کرنے والوں میں دو طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں:

۱۔ موافقت کرنے والے۔

۲۔ مخالفت کرنے والے۔

مخالفت کرنے والے تو خارج از بحث ہیں کہ انہیں تو سرے سے کسی راز میں شامل ہی نہ کیا جائے، ہاں جس سے موافقت اور حمایت کی امید ہے اسے رسول کریم ﷺ نے امانت کا پابند بنایا ہے کہ جب وہ کسی راز میں شریک ہو جائے تو بہر صورت راز کی حفاظت کرے اگر ایسا نہ کیا تو وہ قیامت کے دن خیانت کرنے والوں میں شمار کیا جائے گا۔ آقائے کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ﴾(3)

سیرت مصطفٰی اور رازداری کی تربیت:

رازداری صرف راز کی حفاظت ہی نہیں ہوتی بل کہ وہ آپ کے مقصد و مشن کی کامیابی کی کنجی بھی ہوتی ہے۔ کامیابی کا سفر بغیر رازداری کے طے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ آپ بھلے ہی کتنے طاقت ور ہوں۔ آپ کا دشمن اگرچہ کتنا ہی کمزور ہو، اگر آپ کے راز محفوظ نہیں ہیں تو آپ کبھی بھی دشمن کو زیر نہیں کر سکتے۔ ہمارے نبی سید عالم ﷺ کی سیرت مبارکہ میں جا بجا رازداری کے اہتمام نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حضور کی ذات کریمہ وہ ہے جو﴿وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ـ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى﴾کی مصداق ہے۔ اس کے باوجود بھی حضور اقدس ﷺ نے رازداری کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا اور اپنے صحابہ و صحابیات کی بھی اس طرز پر تربیت

فرمائی تاکہ وہ بھی رازوں کی حفاظت کا ہنر اور رازداری کا ملکہ حاصل کر سکیں۔ رازداری کی اہمیت پر نبی اکرم ﷺ کی تربیت و حکمت کا اندازہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے لگائیں، فرماتے ہیں:

﴿أَتَى عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَأَنَا أَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ، قَالَ: فَسَلَّمَ عَلَيْنَا، فَبَعَثَنِي إِلَى حَاجَةٍ، فَأَبْطَأْتُ عَلَى أُمِّي، فَلَمَّا جِئْتُ قَالَتْ: مَا حَبَسَكَ؟ قُلْتُ بَعَثَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ لِحَاجَةٍ، قَالَتْ: مَا حَاجَتُهُ؟ قُلْتُ: إِنَّهَا سِرٌّ، قَالَتْ: لَا تُحَدِّثَنَّ بِسِرِّ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَحَدًا۔﴾ (4)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اس وقت میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ آپ نے ہم سب کو سلام کیا اور مجھے کسی کام کے لیے بھیج دیا تو میں اپنی والدہ کے پاس تاخیر سے پہنچا، جب میں گھر پہنچا تو والدہ نے پوچھا تمھیں دیر کیوں ہوئی؟ میں نے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے کسی کام سے بھیجا تھا۔ انھوں نے پوچھا، وہ کام کیا تھا؟ میں نے کہا وہ ایک راز ہے۔ میری والدہ نے کہا تم رسول اللہ ﷺ کا راز کسی پر ظاہر نہ کرنا۔

اس روایت میں کئی چیزیں غور طلب ہیں جو مجموعی طور پر ہمارے لیے تربیت و حکمت کا بہترین خزانہ ہیں:

حضرت انس کی رازداری کا اندازہ اس سے بھی لگائیں کہ آپ نے حضرت ثابت سے یہ روایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاللهِ لَوْ حَدَّثْتُ بِهِ أَحَدًا لَحَدَّثْتُكَ يَا ثَابِتُ﴾۔ (5)

اے ثابت! اللہ کی قسم اگر میں وہ راز کسی کو بتاتا تو تمہیں ضرور بتاتا۔

یعنی حضرت انس نے بچپن کے راز کی حفاظت اخیر عمر تک فرمائی، اس طرز عمل سے آپ اندازہ لگائیں کہ رسول پاک ﷺ نے اپنے صحابہ کی کیسی تربیت فرمائی اور رازداری کے تعلق سے صحابہ کرام کا مزاج و منہج کیسا تھا۔

خاتون جنت کی رازداری:

حضور سید عالم ﷺ نے اپنے صحابہ واہل بیت کی تربیت کس انداز سے فرمائی تھی اس پر سیکڑوں احادیث کریمہ اور تاریخی روایات شاہد ہیں۔ سر دست یہاں خاتون جنت سید فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی ایک روایت پیش کی جاتی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کی کس اعلیٰ درجے کی تربیت فرمائی۔ روایتوں میں

آتا ہے کہ نبی ﷺ کی وفات کے قریب آپ کے پاس امہات المومنین موجود تھیں۔ اتنے میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں۔ ان کے چلنے کا انداز ہو بہو نبی ﷺ کی طرح تھا۔ جب وہ تشریف لائیں تو نبی کریم ﷺ نے انہیں خوش آمدید کہا اور اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ پھر ان سے ایک راز کی بات کہی تو وہ رونے لگیں، پھر نبی ﷺ نے جب دیکھا کہ فاطمہ رو رہی ہیں تو ایک اور راز کی بات کہی تو سیدہ مسکرانے لگیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے سیدہ فاطمہ سے پوچھا کہ آپ کے رونے کی وجہ کیا ہے؟ تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

﴿مَا كُنْتُ لِأُفْشِيَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِرَّهُ۔﴾(6)

ترجمہ: میں نبی پاک ﷺ کا راز نہیں کھول سکتی۔

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے اس راز کو راز ہی رکھا۔ حالانکہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہر لحاظ سے امانت دار تھیں مگر امانت راز کی بنیاد پر سیدہ فاطمہ نے راز کی حفاظت کا خوب اہتمام کیا۔

بیعت عقبہ اور پیغام رازداری:

تاریخ اسلام میں بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اس لیے بڑی اہم ہے کہ اسی کے ذریعے انصار مدینہ میں دعوت دین کا آغاز ہوا۔ اور مکہ مکرمہ سے دور مدینہ طیبہ میں مرکز اسلام بنانے کی کوششوں کی شروعات ہوئی۔ اعلان نبوت کے گیارہویں سال انصار مدینہ کے بارہ[۱۲/] افراد داخل اسلام ہوئے۔ قبول اسلام کا یہ معاملہ جس وادی میں پیش آیا اسے ہی وادی عقبہ کہا جاتا ہے، اور اس بیعت اسلام کو بیعت عقبہ کہا گیا۔ حضور نبی کریم ﷺ ان لوگوں کی دینی تربیت اور دیگر لوگوں تک دعوت اسلام پہنچانے کی غرض سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل مدینہ کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ انہیں کی تبلیغی کوششوں کی بدولت ایک سال میں انصار مدینہ کے دونوں قبیلوں، قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے کئی ذمہ دار افراد سمیت درجنوں افراد حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔

اسلامی مشن درست سمت میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ انصار مدینہ میں اسلام کی محبت اور ان کا خلوص حضور پاک ﷺ کو اس بات کے لیے راضی کر رہا تھا کہ حضور مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر ان کے دیار کو اپنا وطن

ثانی بنالیں۔ اسی مقصد کے اظہار کے لیے ستر [۷۰/] سے زائد افراد پر مشتمل ایک وفد حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آیا۔ اتفاق سے اس وفد میں اہل ایمان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہو گیے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر اور انصار مدینہ کے چنندہ افراد نے حضور پاک سے ملاقات کی۔ جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے ان کے نام گنوائے اور سبھی لوگوں کے ساتھ ایک تفصیلی ملاقات اور آئندہ کے لیے کسی ٹھوس اور مستقل پالیسی طے کرنے کے لیے ایک مجلس منعقد کرنے کی گزارش کی۔ اسی گفتگو میں طے ہوا کہ ایام تشریق کی فلاں رات میں وادی عقبہ ہی میں ایک تفصیلی میٹنگ منعقد کی جائے گی۔ حضور پاک ﷺ اس ملاقات اور اگلی میٹنگ دونوں کو صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ مشرکین مکہ کو اس کا پتا نہ چل جائے اور وہ اس میٹنگ کو ناکام بنانے کے لیے ہلہ نہ بول دیں۔ جس سے یہ ساری کوششیں ناکام نہ ہو جائیں۔

انصار مدینہ اور رازداری کا اہتمام:

انصار مدینہ نے حضور پاک ﷺ رازداری کا وعدہ تو کر لیا مگر انصار مدینہ کا ایک پہلو حد درجہ نازک تھا کہ ان کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت ابن مالک فرماتے ہیں کہ جو مشرک ہمارے ساتھ آئے تھے ان میں ایک عبد اللہ ابن عمرو ابن حرام بھی تھا، جو ہمارے سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ چونکہ عبد اللہ بن عمرو سردار تھا، اسے اس مجلس کے بارے میں بتاتے تو راز کھل جانے کا خطرہ تھا، نہ بتاتے تو آگے چل کر اس کی ناراضگی اور دشمنی کا ڈر تھا۔ لیکن عبد اللہ بن عمرو کی طبیعت میں سنجیدگی اور شعور کا پہلو غالب تھا۔ اس لیے انصار مدینہ کو لگا کہ اگر مناسب انداز میں عبد اللہ بن عمرو سے بات کی جائے تو اسے بھی داخل اسلام کیا جا سکتا ہے۔ مزاج کی واقفیت اور انداز گفتگو پر یقین نے اس سے بات چیت پر ابھارا۔ اس کی منصبی پوزیشن کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی شستہ لہجے میں اس سے کہا گیا:

اس طرح مسلسل شائستگی اور عمدگی کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اسے دعوت اسلام پیش کی گئی۔ انصار کے خلوص، سنجیدہ انداز بیان اور حیثیت عرفی کے مطابق کلام نے اس پر اچھا اثر ڈالا، نتیجہ یہ نکلا کہ عبد اللہ بن عمرو مسلمان ہو گیا۔ ہم نے اسے حضور سے ملاقات اور آئندہ کی میٹنگ کے بارے میں بتایا وہ شریک بھی ہوا، اور رازداری کا بھی پورا خیال رکھا۔

مقررہ وقت کے مطابق جب ایام تشریق کی وہ رات آئی جس میں حضور سید عالم ﷺ سے ملاقات طے ہوئی تھی تو انصار مدینہ نے رازداری کا پورا خیال رکھا۔ اپنے ساتھ آئے ہوئے مشرکین سے معاملات پوشیدہ رکھنے کی خاطر

وہ لوگ شام کے اول وقت ہی بستروں پر لیٹ گیے، تاکہ آس پاس والوں کو یہ محسوس ہو کہ شاید زیادہ چلنے پھرنے کی وجہ سے یہ لوگ پوری طرح تھک گیے ہیں۔ ان لوگوں کے بعد ہی دوسرے مشرکین بھی لیٹ گیے۔ اب سبھی لوگ سو چکے تھے ۔رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ انصار مدینہ کے سارے مشرکین ساتھی نیند کی آغوش میں مست تھے۔ حالات سازگار دیکھ کر انصار مدینہ اپنے بستروں سے بڑی خاموشی کے ساتھ اٹھے۔ اس خاموشی سے کہ پائوں کی آہٹ بھی نہ سنائی دے۔ اس طرح ایک ایک، دودو، کرکے یہ لوگ وادی عقبہ میں پہنچنے میں کامیاب رہے۔

غور کریں! انصار مدینہ نے کس قدر سوجھ بوجھ، عقل مندی اور، رازداری کا کیا ہی بہترین مظاہرہ کیا۔ انصار مدینہ کی تعداد تقریباً پچھتر[۷۵] تھی۔ یہ سبھی لوگ ایک ایک، دودو کرکے وہاں سے نکلے۔ ایک ساتھ نکلتے تو یقیناً سب کے چلنے کی آواز سن کر کوئی بھی جاگ سکتا تھا۔ اس طرح راز کھل جانے کا ڈر تھا۔ اسی وجہ یہ سارے لوگ ایک ایک، دودو کی تعداد میں نکلے تاکہ کوئی بیدار نہ ہو سکے۔ اس طرح ایک ایک، دودو کی تعداد میں نکلنے میں تھوڑا بہت وقت ضرور لگا ہو گا، کیوں کہ نکلنے والے ستر سے زیادہ تھے۔ پھر وہاں سے وادی عقبہ آنا تھا اور ان لوگوں کے جاگنے سے واپس بھی آنا تھا۔ یہ سارے کام کس قدر نازک اور حساس تھے مگر جب انسان اپنے مقصد میں مخلص ہو، رازداری کی اہمیت کو جانتا ہو اور اس کی نگاہ اپنے مشن پر ہو تو مشکل ترین کام بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے آسان ہو جاتے ہیں۔

حضور پاک اور رازداری کا اہتمام:

انصار مدینہ مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی وادی عقبہ پہنچ گیے تھے۔ اب حضور ﷺ کا انتظار تھا۔ حالانکہ حضور پاک کا یہاں آنا انصار سے بھی زیادہ نازک اور پر خطر تھا۔ انصار تو پھر بھی اسی وادی کے بغل ہی میں خیمہ لگائے ہوئے تھے لیکن حضور کو باضابطہ شہر مکہ اور وہ بھی خاص جوار کعبہ سے نکل کر شہر کے باہر تک آنا تھا۔ خدا خدا کرکے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اندھیری وادیوں کے درمیان سے آمنہ کا ماہ تمام جلوہ گر ہوا۔

حضور سید عالم ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت علی رضی اللہ عنہما اور آپ کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ حضرت عباس ابھی تک داخل اسلام نہیں ہوئے تھے لیکن رشتہ محبت کی خاطر آپ کے ساتھ چلے آئے تھے۔ علامہ برہان الدین حلبی نے اپنی کتاب سیرت حلبیہ میں یہ روایت تحریر فرمائی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ حضرت عباس کے علاوہ حضرت ابو بکر اور سیدنا علی المرتضی بھی تھے۔ لیکن جب

اس وادی میں حضور تشریف لے جانے لگے، جہاں انصار سے ملاقات ہونی تھی تو ازرہِ احتیاط حضرت ابو بکر کو اس سڑک کی نگرانی کے لیے ایک جگہ کھڑا کر دیا۔ سیدنا علی المرتضی کو وادی کے دہانے پر مقرر کیا تاکہ وہ اس کی نگہبانی کریں۔ دونوں حضرات کو اہم جگہوں پر تعینات کرنے کے بعد حضور نے اپنے چچا حضرت عباس کو اپنے ساتھ لیا اور انصار مدینہ سے ملاقات کی۔

نبی کونین ﷺ کے طرز عمل اور رازداری کے اہتمام پر غور کریں تو حکمت کے کتنے ہی دروازے کھلتے ہیں۔ بیعت عقبہ کے موقع پر آپ کے اقدامات یہ واضح کر دیتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے مقصد حاصل نہ کر لے اسے حد درجہ رازداری اور پوشیدگی سے کام لینا چاہیے۔ اب اس واقعہ سیرت کے ضمن میں حاصل ہونے والے نکات پر غور کریں:

☆ حضور چاہتے تو یہ ملاقات دن میں بھی کسی مقام پر کی جا سکتی تھی لیکن دن آخر دن ہوتا ہے، اس میں رات جیسی وسعت اور چھپاؤ نہیں ہوتا۔ راز، راز نہیں رہ پاتا اور بات بننے سے پہلے ہی خراب ہو سکتی تھی۔ دن کے وقت چلت پھرت زیادہ ہوتی ہے۔ راستوں میں لوگ ملتے رہتے ہیں اس لیے حضور کا کسی سے ملنا پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا ۔ دن کے وقت میں انصار مدینہ اپنے مشرک ساتھیوں سے اتنی دیر تک الگ نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی انہیں ہٹا سکتے تھے۔ دن کے وقت شہر مکہ میں کسی بھی جگہ اتنی دیر تک مجلس کرنا بے حد مشکل اور نازک امر تھا۔

☆ حضور پاک نے اس راز میں صرف تین لوگوں کو شامل کیا جن میں دو لوگ وہ تھے جو صاحب ایمان اور حضور کے معتمد ترین افراد تھے۔ تیسرے فرد حضرت عباس اگرچہ اس وقت تک مومن نہیں تھے لیکن آپ خونی رشتے اور آپ سے محبت کی وجہ سے بے حد معتمد تھے۔ اسی محبت کی بنا پر انہوں نے حضور کے ساتھ شعب ابی طالب میں کفار مکہ کے تین سالہ بائیکاٹ کی مشقتوں کو بھی برداشت کیا تھا۔ جب کہ وہ مسلمان بھی نہیں تھے مگر محبت رسول کی بنیاد پر حضرت عباس نے کافروں کی بجائے حضور ﷺ کا ساتھ دیا۔ اسی بنا پر حضور اس اہم اور نازک موقع پر انہیں اپنے ساتھ لائے تھے۔

☆ میٹنگ کا وقت اگرچہ رات میں تھا مگر پھر بھی حضور اپنے ساتھ تین لوگوں کو لائے تاکہ راستے وغیرہ کی نگرانی میں مدد لی جا سکے۔ تنہا یہ کام کرنا بہ ظاہر آسان نہ تھا۔ حضور ﷺ حضرت ابو بکر اور حضرت علی کو دو الگ الگ

مقامات کی نگرانی پر تعینات کیا، تاکہ کسی دشمن کی ممکنہ آمد اور دخل سے محفوظ رہا جاسکے اور بروقت اطلاع مل سکے، کیوں کہ رازداری کے لاکھ اہتمام کے باوجود دشمن سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اہم منصوبہ بندی کے وقت مقام مجلس کو غیر کے عمل دخل اور راز کو لیک ہونے سے بچانا پہلی ترجیح ہونا چاہیے۔

☆حضرت ابو بکر اور حضرت علی کے انتخاب سے معلوم ہوا کہ آپ کے راز میں وہی لوگ شامل ہوں جو آپ کے مقصد و مشن کی اہمیت کو جانتے بھی ہوں اور اسے پورے طور پر اپنا مقصد و مشن سمجھتے بھی ہوں۔ ان دونوں حضرات کے انتخاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ساتھ ذہانت، ہوشیاری اور بہادری بھی ضروری ہے۔ رازداری کے معاملات میں یہ چیزیں بے حد ضروری ہوتی ہیں۔

☆حضرت عباس ایک ذمہ دار، بھاری بھر کم اور بات چیت میں ماہر تھے۔ ان کا انتخاب یہ بتاتا ہے کہ گفتگو کے وقت معاملہ فہم اور موثر شخص کا ہونا بھی بڑا مفید اور ضروری ہوتا ہے۔

ہمارا رویہ کیا ہے؟

﴿سرك أسيرك فإذا تكلمت به صرت أسيره﴾(7)

تمہارا راز تمہارا قیدی ہے اگر تم نے اسے ظاہر کردیا تو اب تم راز کے قیدی ہو۔

رازداری ایک ہنر ہے:

رازداری محض کہنے سننے کی بات نہیں ایک حقیقی ہنر ہے جو قوموں کے عروج وزوال میں اہم اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا قول ہے؛

﴿القلوب أوعية ألاسرار، والشفاه أقفالها، والألسن مفاتيحها، فليحفظ كل امرى مفتاح سره.﴾(8)

دل رازوں کا برتن ہے، دونوں ہونٹ اس کا تالا ہیں اور زبان اس کی کنجی ہے۔ لہذا ہر انسان اپنے راز کی حفاظت کرے۔

ایک فارسی شاعر کا کہنا ہے:

با نامحرم حدیث اسرار مگو
با مردودان حکایت از یار مگو

نامحرم سے اپنے راز کی بات نہ کرو، مردود شخص سے اپنے دوست کی حکایت نہ کہو۔

با مردم اغیار جز اغیار مگو
با اشتر خار خوار جز خار مگو

غیروں کے ساتھ صرف غیر کی سی بات کرو، اور اونٹ سے خار کھانے کے سوا کوئی بات نہ کرو۔

یعنی ہر بات ہر شخص سے نہیں کرنی چاہیے۔ راز اور اہم باتیں صرف قابلِ اعتماد اور مخلص لوگوں کو بتانی چاہئیں، ورنہ نادان یا بدخواہ لوگ اس کا غلط استعمال کریں گے۔ ہمارے اسلاف نے راز کی حفاظت اور رازداری برتنے کی کس قدر تاکید فرمائی ہے مگر ہمارا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ ہماری تنظیمیں پہلے دن ہی اپنے راز ظاہر کر کے سب کی نگاہوں میں بھی آجاتی ہیں اور کامیابی کا راستہ بھی ہماری پہنچ سے دور ہو جاتا ہے جو تمام تر کوششوں کے بعد بھی ہماری پکڑ میں نہیں آتا۔

کیا اغیار سے کچھ سیکھیں گے؟

چند سال پہلے (8 جولائی 2021) کو بھارت کی سب سے بڑی اور طاقت ور تنظیم آر ایس ایس نے مستقبل کے چلینج اور موجودہ مشکلات کے حل کے لیے پانچ روزہ میٹنگ منعقد کی۔ میٹنگ کی رازداری بنائے رکھنے کے لیے اسے دلّی سے سات سو کلو میٹر دور چتر کوٹ (ایم پی) میں منعقد کیا۔ دلی و ممبئ جیسے شہر میں رازداری نہایت مشکل تھی اس لیے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک آشرم میں یہ مجلس منعقد ہوئی۔ آر ایس ایس نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ 13 کلو میٹر پہلے سے ہی بیرونی افراد کے لیے داخلہ بند کرا دیا تاکہ کوئی جاسوس صحافی بھی کسی صورت وہاں نہ پہنچ سکے۔

ٹھنڈے دماغ سے سوچیں!

اس وقت مرکز سمیت اکثر ریاستوں میں ان کی حکومت ہے۔ ایوان صدر سے ضلع انتظامیہ تک ان کا رسوخ ہے، پھر بھی وہ اس قدر رازداری کیوں برتتے ہیں؟

شاید کوئی خطرناک منصوبہ ہو!!

زیادہ تر لوگ یہی جواب دیں گے، لیکن اگر وہ کھلے عام بھی ایسا منصوبہ بنائیں تو انہیں کون روک سکتا ہے؟ آئے دن ان کے کارکنان اقلیت مخالف بیانات دیتے رہتے ہیں، دستور ہند بدلنے کی بات کرتے ہیں، مسلم کو لڑکیوں کو اٹھانے اور مسلمانوں کو جبراً ہندو بنانے کی بات کرتے رہتے ہیں، کیا قانون وانتظامیہ نے انہیں روکا تو آر ایس ایس بھی کھلے عام ایسا منصوبہ بیان کر دے تو کون روک سکتا ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ وہ ایک بیدار اور حقیقت پسند تنظیم ہے وہ جانتے ہیں کہ راز جتنا کم لوگوں کے درمیان رہے کامیابی کے امکان اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ راز جب آؤٹ ہو جائے تو تعداد یا طاقت بھی اسے کامیاب نہیں بنا سکتی کیوں کہ مقابل دفاعی تیاری شروع کر دیتا ہے، بس اسی بنیادی نکتے کے مد نظر آر ایس ایس نے رازداری کا اتنا اہتمام کیا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جس قوم کے پاس اقتدار کی طاقت ہے وہ بنیادی اصولوں کا کتنا خیال رکھتی ہے اور ایک ہم ہیں جو ملک کی سب سے پس ماندہ اور کمزور قوم ہیں لیکن ہمارے تنظیمی اجلاس اس انداز میں ہوتے ہیں مانو ہم دور مغل میں جی رہے ہوں۔ وقت رہتے ہمیں اپنے رویوں اور طریقہ کار میں تبدیلی لانے اور سیرت مصطفےٰ ﷺ پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ زوال کا دور ختم ہو اور ہم پھر سے عظمت رفتہ حاصل کر سکیں۔

مصادر و مراجع

(1) سنن ترمذی رقم الحدیث 1959

(2) رواہ الطبرانی فی الصحیح: 943

(3) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، حدیث: 4868

(4) صحیح مسلم رقم الحدیث 6378

(5) صحیح مسلم رقم الحدیث 6378

(6) صحیح بخاری: رقم الحدیث: 3624

(9) ادب الدنیا والدین، للماوردی

(10) ادب الدنیا والدین للماوردی

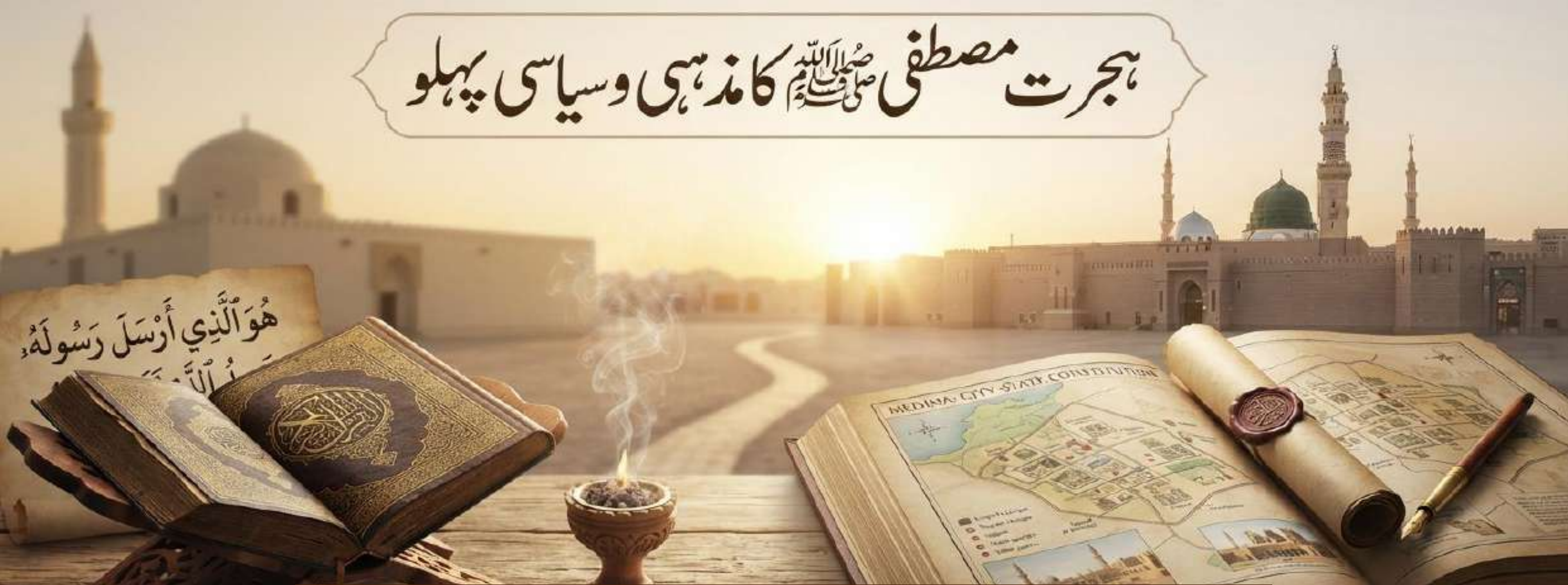

ہجرت مصطفی ﷺ کا مذہبی وسیاسی پہلو

مفتی محمد فیضان سرور مصباحی، دارالقضاء ادارۂ شرعیہ، اورنگ آباد، بہار

ہجرتِ نبوی ﷺ اسلامی تاریخ کا وہ عظیم باب ہے، جس نے دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ کوئی معمولی نقل مکانی نہ تھی، بلکہ ایک ایسی اعتقادی، دینی، اخلاقی اور سیاسی تحریک کا آغاز تھی جس نے انسانیت کو ظلم و جبر کے اندھیروں سے نکال کر ایمان، عدل، مساوات، اور اخوت کے نور سے منور کر دیا۔

ہجرتِ مدینہ کا پس منظر:

نبی کریم ﷺ نے جب مکہ میں دعوتِ توحید شروع کی تو قریش کے سرداروں نے مخالفت کی انتہا کر دی۔ کیوں کہ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ توحید کی صدا ان کے باطل اقتدار، طبقاتی نظام، اور جاہ و منصب کے لیے خطرہ ثابت ہو کر رہے گی۔ چنانچہ توحید کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے والے مسلمانوں کو ستایا گیا، بائیکاٹ کیا گیا، شہید کیا گیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تپتی ریت پر لٹایا گیا، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا، دیگر صحابۂ کرام کو بھی تختۂ مشقِ ستم بنایا گیا۔ اذیت ناک سزا دی گئی۔ یہاں تک کہ خود نبی ﷺ پر اوجھڑی کی غلاظت ڈالی گئی، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، اور طائف میں پتھر برسائے گئے۔ ایسے سخت حالات میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اور ان کے جاں نثار صحابہ نے صبر کا مظاہرہ فرمایا۔

مگر جب ظلم کا پانی سر سے اونچا ہو گیا، ہر طرف سے امن کے راستے بند کر دیے گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو مدینہ شریف کی طرف ہجرت کا حکم دیا، جہاں پہلے ہی ایمان لانے والوں کی ایک جماعت آپ ﷺ کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

ہجرت مدینہ کے مذہبی وروحانی پہلو

(۱) ایمان ویقین کا کمالِ مظاہرہ: ہجرت نے اہلِ ایمان کو ایمان باللہ اور توکل کا درس دیا۔ غارِ ثور میں دشمن سر پر کھڑا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ اپنے رفیق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہیں:

﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾(1)

غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ کلمات تاریخ کے ہر مومن کے لیے پیغام ہیں کہ مومن کی سب سے بڑی طاقت اس کا "اعتمادِ الٰہی" ہے۔

(۲) قربانی وایثار اسلام کی روح:

ہجرت کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ایمان قربانی مانگتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جان ومال سب کچھ دین کی راہ میں لگا دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر نبی کریم ﷺ کے بستر پر رات گزاری۔ مہاجرین نے وطن، رشتے، اور مال سب چھوڑ کر ایمان کی خاطر نکلے۔ یہی ایثار قربانی اسلام کی اصل روح ہے۔

(۳) ایمان کا عملی امتحان:

دنیا میں الفت ومحبت کے زبانی دعویداروں کی کمی نہیں ہے، مگر جب اس کے عملی تقاضے پورا کرنے کی باری آتی ہے تو کچھ لوگ راہ فرار ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیں تو ہجرت، ایمان کی سچائی کی علامت تھی۔ اور ہجرت نے ظاہر کر دیا کہ یہ لوگ اپنے ایمان میں سچے اور مخلص ہیں، اور خوشحالی ہو کہ پریشانی ہر حال میں رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں۔

قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ﴾(2)

بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور اللہ کے راستے میں ہجرت وجہاد کیا، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

چنانچہ رحمت الٰہی سے امید لگائے ہوئے مہاجرین نے ایمان کی حفاظت کے لیے تمام مصائب و آلام برداشت کیے، ایمان کی خاطر وطن، مال، اور خاندان قربان کیے۔ اور اپنے ایمان کے عملی امتحان میں سو فیصد کھرے اترے۔

(۴) عبادت کی آزادی اور شعائرِ اسلام کا ظہور:

مکہ مکرمہ میں اذان، نمازِ باجماعت، اور دینی تعلیمات اور علانیہ شعائر اسلام کی ادائیگی پر پابندیاں عائد تھیں۔ ہجرت کا فائدہ یہ ملا کہ یہ تمام پابندیاں جاتی رہیں، چنانچہ مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ سامنے آیا کہ مسجدِ قبا کی بنیاد رکھی گئی، پھر مسجدِ نبوی تعمیر کی گئی، پھر وہی مسجد؛ دین، علم، عدل، اور سیاست کا مرکز بنی۔ جہاں عبادت بھی تھی، تعلیم بھی، اور عدل و مشاورت بھی۔ اب یہاں پوری مذہبی آزادی کے ساتھ شعائر اسلام انجام دیے جانے لگے۔ اذان، جماعت، تعلیم، شوریٰ؛ سب کا آغاز ہجرت کے بعد ہوا۔

(۵) رشتۂ مواخاتِ مدینہ، معاشرتی اتحاد کی اساس:

نبی اکرم ﷺ نے مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا۔ اور اہل مدینہ کو مزاج دیا کہ مال واسباب اور گھر و خاندان چھوڑ کر آنے والے مکہ کے دینی بھائیوں کے لیے کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرو، اور انھیں اپنا بھائی بنالو، آپ ﷺ کی ترغیب پر انصار مدینہ نے بھائی چارہ کی وہ مثال قائم کی آج تک پوری دنیا اس کی مثال قائم کرنے سے قاصر ہے۔

ایک ایک انصاری بھائی نے اپنے گھر، مال، اور دل سب کے دروازے کھول دیے۔ اور مہاجر بھائی کو ان میں شریک کر لیا۔ حتی کہ جن کی متعدد بیویاں تھی، انھوں نے اپنے مہاجر بھائی کے لیے، ان کی باہمی رضامندی سے، طلاق و عدت کے بعد ازدواجی رشتہ میں منسلک کر دیا۔ یہ رشتہ خون کے نہیں، ایمان کے رشتے پر قائم ہوا تھا، جس نے انسانی تاریخ میں مثالی ”معاشرتی و قومی اتحاد“ کی بنیاد رکھی۔

قرآن نے اس جذبے کو یوں سراہا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(3)

وہ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ضرورت مند ہوں۔

ذرا نگاہِ بصیرت سے دیکھیے تو یہ محض دو گروہوں کا اتحاد نہیں بلکہ ایسے متفرق دلوں کا انضمام تھا۔ جو کبھی اپنی سختی و سنگدلی اور قبائلی و علاقائی اور نسلی امتیازات و تعصبات کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ بظاہر ایسا ہو جانا مستبعد

اور ناممکن سا معلوم ہوتا تھا، مگر دولت ایمان سے لبریز دلوں میں اللہ تعالی نے وہ جذبۂ ایثار پیدا کر دیا کہ اب رہتی دنیا میں وہ ایک بے مثال نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن نے اس کو یوں بیان کیا:

﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾(4)

اگر تو زمین بھر دولت خرچ کر دیتا، تو بھی ان کے دل نہ ملا سکتا، مگر اللہ نے ملا دیے۔

یہی مواخات آج کے امتِ مسلمہ کے لیے اخوت واتحاد کا سنہرا نمونہ ہے۔

(۶) دین سے ریاست تک کا انقلابی سفر:

ہجرت سے پہلے اسلام ایک دعوت تھا، لیکن مدینہ میں اسلام ایک "نظامِ حیات" بن گیا۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، جہاد، معاشرت، حدود، وراثت، سب احکام اب ایک منظم ریاستی ڈھانچے میں نافذ ہونے لگے۔ یوں ہجرت نے اسلام کو انفرادی عبادت سے اجتماعی نظام کی طرف منتقل کر دیا۔

(۷) دینی درسگاہ اور مرکزِ تعلیم وتربیت:

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ علم وشعور کا گہوارہ بن گیا۔ مسجدِ نبوی درس وتدریس کا مرکز، صفہ علم وزہد کی درس گاہ، اور صحابہ اس کے فارغ التحصیل عالم وصوفی بنے۔ اسلامی تمدن میں علم وقیادت کا یہ مرکز ہجرت کا براہِ راست ثمر ہے۔

ہجرت مدینہ کے سیاسی پہلو

(۱) ریاستِ مدینہ۔ سیاسی نظم وقیادت:

مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے اہم مرحلہ "ریاست" کا قیام ثابت ہوا۔ دنیاوالوں کی نظر میں نبی کریم ﷺ اب صرف نبی نہیں رہے، بلکہ سربراہِ مملکت، قاضی، امام اور سپہ سالار بھی بنے۔ یہ اسلامی سیاست کا پہلا روشن نمونہ تھا، جس میں وحی کی رہنمائی میں عدل، مساوات، اور شوریٰ کا نظام قائم ہوا۔ یہ اس وقت دنیا کی پہلی آئینی ریاست تھی جو وحی الٰہی کے اصولوں پر قائم ہوئی۔

(۲) میثاقِ مدینہ۔ پہلا تحریری آئین:

مدینہ میں مختلف قبائل اور مذاہب آباد تھے، مسلمان، یہودی، اور مشرکین۔ ان سب کے باہمی تعلقات کو منظم کرنے کے لیے نبی ﷺ نے میثاقِ مدینہ مرتب کرایا۔ یہ معاہدہ آج کے آئینی اصولوں سے بھی زیادہ منصفانہ تھا۔

اس کے چند اہم نکات یہ تھے:

- سب شہری امن و تحفظ کے حق دار ہوں گے۔
- مذہبی آزادی سب کو حاصل ہوگی۔ ظلم و زیادتی کے خلاف سب مل کر دفاع کریں گے۔
- فیصلے نبی کریم ﷺ کی عدالت میں ہوں گے۔

یہ دنیا کی پہلی کثیر مذہبی، عادلانہ ریاست کا آغاز تھا۔

(۳) عدل و مساوات پر مبنی حکومت: ریاستِ مدینہ کا مرکزی اصول "عدل" تھا۔ قرآن نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾(5)

.بے شک اللہ تعالی عدل کا اور حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔

یہ آیت ہر جمعہ کو خطبۂ جمعہ میں سنائی جاتی ہے۔ دراصل یہ اسلامی حکومت کا منشور ہے۔ جس کے بعد مدینہ منورہ میں کوئی قبیلہ یا طبقہ قانون سے بالاتر نہ رہا۔

(۴) سیاسی خود مختاری اور دفاعی نظام:

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو ظلم و ستم سہنا پڑتا تھا اور لڑنے کی اجازت نہ تھی، لیکن مدینہ شریف پہنچ کر حالات سازگار ہوئے، اور افرادی قوت بڑھی، تو دشمنوں کے حملے کے بدلے میں جہادِ دفاعی کی اجازت دیدی گئی، قرآن کریم میں ہے:

﴿"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا﴾(6)

اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن پر ظلم کیا گیا، کہ وہ جنگ کریں۔

یوں جہادِ دفاعی کا آغاز ہوا، جس کا مقصد ظلم کا خاتمہ اور امن کا قیام تھا۔ چنانچہ غزوۂ بدر، احد، خندق وغیرہ جنگوں نے اسلام کو ایک مضبوط دفاعی ریاست میں بدل دیا۔ اس طرح مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کو پہلی بار سیاسی خودمختاری ملی۔ اب وہ اپنے فیصلے خود کرنے لگے۔

(۵) بین الاقوامی تعلقات وسفارت کاری:

مدینہ شریف میں نبی اکرم ﷺ نے اردگرد کے قبائل اور بادشاہوں کو خطوط لکھے، قیصر روم، کسریٰ، نجاشی، اور دیگر حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی۔ یہ اسلامی سفارت کاری کی پہلی منظم کوشش اور بین الاقوامی رابطے کی بنیاد تھی۔ یوں ہجرت کے بعد اسلام عرب کے دائرے سے نکل کر عالمی سطح پر خوب اچھی طرح متعارف ہوا۔

(۶) صلحِ حدیبیہ۔ امن وحکمت کی سیاست:

صلحِ حدیبیہ بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہیں لگتی تھی، لیکن یہی صلح آگے چل کر فتحِ مکہ کا دروازہ بنی۔ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جنگ کے بجائے صلح کو ترجیح دی۔ اس میں دنیا کو یہ تعلیم ہے کہ حکمت وصبر کی سیاست بعض اوقات تلوار سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اور صلحِ حدیبیہ امن و تدبر اور مومنانہ فراست وبصیرت کی اعلیٰ مثال ہے۔

(۷) اخلاقی سیاست اور انصاف کی بالادستی:

مدینہ منورہ کی سیاست "طاقت" کے بل بوتے پر نہیں، بلکہ اخلاق و قانون پر مبنی تھی۔ کوئی "خاندانی بالادستی" نہیں تھی۔ کسی یہودی شخص کا حق بھی اگر کوئی مسلمان نے دبالیتا تو نبی کریم ﷺ عدل فرماتے، اور فیصلہ اسی یہودی کے حق میں سنایا جاتا۔ یہ اسلام کا اخلاقی ماڈل آف گورننس تھا۔

(۸) ماحولیاتی نظام کی تبدیلی:

ہجرت کی برکتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "یثرب" (بیماریوں کی جگہ) کہلانی والی جگہ اب "مدینہ طیبہ" (پاکیزہ شہر) ہوگئی۔ اب وہاں پہنچ کر لوگ ظاہری وباطنی ہر طرح کی شفا پاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے قدم بابرکت پڑتے ہی من جانب اللہ یہ ماحولیاتی تبدیلی ہوئی، جس سے قیامت تک فائدہ اٹھایا جاتا رہے گا۔

پیغامِ ہجرت ومثبت نتائج:

ہجرت ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ:

- حق کے لیے قربانی ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔
- اخوت و مساوات اسلامی معاشرت کی بنیاد ہیں۔
- امن، عدل، اور خدمتِ انسانیت ہی ریاستِ مدینہ کے مقاصد تھے۔
- دین و سیاست الگ نہیں، بلکہ عادلانہ سیاسی نظام دین ہی کا ایک شعبہ ہے۔

ہجرت دراصل باطل کے مقابلے میں حق کے قیام کی علامت ہے۔ یہ یاد دلاتی ہے کہ اسلام صرف نماز و روزہ نہیں، بلکہ نظامِ زندگی کا جامع پیغام ہے۔ ہجرتِ مصطفیٰ ﷺ نے اسلام کو ایک دعوتی تحریک سے نکال کر ایک منظم عالمی نظام میں بدل دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسلامی تاریخ کی بنیاد اسی واقعہ پر رکھی، اور آج بھی امتِ مسلمہ کا سال ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔

ہجرتِ مصطفیٰ ﷺ دراصل ایمان کی پرواز ہے — ظلم سے عدل کی طرف، خوف سے امن کی طرف، اور دنیاداری سے رضائے الٰہی کی طرف۔ اور اسی ہجرت نے ظلمت سے نور کی طرف، مظلومیت سے اقتدار کی طرف، اور دعوت سے نظام اور عالادلانہ سیاست کی طرف امت کو منتقل کیا۔

مصادر و مراجع

(1)التوبہ:40

(2)البقرۃ:218

(3)الحشر:9

(4)الأنفال:63

(5)النحل:90

(6)الحج:39

پیغمبر اسلام ﷺ بحیثیت ایک ماہر تجارت

مفتی فہیم احمد ثقلینی ازھری، صدر الثقلین فاؤنڈیشن قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں

اسلام دینِ فطرت ہے، جو زندگی کے ہر شعبے کی رہنمائی کرتا ہے۔ تجارت انسانی معاش کا بنیادی ستون ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی زندگی میں تجارت اختیار کی اور اپنے عمل وارشاد سے ایسے اصول عطا فرمائے جو دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ اعلان نبوت سے پہلے آپ تجارت سے وابستہ رہے، ملک شام کے تجارتی سفر کیے، یمن کے تجارتی سفر کیے اور بعدِ بعثت مدینہ منورہ پہنچنے پر آپ نے شاندار اسلامی مارکیٹ قائم فرمایا اور تجارت کے نہایت شان دار نفع بخش اصول اور قانون مدون فرمائے۔ تجارت بھی سیرت رسول کا ایک روشن باب ہے۔

پہلا سفر شام

معلم انسانیت ﷺ کی عمر شریف جب بارہ سال ہوئی، تو چچا ابو طالب بغرض تجارت شام کے لیے روانہ ہوئے، چہیتے بھتیجے کو بھی ہم سفر کر لیا۔ جب بصری پہنچے اور بحیرا راہب کی خانقاہ کے پاس آپ کا قیام ہوا، اس نے حضور ﷺ کی زیارت کی، تورات اور انجیل میں نبی آخر الزماں کی جو صفات اور اوصاف مذکور ہیں، آپ کی ذات میں وہ

سارے اوصاف پالیے، تو ابو طالب سے کہا کہ یہ سارے جہان کے سردار اور رب العالمین کے رسول ہیں، جن کو خدا نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے دیکھا کہ شجر و حجر ان کو سجدہ کرتے ہیں اور ابر ان کو سایہ کرتا ہے، ان کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہے، اس لیے تمھارے اور ان کے لیے یہی بہتر ہو گا کہ تم اپنا مال یہیں فروخت کرو، آگے نہ جاؤ، ملک شام میں یہودی ان کے سخت دشمن ہیں، وہاں پہنچتے ہی وہ لوگ انھیں شہید کر دیں گے، ابو طالب نے اپنا مال بصریٰ ہی میں فروخت کیا اور مکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت راہب نے سفر کا توشہ دیا۔ سرکار نے اعلان نبوت سے پہلے تین بار باختلاف روایت چار تجارتی سفر کیے، دو مرتبہ ملک شام گئے اور ایک مرتبہ یا دو مرتبہ یمن تشریف لے گئے۔

ملک شام کا دوسرا سفر

مکہ کی نہایت معزز اور مالدار خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بطور بیع مضاربت اپنا مالِ تجارت دوسروں کو دے کر ملک شام بھیجتی تھیں، جب انھیں حضور ﷺ کی امانت و صداقت اور ان کے اخلاق حسنہ کا علم ہوا، تو انھوں نے حضور کو اس کام کے لیے منتخب کیا اور کہلا بھیجا کہ آپ میرا مال تجارت لے کر شام چلے جائیں، جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں، آپ کی امانت و دیانت کی بنا پر اس کا دوگنا دوں گی۔ حضور ﷺ نے اپنے شفیق چچا ابو طالب سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی درخواست قبول فرمالی اور تجارت کا سامان لے کر ملک شام روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں حضرت خدیجہ نے اپنے معتمد غلام میسرہ کو بھی خدمت کے لیے آپ کے ساتھ کر دیا تھا۔

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی از حد ضروری ہے وہ یہ کہ مستشرقین یہ کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو پیغمبر اسلام کی نگرانی کے لیے بھیجا تھا کہ کہیں وہ امانت میں خیانت وغیرہ کچھ نہ کریں۔ یہی بات بعض مسلمان کہلانے والے مورخین نے بھی لکھ دی ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت خدیجہ پیغمبر اسلام کے حسن اخلاق اور امین و صادق ہونے کی وجہ سے بہت متاثر ہو چکی تھیں اس لیے نگرانی کے لیے نہیں بلکہ خدمت کے لیے بھیجا تھا۔

جب آپ ملک شام کے مشہور شہر بصری کے بازار میں پہنچے تو وہاں نسطورا راہب کی خانقاہ کے پاس میں ٹھہرے۔ نسطورا، میسرہ کو بہت پہلے سے جانتا پہچانتا تھا، حضور ﷺ کی صورت دیکھتے ہی نسطورا، میسرہ کے پاس آیا اور پوچھا کہ اے میسرہ! اس درخت کے نیچے فروکش ہونے والے کون ہیں؟ میسرہ نے بتایا کہ یہ مکہ کے باشندے اور خاندان بنو ہاشم کے چشم و چراغ ہیں، جن کا لقب امین اور نام محمد ہے۔ نسطورا نے کہا کہ سوائے نبی کے اس درخت کے نیچے آج تک کوئی فروکش نہیں ہوا، اس لیے مجھے یقین کامل ہے کہ نبی آخر الزماں یہی ہیں، کیوں کہ آخری نبی کی تمام نشانیاں جو میں نے تورات و انجیل میں پڑھی ہیں، وہ سب میں ان میں دیکھ رہا ہوں، کاش! میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب یہ اپنی نبوت کا اعلان کریں گے، تو میں ان کی بھرپور مدد کرتا، اے میسرہ! میں تجھے ہدایت کرتا ہوں کہ ایک لمحے کے لیے بھی تم ان سے جدا نہ ہونا اور انتہائی خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کی خدمت کرتے رہنا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاتم النبیین ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ حضور ﷺ وہیں مال تجارت فروخت کر کے مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے۔ میسرہ نے حضرت خدیجہ کو بتایا کہ ہر کام بالکل صحیح ہوا ہے اور اس سفر میں معمول سابق سے دوگنا نفع حاصل ہوا ہے۔ حضرت خدیجہ نے حضور کو دوہرا معاوضہ دیا۔ تجارت کے دوگنا منافع، مزید برآں میسرہ کی زبانی سفر کے کوائف و احوال سنے، نسطورا راہب کی باتیں بھی گوش گزار ہوئیں، جن کی بنا پر حضرت خدیجہ کو آپ سے مزید بے پناہ قلبی تعلق اور بے حد عقیدت محبت ہو گئی، یہاں تک ان کا دل جھک گیا کہ انھیں آپ سے نکاح کی رغبت ہو گئی۔

حضور ﷺ کا تجارتی سفر یمن

جیسا کہ مشہور و معروف اور معلوم ہے کہ اہلِ مکہ کی معیشت کا بڑا انحصار تجارت پر تھا۔ قریش کے دو بڑے سالانہ تجارتی سفر ہوتے تھے: ایک گرمیوں میں ملک شام کا سفر۔ دوسرے سردیوں میں ملک یمن کا سفر۔

قرآن مجید کی سورہ قریش میں انہیں دونوں سفروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (1) اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ ﴾(1)

یعنی: قریش کی مانوسیت، ان کے سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ہے۔

حضرت عبد المطلب کے زمانے سے قریش یمن اور شام کے تجارتی سفر کرتے تھے۔

جو تجارتی اسفار نبی اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے کیے، ان میں دو سفر یمن کی طرف بھی تھے، امام حاکم نے المستدرک میں نقل کیا ہے:

﴿استأجرتْ خديجةُ رضوانُ اللّٰه عليها رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم سفرتين إلىٰ جُرَشَ، كل سفرةٍ بقلوصٍ﴾ (2)

کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ کو جرش یمن کے ایک مقام کی طرف دو بار تجارت کے لیے اونٹنیوں کے عوض بھیجا۔

یمن کے سفر میں آپ ﷺ نے نہایت کامیاب تجارت کی اور ہر ایک نے آپ کی دیانت داری کا اعتراف کیا۔

اہم واقعات

(۱) چچا ابو طالب کے ساتھ سفر یمن:

سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ یمن کے تجارتی سفر پر گئے۔

اس موقع پر بھی آپ کی ایمانداری اور خوش اخلاقی نمایاں تھی۔

(۲) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سرمایہ لے کر سفر یمن:

جب حضور ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تجارتی سامان لے کر یمن تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کی راست بازی اور انصاف پسندی کی بڑی تعریف کی۔

آپ ﷺ نے نفع بخش تجارت کی اور واپس آکر سارا حساب صاف صاف پیش کیا۔

اہل یمن پر اثرات

یمن کے لوگ آپ ﷺ کے اخلاق و کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔

بعد میں اسلام کی دعوت یمن میں پہنچی تو لوگ فوراً ایمان لے آئے، کیوں کہ وہ پہلے سے آپ ﷺ کے تجارتی کردار کے گواہ تھے۔ (3)

بحرین کی طرف سفر

اعلان نبوت سے قبل آپ ﷺ کے بحرین کی طرف بھی سفر تجارت کرنے کا اشارہ ملتا ہے، وہ اس طرح کہ جس طرح آپ ﷺ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود حاضر خدمت ہوتے رہے، انھیں وفود میں بحرین سے وفدِ عبد القیس بھی آیا، تو آپ ﷺ نے اہلِ وفد سے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کے احوال دریافت فرمائے، تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا، کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ! آپ تو ہمارے ملک کے احوال ہم سے بھی زیادہ جانتے ہیں، تو آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کہ ہاں میں تمہارے ملک میں خوب گھوما ہوں۔(4)

تجارتی اسفار میں آپ ﷺ کے خصائلِ حمیدہ

پیغمبر اسلام حضور نبی کریم ﷺ اپنی عمر مبارک کے پچیسویں سال تک تجارتی سفروں میں اپنے اخلاقِ کریمانہ، حسنِ معاملہ، راست بازی، صدق و دیانت کی وجہ سے اتنے زیادہ مشہور ہو چکے تھے کہ ہر طرف آپ ”صادق وامین“ مشہور ہو گئے تھے، اپنے بھی اور غیر بھی بلا تکلف اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے تھے۔

جھگڑے سے پرہیز کرنا

تجارتی معاملات اور آپسی لین دین کی کامیابی کے لیے معاملات کی صفائی اور اختلاف سے پرہیز بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور یہ صفات نبی اکرم ﷺ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ چناں چہ حضرت قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ زمانۂ جاہلیت میں میرے شریک ہوتے تھے، اور آپ ﷺ ہمارے تجارت کے شریکوں میں سب سے بہترین شریک تھے، نہ لڑائی کرتے تھے اور نہ ہی جھگڑا کرتے تھے۔(5)

بحث و تکرار سے اجتناب

مسلمان تاجر کی صفات میں سے ایک صفت معاملات کے وقت شور شرابا اور آپس کی بے جا بحث و تکرار سے بچنا بھی ہے، اور آپ ﷺ کے اس وصف عظیم کی گواہی اعلان نبوت سے پہلے بھی دی جاتی تھی؛ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن سائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے سامنے میری تعریف اور میرا تذکرہ کرنے لگے، تو پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہاری نسبت ان سے زائد واقف ہوں، میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول

اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ! آپ سچ فرماتے ہیں، آپ زمانۂ جاہلیت میں میرے شریک ہوتے تھے، اور آپ کتنے بہترین شریک ہوتے تھے کہ نہ شور شرابا (بحث و تکرار) کرتے تھے اور نہ جھگڑا کرتے تھے۔(6)

سیرت نبوی اور مدینہ مارکیٹ

سیر و تواریخ میں قبلِ بعثت حضور رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے تجارتی اسفار کی یہ مذکورہ بالا تفصیل ملتی ہے، جس سے بخوبی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مکہ کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ ملکِ شام، بحرین اور یمن کے تجارتی سفر کیے اور چچا ابو طالب اور حضرت خدیجہ جیسے تجربہ کار قدیم تاجروں کے ساتھ تجارت کر کے نوجوانی میں ہی تجارت کے اسرار و رموز سیکھے اور گہرائی سے اس بات کا جائزہ لیا کہ تجارت کرنے کے لیے کون سے اصول نفع بخش ہیں اور کون سے اصول مضر؟ تجارت کو مزید فروغ دینے کے لیے کیا حکمت عملی اپنانی چاہیے اور کس طریقے سے ہمیں تجارت کو آگے بڑھانا چاہیے؟

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جب اعلانِ نبوت فرمایا اور بارہ تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہنے کے بعد جب مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو مدینے کی مارکیٹ اور بازار پر یہودیوں کا قبضہ تھا، جس میں سرمایہ داروں اور ظالم و جابر تاجروں کی اجارہ داری تھی۔ عوام اور کمزور انسانوں کے لیے یہودیوں کے بازار میں تجارت کرنا آسان نہ تھا، تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے قدیم تجربات کی روشنی میں مدینہ منورہ کے جدید ماحول میں نہایت ہی شاندار اور کامیاب اصول وضع فرمائے اور اپنا الگ بازار اور مدینہ مارکیٹ (بلفظِ دیگر اسلامی مارکیٹ) پیغمبرِ اسلام، رحمتِ عالم، معلمِ انسانیت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے قائم فرمایا، جس کی تفصیل "صحیفۂ نور" کے حوالے سے درج ذیل ہے:

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے دیکھا کہ پورے بازار پر یہودیوں اور مشرکین کا غلبہ ہے۔ یہودیوں کا نظریہ تھا کہ ان کے علاوہ دوسرے سب لوگ گمراہ ہیں اور اس کے لیے ان کے نزدیک ان کا استحصال صرف جائز ہی نہیں بلکہ پسندیدہ فعل تھا۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے محسوس کیا کہ سیاسی خود مختاری اور ریاست کے استحکام کے لیے معاشی طور پر مضبوطی اور آزادی کس قدر اہم ہے اس لیے ہجرت کے فوراً بعد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک خود مختار اور آزاد مارکیٹ اسی بازار کے قریب قائم کیا جہاں اہل ایمان اپنے اصولوں کے مطابق کاروبار

کر سکیں اور ان اصولوں پر عمل درآمد کر کے باہمی اعتماد کی فضا بھی پیدا کریں تاکہ اس کے ذریعے سے اسلامی احکامات و نظریات کی ترویج و تبلیغ ہو سکے۔

چند دنوں کے بعد نبی کریم ﷺ نے حالات کا جائزہ لیا اور پھر اس مارکیٹ کے جائے وقوع میں تبدیل کر کے شہر کے بیچوں بیچ وادی بطحان کے اہم اور مرکزی علاقہ میں ایک نئے مارکیٹ کی بنیاد ڈالی جو مسجد نبوی سے قریب اور یہودیوں کے مارکیٹ سے فاصلہ پر تھی۔ جگہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ آپ نے ایسے حالات پیدا کیے جو تاجروں اور گاہکوں کے لیے بڑے سازگار ہوں اور وہ اپنے پرانے مارکیٹ کو چھوڑ کر خرید و فروخت کے لیے اس نئے نبوی مارکیٹ کی طرف آئیں۔ اس کے لیے آپ ﷺ نے دو اہم اور دور رس اصولوں کو اپنا کر اسے عملی جامہ پہنایا جس کی وجہ سے تاجروں کی توجہ اس نئے مارکیٹ کی طرف مرکوز ہونے لگی۔ پہلا اہم فیصلہ یہ کیا کہ مدینہ مارکیٹ میں خرید و فروخت کرنے والوں پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جائے گا اور دوسرا یہ کہ اس مارکیٹ کے احاطہ میں کسی بھی تاجر کو آنے اور اپنا خیمہ لگانے کی اجازت دی۔

نبی اکرم ﷺ ایک تجربہ کار تاجر تھے اور عکاظ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں کاروبار کر چکے تھے۔ عکاظ میں کوئی ٹیکس نہیں لگتا تھا اس لیے انہیں معلوم تھا کہ ٹیکسوں کے بغیر تجارت کی جائے تو خرید و فروخت میں آسانی ہوتی ہے اور نفع میں زیادتی بھی۔ تاجر اور گاہک دونوں کو نفع کی وجہ سے اس جگہ کے لیے کشش پیدا ہو گئی۔ بغیر محصول اور ٹیکس کے خرید و فروخت میں قیمتیں کم ہوں گی اور کاروباری نقطۂ نظر سے بھی یہ بات مفید ہو گی۔ جہاں قیمتیں کم ہوں گی لامحالہ خریداروں کا رخ اسی مارکیٹ کی طرف ہو گا۔ واضح رہے کہ یہودی تاجر اپنے مارکیٹ میں ٹیکس لگاتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ نے تاجروں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے یہ طریقہ بھی اختیار کیا کہ مارکیٹ میں تاجروں کے مخصوص جگہوں کا تعین نہ ہو بلکہ جو تاجر جلد آجائے گا وہ اپنی جگہ حاصل کرے گا اور کوئی بھی تاجر مستقل کسی جگہ پر قبضہ نہیں کرے گا۔ اس طریقۂ عمل سے جلد اور سویرے کاروبار کا سلسلہ شروع ہوا اور تمام قسم کے تاجر اس مدینہ مارکیٹ کی طرف منتقل ہونے لگے۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب تاجروں نے دیکھا کہ مارکیٹ اچھا ہے اور کاروبار بھی زوروں پر ہے تو ہر ایک نے اپنی متعین جگہوں پر خیمہ لگانے اور مارکیٹ کے اندر

احاطہ بندی کی کوشش کی۔ ایسے ہی ایک تاجر نے مارکیٹ میں مستقل خیمہ لگایا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے خیمہ کو جلا دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم نے ان تاجرانہ اصولوں پر برکت وترقی کے حصول کے لیے کس شدت کے ساتھ عمل کروایا۔ اس طرح مدینہ مارکیٹ خرید وفروخت کا اچھا مرکز بنا۔ اجارہ داری اور استحصال سے پاک اور ٹیکس کے نہ ہونے کی وجہ سے قیمتوں میں کمی اور کاروبار میں آسانی کی وجہ سے یہودیوں کا بازار سرد پڑنے لگا اور خود مجبور ہوئے کہ مدینہ مارکیٹ کی طرف آئیں اور خرید وفروخت کریں۔

نبی اکرم ﷺ نے بازار کی نگرانی کے لیے محتسب {نگراں اور چوکی دار} مقرر فرمائے تھے، جو اشیائے خرید و فروخت کے علاوہ ناپ تول پر بھی نظر رکھتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ وہ مدینہ کے اس مارکیٹ کا جائزہ لینے کے لیے خود تشریف لے جاتے۔

ایک بار آپ ﷺ ایک تاجر کے پاس سے گزرے جو غلہ بیچ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے غلہ کے اندر ہاتھ ڈالا اندر کا حصہ پانی سے تر تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضور بارش کی وجہ سے بھیگ گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اسے اوپر کیوں نہیں رکھا؟ پھر ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا﴾(7)

جو لوگ ہم سے دھوکہ کریں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔

آپ ﷺ نے تاجروں کو نصیحت فرمائی: اے تاجرو! تم آپس میں لین دین کے وقت بہت زیادہ قسمیں کھاتے ہو اس لیے صدقہ کرو تاکہ تمہاری معافی ہو۔

کیسان نامی ایک تاجر شام سے شراب لاتے اور مدینہ میں فروخت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: اے کیسان! جب تم غیر حاضر تھے شراب حرام قرار پاچکی تھی اس کی تجارت مت کرو۔

بازار کے نگرانوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ مردوں میں حضرت سعید بن العاص امیہ، حضرت عبد اللہ بن سعید بن اسیمہ، عمر بن خطاب اور عورتوں میں سمرہ بنت محاربہ اور شفاء بنت عبد اللہ کا نام آتا ہے۔

تاجروں میں جہاں مردوں کا نام آتا ہے وہیں خواتین کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً اسماء بنت محاربہ، خولہ بنت صویب، ملیکہ ام سائب اور قیلہ النماریہ۔

اس مارکیٹ کو مزید اچھا، پرکشش اور ترقی سے ہم کنار کرنے کے لیے آپ ﷺ نے مندرجہ ذیل امور پر بھی توجہ دی۔

اس مارکیٹ میں آپ ﷺ نے مختلف اشیاء کے فروخت کے لیے علاحدہ شعبہ جات قائم کیے۔ اناج کے خرید و فروخت، جانوروں اور کپڑوں کی تجارت کے لیے الگ سے جگہ مقرر کیے تاکہ اس بازار میں نہ صرف کوئی گڑبڑ اور ہلڑ بازی نہ ہو بلکہ صفائی اور حفظان صحت کا بھی خیال رہے۔

اس مارکیٹ میں داخلہ کے لیے تاجروں اور خریداروں کے لیے بھی باقاعدہ اصول وضوابط متعین کیے گئے تھے۔ مثلاً جو اس میں داخل ہو وہ اپنے اسلحہ کو اس طرح رکھے کہ اس سے لوگوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے اور یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ راستوں میں کوئی نہ بیٹھے۔

تجارتی قافلوں کے آمد و رفت کے لیے سڑکوں کا اس طرح انتظام تھا کہ اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ دو سامان سے لدے ہوئے اونٹ ایک طرف سے آئیں اور دوسری طرف سے جائیں، جس کی چوڑائی کم از کم دھرہ (Dhira) کی ہوتی تھی جو ساڑھے تین میٹر کی ہوتی تھی گویا آج کے دور کے (four lane) کا انتظام تھا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی آمدنی میں بچت (Saving) اور سرمایہ کاری (Investment) کرنے کی بھی ترغیب دی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ”ہر سرمایہ دار زیادہ حق دار ہے کہ وہ اپنے مال سے جو چاہے پیدا کرے۔(8)

نفع آور کاروبار میں سرمایہ لگانے اور شراکت کی طرف بھی متوجہ فرمایا۔ چناں چہ آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دو شراکت کرنے والوں کے درمیان تیسرا میں ہوتا ہوں، ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے خیانت نہ کرے، لیکن جب کوئی ان میں سے خیانت کرتا ہے تو میں درمیان سے نکل جاتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نہ صرف مدینہ مارکیٹ کی بنیاد رکھی بلکہ تجارت کے اصول وضوابط اور معیشت کے خدوخال بھی متعین فرمائے: مثلاً بیع پر بیع کرنے کی، مال کو قبضہ میں لینے سے پہلے فروخت، تسعیر (قیمتوں کے تقرر) احتکار (Hoaring) میسر (Speculation) کی ممانعت کی ہے۔

تجارت کے لیے پیغمبر اسلام کے رہنما اصول

تجارت ہی وہ بابرکت اور باعزت پیشہ ہے جسے نبی کریم ﷺ نے شرف قبولیت سے نوازا۔ آپ نے اپنی بعثت مبارکہ سے قبل بارہ سال اس پیشے کو عزت بخشے رکھی۔ قبل از اعلان نبوت آپ ﷺ کی شہرت اور نیک نامی کی اصل وجہ بھی وہ معاملات کی صفائی اور سچائی تھی جو ان کے ساتھ تجارتی معاملات کرنے والوں نے دیکھی اور محسوس کی تھی۔

آپ نے تجارت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿عليكم بالتجارة فان فيها تسعة اعشار الرزق﴾(9)

ترجمہ: تجارت کیا کرو، اس لیے کہ تجارت میں رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے ہیں ۔

ایک دوسری روایت میں یوں ہے:

﴿تسعة أعشار رزق أمتي في البيع والشراء التاجر الصدوق مع كراما برره﴾(10)

ترجمہ: میری امت کے دس حصوں میں سے نو حصے رزق کے خرید و فروخت یعنی (تجارت) میں ہے۔ سچا تاجر برگزیدہ فرشتوں کا ساتھی ہے۔

﴿عن ابي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء﴾(11)

ترجمہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سچے اور امانت دار تاجر کا حشر نبیوں صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔

اس حدیث مبارکہ میں سچے اور ایمان دار تاجر کو قیامت کے دن عزت و اکرام کی نوید سنائی گئی ہے، یعنی تجارت صرف دنیوی رفاہیت کا ذریعہ ہی نہیں، اس میں لگنے والا مخلص تاجر جو تجارت کو امت مسلمہ کی خیر خواہی کا ذریعہ بناتا ہے وہ روز قیامت بھی سرخرو ہو گا۔

تجارت میں معاشی خوش حالی اور رفاہیت عامہ کی خوش خبری دیتے ہوئے فرمایا جو تجارت کرتا ہے اس کے یہاں خیر و برکت اور رفاہیت ہوتی ہے

معلم انسانیت حضور ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارکہ میں ایسے تاجر کے لیے جو تجارت جیسا بابرکت پیشہ اختیار کرنے کے باوجود اللہ کریم کی مخلوق کے ساتھ بھلائی و خیر خواہی کا معاملہ کرنے کی بجائے انہیں نقصان پہنچا کر اپنے نفع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے تجارت کے غیر شرعی اور غیر مفید حیلے اختیار کرے، اسے وعید سناتے ہوئے فرمایا:

﴿التجار يحشرون يوم القيامة فجارا إلا من اتقى وبر وصدق﴾(12)

ترجمہ: قیامت کے دن تاجر فاسق و فاجر اٹھیں گے، مگر وہ نہیں جنھوں نے پرہیز گاری اختیار کی اور بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا۔

اسلامی شہروں میں تجارت کے مبادلہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

﴿ما من جالب يجلب طعاما من بلد الى بلد فيبيعه بسعر يومه إلا كانت منزلته عند الله منزلة الشهداء﴾(13)

ترجمہ: جو تاجر مشقت اٹھا کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک اناج لے جاتا ہے اور اس دن کے بھاؤ سے فروخت کرتا ہے اس کا درجہ اللہ کریم کے نزدیک شہید کا سا ہے۔

﴿من جلب طعاما فباعه بسعر يومه فكانما تصدق به﴾(14)

اس دن کے بھاؤ سے مراد یہ ہے کہ وہ دور دراز سے اناج اس نیت سے شہر لائے کہ اس کی ذخیرہ اندوزی کرے اور اسے بازار میں لانے کے لیے تاخیری حربے استعمال کرے اور اس وقت کا انتظار کرے جب اس اناج کی بازار میں مصنوعی قلت ہو جائے، اس کے دام چڑھ جائیں اور اس تاجر کا نفع زیادہ سے زیادہ اور اس کے دام زیادہ ہو جائیں۔ ایسا تاجر انسانیت کا خیر خواہ نہیں، نہ اس کی تجارت تعاون اور خیر خواہی کا ذریعہ بنے گی جب کہ کنز العمال کی ایک اور روایت میں تجارت ہی کو لوگوں کی معاشی خوش حالی اور رفاہیت کا ذریعہ بتایا ہے اور اس کے ترک کو معاشی طور پر قلاش ہونے اور لوگوں پر بوجھ بننے کا سبب بتایا ہے۔

﴿لو لا هذه البيوع صرتم عالة على الناس له﴾(15)

ترجمہ: اگر یہ تجارتیں نہ ہوتیں تو تم لوگ معاشی طور پر ایک دوسرے بوجھ بن جاتے۔

ایک حدیث میں کپڑے کی تجارت کی ترغیب دی۔

کپڑے کی تجارت کرو کیوں کہ کپڑے کا تاجر یہ چاہتا ہے کہ لوگ خوش حال اور فارغ البال رہیں۔

صحابہ کرام کی تجارتی سرگرمیاں

(۲) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک زندگیاں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف تھیں، ان کی غالب اکثریت نے اپنی معاشی کفالت کے لیے تجارت کو ذریعہ بنایا ہوا تھا، اہل مکہ اور مہاجرین مکہ تو تھے ہی تجار، اہل مدینہ منورہ کی بھی ایک بڑی تعداد تجارت پیشہ تھی۔ ہجرت مدینہ منورہ سے قبل مسلمانان مکہ تاجر تھے۔ جب وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انہوں نے تجارت میں مشغول رہنا ہی پسند کیا۔

(۲) تجارت سے ان کی وابستگی کا اندازہ اس سے لگائیں کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ کا بھائی چارہ حضور ﷺ نے حضرت سعد بن ربیع انصاری رض اللہ تعالی عنہ کے ساتھ قائم کر دیا، حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ تعالی عنہ نے کرامت نفس سے کام لیتے ہوئے اپنے تمام گھریلو اثاثہ اور جائیداد کے دو حصے کر دیئے حتی کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک جسے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پسند کریں کو طلاق دے کر ان کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ نے انتہائی سخاوتِ نفس سے کام لیتے ہوئے عرض کیا بھائی یہ سب کچھ آپ کو مبارک! مجھے مدینہ منورہ کے بازار کا راستہ بتا دو۔ وہ مدینہ منورہ کے بازار قینقاع تشریف لے گئے جب شام کو واپس گھر لوٹ رہے تھے تو ان کے پاس کچھ پنیر اور گھی تھا۔

(۳) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مدینہ منورہ کے مقام سخ پر کارخانہ اور کپڑے کا گودام تھا۔ وہ شروع ہی سے کپڑے کے تاجر تھے حتی کہ خلیفہ بننے کے اگلے روز چند چادریں ہاتھ پر ڈال کر بازار کا رخ کر رہے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے راستہ روک کر کہا اب آپ امت مسلمہ کی خدمت کریں، وہ بیت المال کے ذریعے آپ کی کفالت کرے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا تجارتی کاروبار حجاز سے نکل کر ایران تک پھیل گیا تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالی عنہ نے کپڑے کی تجارت کرتے اور ان کا کاروبار شام تک وسیع تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہؓ تعالی نے بھی پارچہ فروشی کا کام کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو سفیان بن حرب رضی اللہ تعالی عنہ تیل اور چمڑا فروخت کرتے

تھے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالی عنہ یمن سے عطر خرید لاتے اور موسم حج میں اسے فروخت کرتے تھے، حضرت عمرو بن العاص اور حضرت عمارہ بن ولید رضی اللہ تعالی عنہ کا تجارتی معاملہ نجاشی حبشہ اور اس کے وزرا تک تھا۔

(۳) حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ کا تجارتی کاروبار یہاں تک ترقی کر گیا کہ جب ان کے تجارتی قافلے مدینہ منورہ میں داخل ہوتے تو دھوم مچ جاتی۔ فرید وجدی کے الفاظ قابل غور ہیں۔

﴿حتی یروی أن عبد الرحمن بن عوف إذا دخلت العیر الحاملة لتجارة. سمعت لها ضجة بالمدينة﴾

ترجمہ: حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ کا کاروبار تجارت یہاں تک ترقی کر گیا کہ جب ان کا کوئی تجارتی قافلہ مدینہ منورہ میں داخل ہوتا تو شہر میں دھوم مچ جاتی۔

(۴) حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سی کمائی سب سے اچھی، طیب اور صاف ستھری ہے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: ﴿عمل الرجل بیده، وكل بيع منزور﴾۔ آدمی جو کمائی اپنے ہاتھ سے کرے (جیسے زراعت، تجارت، کتابت اور صناعت، وغیرہ) اور ہر وہ خرید و فروخت جو دھوکہ اور خیانت سے پاک ہو اور از روئے شرع مقبول ہو۔(16)

امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ چار درہم ہیں، ان میں سے ایک تجارت سے حاصل ہوا، ایک بھائی کی صلہ رحمی اور ہدیہ سے حاصل ہوا، ایک اجرت تعلیم سے حاصل ہوا اور ایک سرکاری خزانے سے ملا، تو ان میں سے افضل کو ن سا ہے؟ تو انھوں جواب دیا: جو درہم کپڑے کی تجارت سے حاصل ہوا ہے۔(17)

(۵) اور ابراہیم نخعی سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی تجارت چھوڑ کر نوافل میں مشغول رہتا ہے اور ایک آدمی تجارت میں مشغول رہتا ہے تو ان میں سے کون افضل ہے؟ انھوں نے فرمایا: امانت دار تاجر۔(18)

(۶) اور صاحب الآداب الشرعیہ نے لکھا ہے: سب سے افضل کسب معاش تجارت ہے، اور تجارت میں بھی سب سے افضل کپڑا، عطر، غلہ اور گھوڑے کی تجارت ہے۔(19)

(۷) بخاری کی مشہور شرح عمدۃ القاری میں علامہ عینی رقمطراز ہیں:

﴿قد أباح الله تعالى التجارة في كتابه ، وأمر بالا بتغاي من فضله ، وكان أفضل الصحابة كانوا يتجرون ، ويخترفون في طلب المعاش﴾(20)

ترجمہ بلاشبہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب قرآن میں تجارت کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اپنے رزق کو تلاش کرنے کا حکم دیا ہے اور اکابر اور اونچے درجے کے صحابہ تجارت کرتے تھے اور کسب معاش کے لیے کاروبار کرتے تھے۔

(۸) حضرت عمر فاروق نے فرمایا: ﴿لا يقعد أحدكم عن طلب الرزق ، يقول : اللهم ارزقني ؟ فقد علمتم أن السماء لا تمطر ذهباً ولا فضة﴾(21)

ترجمہ: تم میں سے کوئی طلب رزق کو چھوڑ کر بیٹھ نہ جائے اور پھر کہے: اے اللہ مجھے روزی عطا فرما؟ کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان سے سونے اور چاندی نہیں برستے۔

(۹) دین کے اول حصے میں تجارت کرنے سے اس میں برکت ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے برکت کی دعا دی ہے۔ حضرت صخر غامدی سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اللهم بارك لأمتي في بكورها، وكان إذا بعث سرية أو جيشاً بعثهم من أول النهار وكان صخر رجلاً تاجراً، وكان يبعث تجارته من أول النَّهارِ، فاثرى، وكثر ماله﴾(22)

ترجمہ: اے اللہ! میری امت کے لیے دن کے شروع حصے میں برکت عطا فرما، اور حضور ﷺ جب فوج کا کوئی دستہ، یا لشکر جنگ کے لیے بھیجتے تھے تو دن کے اول حصے میں بھیجتے تھے اور حضرت صخر تاجر آدمی تھے، اپنی تجارت کا سامان دن کے اول حصے میں بھیجتے تھے، چناں چہ ان کی تجارت میں خوب خوب برکت ہوئی، نفع ہوا اور وہ مال دار ہو گئے اور ان کا مال بہت ہو گیا۔

(۱۰) حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے اہل بازار میں سے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ جب نماز کے لیے اذان ہوئی تو انھوں نے اپنے خرید و فروخت کو چھوڑ دیا اور نماز کے لیے چل پڑے۔ عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: یہ لوگ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا اللہ تبارک و تعالی نے اپنی کتاب کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

﴿رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ﴾(23)

اور تفسیر قشیری میں لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں جن کا تذکرہ ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حقوق اللہ کو حظوظ نفس پر ترجیح دیتے ہیں اور جب موذن کی آواز، حی علی الصلوۃ، سنتے ہیں تو بیع و شراء اور تجارت کی مشغولیت کو چھوڑ، اللہ کے حق کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (24)

(۱۱)اور حضرت ابراہیم نخعی سے سچے تاجر کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ آپ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہے، یا وہ شخص جو عبادت کے لیے فارغ ہے اور ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: سچا تاجر میرے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے؛ اس لیے کہ وہ مجاہدہ میں مشغول ہے؛ کیوں کہ شیطان اس کے پاس ناپ تول کے راستے سے آتا ہے (تاکہ اس کو بھٹکائے اور ناپ تول کی کمی بیشی میں اس کو مبتلا کرے)، اور شیطان اس کے پاس لینے اور دینے کے راستے سے آتا ہے (تاکہ اس کو لین دین کی گڑبڑی میں مبتلا کرے) پس وہ شیطان سے مجاہدہ کرتا ہے؛ لہٰذا سچا دین دار تاجر مجھے زیادہ محبوب اور پسند ہے۔(25)

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی زندگی کا ابتدائی دور تجارت سے وابستہ تھا، اور آپ ﷺ نے اپنے عملی کردار اور دیانتداری سے تجارتی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا، پیغمبر اسلام حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو انسانیت کے لیے نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے نبوت سے قبل تجارتی پیشہ اختیار کیا اور انتہائی دیانت، امانت، صداقت اور حسنِ اخلاق سے اس شعبہ کو روشن کیا۔

اعلان نبوت سے پہلے کے عرب میں زراعت کے مقابلے میں تجارت کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ قریش ایک تجارتی قوم تھی جو شام، یمن، حبشہ اور عراق تک کے تجارتی سفر کرتی تھی۔ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے مکہ کو بین الاقوامی تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

آپ ﷺ نے نوعمری میں ہی تجارتی سفر شروع کیا۔ حضور ﷺ کی دیانت، راست بازی اور وعدے کی پاسداری کی بنا پر اہلِ مکہ نے آپ کو "صادق" (سچ بولنے والا) اور "امین" (امانت دار) کے لقب سے یاد کیا۔ آپ کے ساتھ کاروبار کرنے والے ہر شخص نے آپ کی دیانت داری کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ کبھی جھوٹ، دھوکہ یا فریب کا سہارا نہ لیتے۔۔ ناپ تول میں کمی نہ کرتے، حق تلفی نہیں کرتے تھے، گاہکوں سے نرمی، حسن سلوک اور

خوش اخلاقی سے پیش آتے، مال کی خوبی اور خامی بیان کرتے۔ آپ ﷺ کی تجارتی زندگی نے لوگوں میں اعتماد پیدا کیا، تجارتی معاملات ہی حضرت خدیجہ سے نکاح کا سبب بنے، نبوت کے بعد لوگوں کو آپ کی دعوتِ دین پر جلدی یقین کرنے میں مدد دی، پیغمبر اسلام ﷺ کی تجارتی زندگی ہمارے لیے ایک مکمل نمونہ ہے۔ آپ نے صرف مال کمانے کو مقصد نہیں بنایا بلکہ اخلاق و کردار کو فوقیت دی۔ آج کے تاجروں کو چاہیے کہ وہ صداقت، امانت اور انصاف کے اصولوں کو اپنا کر آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے رہنمائی لیں۔

حوالہ جات

(1) سورۃ قریش آیت 2-1

(2) المستدرک علی الصحیحین، کتاب معرفۃ الصحابۃ، ومنھم خدیجۃ بنت خویلد، رقم الحدیث: 4834۔ 200/3

(3) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج 1، ص 120

(4) مسند أحمد بن حنبل، بقیۃ حدیث وفد عبد القیس، رقم الحدیث: 15559۔ 327/24

(5) الإصابۃ في تمییز الصحابۃ

(6) سنن أبي داوٗد

(7) مسلم شریف، حدیث نمبر 102

(8) کنز العمال

(9) کنز العمال۔ ج 2۔ ص 192

(10) الاختیار فی شرح المختار 226/2۔ شیخ عبد اللہ موصلی

(11) جامع ترمذی، ابواب البیوع

(12) جامع ترمذی ابواب البیوع۔ مشکوۃ المصابیح کتاب البیوع

(13) کنز العمال فصل فی الکسب

(14) کنز العمال فصل فی الکسب

(15) کنز العمال فصل فی الکسب

(16) مسند احمد حدیث: 17265- مرقاۃ: 1904/۵۵

(17) الآداب الشرعية والمنح المرعية:3/269
(18) الآداب الشرعية والمنح المرعية:3/290
(19) الآداب الشرعية والمنح المرعية
(20) 11/160
(21) احیاء العلوم:2/62
(22) أبو داود حدیث:2609۔ ترمذی حدیث:1212- ابن ماجہ حدیث:2236
(23) تفسیر ابن کثیر:6/68- تفسیر طبری:19/192
(24) 2/614
(25) احیاء العلوم جلد دوم

(یہ تمام احوال، اصول تجارت، واقعات تجارت، سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، دلائل النبوۃ، مدارج النبوۃ اور سیرت وتواریخ کی کتابوں میں عموماً دستیاب ہیں۔ تفصیل کے لیے انہیں کتابوں کی طرف مراجعت فرمائیں۔)

عدم برداشت کا قومی وبین الاقوامی رجحان اور تعلیمات نبوی

مولانا عقیل اشہر، بیگوسرائے

اکیسویں صدی کا کینوس ایک عجیب تضاد پیش کرتا ہے، جہاں جغرافیائی فاصلے سمٹنے کے باوجود دلوں کی خلیج خطرناک حد تک وسیع ہو چکی ہے۔ عالمگیریت (Globalization) اور جدید ٹیکنالوجی نے کرہ ارض کو ایک عالمی گاؤں میں ضرور تبدیل کیا، مگر یہ گاؤں ہم آہنگی اور مکالمے کی آماجگاہ بننے کے بجائے تعصب اور نفرت کا ایک سلگتا ہوا میدان بن چکا ہے۔ آج عدم برداشت (Intolerance) محض ایک انفرادی خامی نہیں، بلکہ ایک ایسا وبائی رجحان بن کر ابھرا ہے جو بین الاقوامی اور قومی سطح پر تہذیبوں کی بنیادیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ ایک جانب عالمی منظرنامے پر اسلاموفوبیا، تارکینِ وطن سے منافرت، اور دائیں بازو کی انتہا پسندی (Far-right extremism) عروج پر ہے، تو دوسری جانب قومی سطح پر سیاسی پولرائزیشن اور سماجی بے صبری نے دلیل کی جگہ تشدد کو دے دی ہے۔ یہ المیہ ظاہر کرتا ہے کہ مادی ترقی کی انتہاؤں کو چھونے والا انسان اخلاقی اعتبار سے کس قدر کھوکھلا ہو چکا ہے۔

اس رجحان کے پھیلاؤ کا عمرانی اور نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ جدید انسان اپنے سے مختلف رائے اور عقیدے کو سننے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ ابلاغیات کے محققین اس کی بنیادی وجہ ڈیجیٹل دور کے 'ایکو چیمبرز' (Echo Chambers) کو قرار دیتے ہیں، جہاں صارف صرف وہی آوازیں سنتا ہے جو اس کے اپنے نظریات کی بازگشت ہوتی ہیں۔ اس نفسیاتی خول اور تصدیقی تعصب (Confirmation Bias) نے معاشروں کو شدید

گروہی عصبیتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اعداد و شمار اور عالمی تنازعات کی رپورٹس گواہ ہیں کہ مغربی دنیا میں تہذیبوں کے تصادم کا بیانیہ اور طاقتور اقوام کا کمزوروں پر غلبہ دراصل اسی ادارہ جاتی عدم برداشت کی پیداوار ہیں۔ جب ہم اپنے داخلی اور قومی منظر نامے کا تجزیہ کرتے ہیں، تو صورتحال مزید تشویشناک دکھائی دیتی ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک کے معمولی تنازعات سے لے کر ڈیجیٹل مباحث اور سیاسی اختلافات تک، ہر سطح پر برداشت کا پیمانہ چھلکتا ہوا ملتا ہے۔ اختلافِ رائے، جسے کبھی فکری ارتقا کا زینہ اور زندہ معاشروں کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب ایک ایسا ناقابلِ معافی جرم بن چکا ہے جس کی سزا کردار کشی سے لے کر جسمانی تشدد تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ معاشرے میں پنپنے والا یہ اجتماعی ہیجان دراصل ایک گہرے وجودی بحران کی نشاندہی کرتا ہے۔

منافرت اور تعصب کے اس تاریک جنگل میں پرامن بقائے باہمی کا راستہ تلاش کیا جائے تو نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ایک روشن مینار بن کر ابھرتی ہے۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ میں برداشت محض ایک سماجی سمجھوتہ یا کمزوری کا نام نہیں، بلکہ یہ 'حلم' اور 'عفو' کے اعلیٰ ترین اخلاقی مرتبے سے عبارت ہے۔ جدید عمرانی فلسفہ جس تکثیریت (Pluralism) اور رواداری کی باتیں آج محض نظریاتی حد تک کرتا ہے، نبیِ رحمت ﷺ نے چودہ صدیاں قبل اسے ریاستِ مدینہ کے خدوخال میں عملی طور پر نافذ کر دکھایا۔ میثاقِ مدینہ انسانی تاریخ کا وہ پہلا دستاویزی اور عملی معاہدہ ہے جس نے ایک کثیر المذہبی معاشرے میں مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کو مساوی شہری حقوق فراہم کیے، اور عقائد کے شدید تنوع کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حتمی خاکہ پیش کیا۔ یہ اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ اسلام معاشرے کو جبراً یک رنگا (Monolithic) بنانے کی وکالت نہیں کرتا، بلکہ رنگوں کے اس تنوع کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کی تربیت دیتا ہے۔

نبوی ﷺ عفوودرگزر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی وسعت انسانی تخیل کو دنگ کر دیتی ہے۔ طائف کے بازاروں کا وہ خونی منظر چشمِ تصور میں لائیے جہاں آپ ﷺ کو پتھر مار کر لہولہان کر دیا گیا؛ اس کڑے وقت میں کسی عام انسان یا آج کے کسی عالمی رہنما کا ردعمل انتقام کی آگ سے عبارت ہوتا، مگر رحمتِ عالم ﷺ نے فرشتوں کی پیشکش کے باوجود ان کے لیے تباہی کے بجائے ہدایت کی دعا مانگی۔ یہ محض ایک جذباتی واقعہ نہیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات اور سماجیات کا ایک عظیم اصول ہے کہ جہالت اور تعصب کی یلغار کا جواب تشدد سے نہیں بلکہ

ظرف کی وسعت سے دیا جاتا ہے۔ اسی تسلسل میں فتحِ مکہ کا دن تاریخِ انسانی کا بے مثال باب ہے، جب وہ بدترین دشمن جنہوں نے مسلمانوں کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا اور مسلسل جنگیں مسلط کیں، سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس موقع پر فاتحِ اعظم ﷺ نے ﴿لا تثریب علیکم الیوم﴾ (آج تم پر کوئی گرفت نہیں) کا اعلان کر کے انتقام کے اس ابدی چکر کو ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جو آج کے بین الاقوامی تنازعات اور جنگوں کی سب سے بڑی جڑ ہے۔ یہ وہ حتمی ماڈل ہے جہاں اقتدار کی انتہا پر پہنچ کر برداشت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، کیونکہ کمزوری میں چپ سادھ لینا مجبوری کہلاتا ہے؛ حقیقی برداشت تو وہ ہے جو طاقت کے باوجود ہاتھ کو انتقام سے روکے رکھے۔

قرآنِ حکیم نے اسی نبوی طرزِ عمل کو ایک آفاقی اور نفسیاتی اصول کے طور پر وضع کیا ہے کہ "برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو، تو تم دیکھو گے کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ تمہارا جگری دوست بن جائے گا" (سورۃ حم السجدہ)۔

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اختلاف کو ذاتی دشمنی کا درجہ دے دیا ہے، اور اس کا واحد سدباب اسی قرآنی و نبوی فلسفے میں پنہاں ہے۔ آج اقوامِ متحدہ کے فورمز ہوں یا قانون ساز اسمبلیاں، قراردادوں اور ریاستی جبر کے ذریعے ظاہری عدم برداشت کو دبایا تو جا سکتا ہے، مگر دلوں سے اس کا قلع قمع نہیں کیا جا سکتا۔ تعصبات اور گروہی منافرت کے اس مہیب طوفان کو روکنے کے لیے کاغذی قوانین ناکافی ہیں؛ انسانیت کو لامحالہ اس نبوی مکتبِ فکر کی جانب لوٹنا ہو گا جہاں انسانی جان کا غیر مشروط احترام، اختلافِ رائے کی وسیع گنجائش اور مخالف کے لیے بھی ہمدردی کا عنصر موجود ہو۔ جب تک تعلیماتِ نبوی ﷺ کے اس جوہر کو قومی پالیسیوں، تعلیمی نصابوں اور بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد نہیں بنایا جاتا، عالمی امن کا خواب ایک سراب ہی رہے گا، اور انسانیت اسی عدم برداشت کی بھٹی میں جھلستی رہے گی۔

نبیل غزالی (شعبۂ بزنس مینیجمینٹ، نجم الدین اربکان یونیورسٹی، قونیہ، ترکی)

انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر میں شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو جب انسان اور اس کے مسکن، یعنی کرۂ ارض کے مابین تعلق اس قدر نازک اور فیصلہ کن موڑ پر آ کھڑا ہوا ہو۔ آج جب ہم گلیشیئرز کو پگھلتے، سمندروں کی سطح کو بلند ہوتے، جنگلات کو بے دردی سے کٹتے اور فضا کو زہریلا ہوتے دیکھتے ہیں، تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہماری بے ہنگم مادی اور معاشی سرگرمیوں نے اسی زمین کو خطرے میں ڈال دیا ہے جو ہماری بقا کی واحد مادی ضمانت ہے۔ درحقیقت، یہ محض کوئی سائنسی یا معاشی مسئلہ نہیں، بلکہ ایک گہرا تہذیبی اور اخلاقی بحران ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب انسانیت کسی ہمہ گیر اخلاقی زوال کا شکار ہوتی ہے، تو اسے بالآخر بقا کی خاطر انہی ابدی اصولوں کی جانب پلٹنا پڑتا ہے جو اس کی فطرت اور اس کے خالق کے مابین ایک متوازن رشتہ استوار کرتے ہیں۔

اس رشتے کی تفہیم کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام انسان اور زمین کے اس تعلق کو کس بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ اس کا واضح ترین جواب قرآنِ مجید کے اس جامع لفظ میں ملتا ہے جس سے انسان کو کائنات میں اس کے کردار کا تعارف کرایا گیا، یعنی "خلیفہ"۔ یہ کوئی محض اعزازی لقب نہیں بلکہ ایک بھاری عہد اور عظیم امانت کا اعلان ہے۔ جب خالقِ کائنات نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر یہ مشیت ظاہر کی کہ:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾

(میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

تو دراصل اس نے انسان کو کائنات کا مطلق العنان مالک نہیں، بلکہ اس کا امین مقرر کیا۔ اس امانت کا اولین تقاضا یہی ہے کہ اس میں قطعی خیانت نہ کی جائے۔ قرآنِ حکیم نے انسان کی اس ذمہ داری کو ایک اور مقام پر "استعمار" کے جامع لفظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا﴾

یعنی اسے زمین سے پیدا کر کے اس میں آبادکاری اور صالح تعمیر کا مکلف بنایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسی منصبِ خلافت کی نزاکت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دنیا شیریں اور سرسبز ہے، اور اللہ تمہیں اس میں خلیفہ بنانے والا ہے، پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ گویا زمین کی یہ فطری تازگی، طہارت اور سرسبزی ایک مطلوبِ شرعی ہے، جسے ہوس پرستی اور بے دریغ استحصال کی بھینٹ چڑھا دینا منصبِ خلافت کی صریح توہین ہے۔

خلافت کی اس امانت کو برتنے کا عملی اور تکوینی ضابطہ قرآنِ مجید نے اسی کائنات کے اندر موجود ایک محکم اصول سے اخذ کیا ہے جسے "میزان" کہا جاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے پوری کائنات کو ایک حیرت انگیز ریاضیاتی اور حیاتیاتی توازن پر استوار کیا ہے اور سورۃ الرحمٰن میں کھول کر بیان فرما دیا کہ:

﴿ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ (7) أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾

(اسی نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کر دی، تاکہ تم اس توازن میں سرکشی اور حد سے تجاوز نہ کرو)۔ یہ میزان محض کوئی تجارتی اوزان کا پیمانہ نہیں، بلکہ عصرِ حاضر کی زبان میں ایک مکمل ایکولوجیکل بیلنس (Ecological Balance) ہے۔ جب انسان اس فطری توازن میں غیر فطری مداخلت کرتا ہے، جنگلات کا سینہ چیرتا ہے اور کاربن کے بے تحاشا اخراج سے فضا کی چادر کو چھلنی کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسی استحصالی عمل کو "فساد فی الارض" کا نام دیا ہے۔ قرآن صراحت کے ساتھ بتاتا ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

(خشکی اور تری میں یہ فساد خود لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کے سبب ظاہر ہوا ہے، تاکہ انہیں ان کے کرتوتوں کا کچھ مزہ چکھایا جائے)۔ آج جدید سائنس اور بین الاقوامی ادارے جب موسمیاتی تبدیلیوں کو براہِ راست انسانی اور صنعتی سرگرمیوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، تو وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اسی قرآنی اصول کی سائنسی توثیق کر رہے ہوتے ہیں۔

اس کائناتی میزان کو برقرار رکھنے اور ارضی فساد سے بچنے کا واحد عملی راستہ وہ ہے جسے شریعتِ اسلامیہ نے "عدمِ اسراف" یعنی میانہ روی اور اعتدال کے اصول میں سمو دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس اصول کو روزمرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں یوں نافذ فرمایا کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ ﷺ کا گزر جب وضو کرتے ہوئے ایک جلیل القدر صحابی کے پاس سے ہوا، تو آپ ﷺ نے پانی کے بے جا استعمال پر ٹوکتے ہوئے اسے "اسراف" قرار دیا۔ جب صحابی نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وضو جیسی خالص عبادت میں بھی اسراف ہو سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے وہ سنہری ماحولیاتی اصول وضع فرمایا:

﴿نَعَمْ، وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهَرٍ جَارٍ﴾

ہاں، اگرچہ تم بہتی ہوئی نہر کے کنارے ہی کیوں نہ ہو۔

ایک ایسے دور میں جب دنیا پانی کی بوند بوند کو ترس رہی ہے، بہتی نہر پر محتاط استعمال کی یہ ہدایت آج کے آبی بحران کی روشنی میں ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام نے چونکہ پانی کو حیات کی اساس قرار دیا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾،

اس لیے اس کے منبع کو آلودگی سے بچانے کے لیے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے تک سے سختی سے منع فرمادیا۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ پانی کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بناتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے ضرورت سے زائد پانی کو مسافروں سے روکنے والوں کو روزِ قیامت اللہ کی رحمت سے محرومی کی وعید سنائی۔ اسی اصول کی پاسداری تھی کہ عہدِ فاروقی میں پانی کو ایک نجی ملکیت کے بجائے اجتماعی وسیلہ سمجھ کر نہروں کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا۔ آج اقوام متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) جس صاف پانی کی فراہمی اور مساوی تقسیم کی بات کرتے ہیں، اسلامی ریاست نے اسے چودہ صدیاں قبل ایک قانونی اور ایمانی فریضہ بنا کر نافذ کر دیا تھا۔

پانی جو کہ تمام ترحیات کا سرچشمہ ہے، اس کی بقا کا براہِ راست تعلق زمین کے نباتاتی نظام اور درختوں کی کثرت سے جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ آبی تحفظ کے متصل بعد شجرکاری کی وہ عظیم الشان تعلیم سامنے آتی ہے جسے رسولِ اکرم ﷺ نے محض دنیاوی نفع کے بجائے اخروی "صدقۂ جاریہ" کا درجہ دے دیا۔ آپ ﷺ کا واضح فرمان ہے:

﴿مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا، أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ، إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ﴾

جو مسلمان کوئی درخت لگائے یا کھیتی کرے، پھر اس میں سے کوئی پرندہ، انسان یا جنگلی جانور کھالے، تو یہ اس کے لیے صدقہ شمار ہوگا۔

اس فرمانِ مبارک میں حیاتیاتی تنوع (Biodiversity) کے تحفظ کی ایک ایسی اچھوتی روحانی بنیاد فراہم کی گئی ہے، جہاں انسان کی نیکی کا دائرہ محض دیگر انسانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ چرند پرند اور حشرات الارض تک محیط ہو جاتا ہے۔ اسی ماحولیاتی حساسیت کی معراج وہ نبوی ہدایت ہے کہ اگر قیامت کی گھڑی بھی سر پر آپہنچے اور ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو، تو اسے فوراً زمین میں بو دیا جائے۔ یہ ایک ایسا آفاقی نظریہ ہے جو نسلوں کے مابین مساوات (Intergenerational Equity) کی اس سے بہتر اور بلیغ کوئی عملی صورت پیش ہی نہیں کر سکتا۔

نباتات اور جنگلی حیات کے اسی تحفظ کو ادارہ جاتی شکل دینے کے لیے، نبی کریم ﷺ نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار "حرم" اور "حمیٰ" کے نام سے محفوظ ماحولیاتی خطے (Protected Ecological Zones) قائم فرمائے۔ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اطراف میں جنگلی حیات کا شکار کرنے، پرندوں کو ڈرانے، اور سبز درختوں کے کاٹنے پر مکمل شرعی پابندی عائد کی۔ اسلام میں حیوانات کے ساتھ حسنِ سلوک محض ایک سماجی رویہ نہیں بلکہ ایمان و نجات کی کسوٹی ہے۔ ایک پیاسے کتے کو کنویں سے پانی پلانے پر ایک گنہگار کی مغفرت اور ایک بلی کو بھوکا باندھ کر مار دینے پر ایک عبادت گزار عورت کے لیے جہنم کی وعید، اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ اسلام میں ماحولیاتی حقوق آخرت کی سخت جواب دہی کا حصہ ہیں۔ یہ رحم دلی جنگ کے خونریز میدانوں میں بھی معطل نہیں ہوتی۔ خلیفۂ اول سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے لشکرِ اسلام کو روانہ کرتے وقت بھی پھل دار درختوں کو نہ کاٹنے اور جانوروں کو بلا ضرورت ذبح نہ کرنے کا جو دوٹوک حکم دیا، وہ آج کے مہذب دور کے جنیوا کنونشنز کے ماحولیاتی پروٹوکولز سے کہیں زیادہ جامع، وسیع اور مؤثر اخلاقی ضابطہ ہے۔

ان سنہری روایات کے برعکس، جب ہم عصرِ حاضر کے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی پیدا کردہ لامحدود صارفیت (Consumerism) پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک شدید اور تلخ تضاد سامنے آتا ہے۔ آج بڑے بڑے صنعتی ادارے اور عالمی کارپوریشنز ماحولیاتی، سماجی اور طرزِ حکمرانی (ESG) کے معیارات کی آڑ میں کارپوریٹ سماجی ذمہ داری (CSR) کے بلند و بانگ دعوے تو بہت کرتے ہیں، مگر زمینی حقائق اس سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ محض منافع کی ہوس میں ماحولیاتی تحفظ کا جھوٹا تاثر دینا، جسے آج کی اصطلاح میں "سبز فریب" (Greenwashing) کہا جاتا ہے، جدید کارپوریٹ دنیا کا ایک عام وطیرہ بن چکا ہے۔ اس ریاکارانہ رویے کے برخلاف، اسلامی نظامِ حیات ایک سچی اور کھری سرکلر اکانومی (Circular Economy) کا علمبردار ہے، جس کی بنیاد "قناعت"، سادگی، وسائل کی بازیافت اور «لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ» کے فقہی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اسلام محض ظاہری دعوؤں کے بجائے باطنی تقویٰ اور احتساب پر زور دیتا ہے۔ جب سیدنا عمر فاروقؓ یہ فرماتے ہیں کہ دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا پیاسا مر گیا تو قیامت کے دن عمر اس کا جوابدہ ہوگا، تو یہ محض ایک جذباتی خطابت نہیں، بلکہ ماحولیاتی گورننس (Environmental Governance) کی وہ خالص اور بے ریا شکل ہے جس میں ریاکاری یا سبز فریب کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

ان تمام علمی، فقہی اور تاریخی دلائل کو جب ایک وسیع کینوس پر رکھ کر جانچا جائے، تو یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ماحولیاتی تحفظ شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک کوئی ثانوی یا حاشیائی معاملہ ہرگز نہیں، بلکہ یہ ایمان، عبادت اور مقاصدِ شریعت کے بالکل قلب میں پیوست ہے۔ آج کا عالمی ماحولیاتی بحران دراصل انسان کی اسی سرکشی اور تکبر کا منطقی انجام ہے جس نے اسے زمین کا خلیفہ اور امین بننے کے بجائے اس کا غاصب اور استحصالی آقا بنا دیا۔ اقوامِ متحدہ کے بیسیوں معاہدات، مونٹریال و پیرس ایگریمنٹس، اور ماحولیاتی کانفرنسز (COPs) کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر یہ عالمی سفارتی کوششیں اس وقت تک مکمل طور پر بارآور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ان کی پشت پر وہ روحانی قوت اور ایمانی جوابدہی موجود نہ ہو جو انسان کو تنہائی میں بھی فطرت کا محافظ بناتی ہے۔ کرۂ ارض کی بقا کا دیرپا حل محض تکنیکی جدتوں، کاربن مارکیٹس یا کارپوریٹ دنیا کے کھوکھلے دعوؤں میں نہیں، بلکہ انہی اخلاقی، دینی اور آفاقی اصولوں کی عملی بازیافت میں پوشیدہ ہے جو قرآن و سنت نے چودہ صدیاں قبل اس کائنات کے توازن اور میزان کو برقرار رکھنے کے لیے نوعِ انسانی کو عطا کیے تھے۔

مصروفیت کے دور میں نبوی طرز زندگی

نبیل غزالی (شعبۂ بزنس مینیجمینٹ، نجم الدین اربکان یونیورسٹی، قونیہ، ترکی)

موجودہ عہد کو تاریخ کے کسی بھی دور سے ممتاز کرنے والی سب سے نمایاں علامت وہ بے پایاں مادی سیلاب ہے جو نت نئی اشیا کی صورت میں ہر گھر، ہر ذہن اور ہر خواہش کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ انسان نے فطرت پر جس قدر تسلط قائم کیا، حیرت انگیز طور پر اس کی داخلی بے چینی میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ تضاد کہ جس قدر ہاتھ بھرے، اسی قدر دل خالی ہوا، عصرِ حاضر کے سب سے بڑے المیوں میں سے ایک ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح میں اسی المیے کا نام مصرفیت (Consumerism) ہے، ایک ایسا فکری و معاشی سانچہ جس نے انسانی وجود کو، جو کبھی مقصد اور بندگی کے گرد استوار تھا، اب محض خرید و فروخت اور ملکیت کے گرد لا کھڑا کیا ہے۔ اس کھوکھلے پن کے مقابل، نبی اکرم ﷺ کا اسوہ ایک ایسی زندہ اور دھڑکتی ہوئی روایت کے طور پر سامنے آتا ہے جو نہ محض ماضی کی یادگار ہے، بلکہ حال اور مستقبل کے لیے ایک ٹھوس اور قابلِ عمل نمونہ ہے۔

مصرفیت دراصل محض ضروریات کی تکمیل کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا نظامِ قدر بن چکا ہے جس میں کسی شے کا حصول انسان کی شناخت، مرتبے اور مسرت کا حتمی پیمانہ مان لیا گیا ہے۔ عالمی سطح پر اس رجحان کی ہولناکی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ورلڈ ڈیٹا لیب کی حالیہ تحقیق کے مطابق دنیا میں نام نہاد طبقۂ صارفین کی تعداد اب چار ارب چالیس کروڑ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ یہ طبقہ سالانہ ساٹھ کھرب ڈالر سے زیادہ کی رقم محض اپنی کھپت پر اڑا رہا ہے، جبکہ عالمی صارفی اخراجات دو ہزار چھبیس تک انہتّر کھرب ڈالر کی حد کو چھونے والے ہیں۔ یہ محض چند معاشی ارقام نہیں بلکہ ایک گہرے تہذیبی بحران کی علامت ہیں، جو بتاتے ہیں کہ کرہ ارض کی اکثریت اب اپنی زندگی

کے معنی بازاروں میں تلاش کر رہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی محض بارہ فیصد آبادی، جو امریکہ اور مغربی یورپ پر مشتمل ہے، نجی صَرف کے عالمی حجم کے ساٹھ فیصد کی تنہا وارث ہے۔ حصولِ اشیا کی اس اندھی دوڑ نے مغربی معاشروں کو صارفی قرضوں کے ایک ایسے مستقل بوجھ تلے دبا دیا ہے، جس نے انسان کو اس کی مالی بساط سے کہیں آگے دھکیل کر نفسیاتی کھوکھلے پن کا شکار کر دیا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنِ کریم کی وہ تعلیمات پوری معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں جو چودہ صدیاں قبل انسان کو اعتدال کا درس دے چکی تھیں۔ قرآن نے سورۃ الاعراف میں کھانے پینے کی اجازت دی مگر حد سے تجاوز کرنے والوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور فضول خرچی کی صریح ممانعت کر کے دراصل مصرفیت کی جڑ کاٹ دی۔ ان آیات میں اسراف کا تصور محض اتفاقی نہیں؛ اسراف حد سے گزر جانے کا نام ہے، اور مصرفیت بذاتِ خود حدود کی نفی پر قائم ایک نظام ہے۔ اسی اصول کی عملی تفسیر نبی اکرم ﷺ کی اس چشم کشا حدیثِ مبارکہ میں ملتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اگر ابنِ آدم کے پاس مال سے بھرے دو میدان بھی ہوں تو وہ تیسرے کی تمنا کرے گا، اور انسان کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز سیر نہیں کر سکتی۔ اس ارشاد میں انسانی خواہش کی لامتناہیت کو جس دقتِ نظر سے بیان کیا گیا ہے، وہ گویا صدیوں بعد سامنے آنے والے اس سائنسی تصور کی پیشین گوئی معلوم ہوتی ہے جسے آج کے محققین مسرت کی چکی یا ہیڈونک ٹریڈمل (Hedonic Treadmill) کہتے ہیں۔ یہ وہ نفسیاتی کیفیت ہے جس میں نئی شے خریدنے کی خوشی چند لمحوں میں ہوا ہو جاتی ہے اور انسان دوبارہ خلا محسوس کرتے ہوئے مزید خریداری کی طرف لپکتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس نے اس حقیقت کو اقوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عملی نمونے کی صورت میں پیش کیا۔ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کے حجرے جو کچی اینٹوں سے بنے اور کھجور کے پتوں سے ڈھکے تھے، اس بات کے گواہ ہیں کہ وہاں مہینوں چولہا نہیں جلتا تھا اور پانی و کھجور پر گزر بسر معمول کی بات تھی۔ یہ سادگی کسی معاشی مجبوری کا نتیجہ ہرگز نہ تھی، کیونکہ مستند روایات شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کی وادیوں کو سونے میں بدل کر پیش کرنے کی پیشکش کی، مگر آپ ﷺ نے فقر کو غنا پر شعوری ترجیح دی۔ کلاسیکی اسلامی فکر میں، جسے امام غزالی اور ابنِ قیم جیسے اکابرین نے بیان کیا، زہد کا مطلب ترکِ دنیا یا جنگلوں میں نکل جانا نہیں ہے۔ زہد

ہاتھ کا اشیا سے خالی ہونا نہیں بلکہ دل کا اشیا کی محبت سے خالی ہونا ہے۔ انسان کے پاس مال ہو یا نہ ہو، اصل معیار یہ ہے کہ آیا مال اس کے دل پر حاکم ہے یا وہ خود مال پر حاکم ہے۔ یہی وہ باریک مگر بنیادی فرق ہے جو نبوی طرزِ زندگی کو جدید مغربی تصورِ رضاکارانہ سادگی سے ممتاز کر دیتا ہے، کیونکہ مؤخر الذکر محض نفسیاتی سکون کے لیے مادیت سے ایک وقتی فرار ہے، جبکہ نبوی ماڈل عبادت، شکر اور آخرت کی جوابدہی پر استوار ایک ابدی ضابطۂ حیات ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیق نے بغیر کسی دینی حوالے کے بھی اسی نتیجے کی تصدیق کر دی ہے۔ کیسر اور رائن جیسے ماہرینِ نفسیات کے مطالعات واضح کرتے ہیں کہ زیادہ مادہ پرست رجحان رکھنے والے افراد میں بے چینی، ذہنی دباؤ اور زندگی سے عدم اطمینان کی شرح نمایاں طور پر بلند ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کے عمرانی مفکرین کے نزدیک آج کا انسان اپنی شناخت اپنے کردار سے نہیں بلکہ اپنے زیرِ استعمال برانڈز سے متعین کرتا ہے۔ شے اب ضرورت نہیں رہی بلکہ ایک علامتی زبان بن چکی ہے جس سے انسان معاشرے پر اپنی برتری ثابت کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دارانہ نظام پیداوار اور طلب پر استوار ہوا، وہاں نبوی معیشت نے گردشِ مال اور تقسیم کو مرکزیت دی۔ زکوٰۃ کی فرضیت اور مال روکے رکھنے یعنی اکتناز کی شدید مذمت اسی اصول کے مظاہر ہیں کہ دولت ذخیرہ اندوزی کے لیے نہیں بلکہ معاشرے کی فلاح کے لیے ہے۔ موجودہ ڈیجیٹل دور اور سوشل میڈیا نے نمائش اور موازنے کی جس آگ کو بھڑکایا ہے، اس نے حرص و ہوس کو بے قابو کر دیا ہے۔ ایسے میں نبوی طرزِ زندگی کا احیا محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ایک طاقتور تہذیبی مزاحمت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ دین کوئی فرسودہ تصور نہیں، بلکہ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے مکالمہ کرنے والا ایک زندہ نظام ہے، اور نبوی سادگی وہ مضبوط بنیاد ہے جس پر آج کے اس پریشان حال اور مصرفیت کے مارے انسان کی نفسیاتی و روحانی تعمیرِ نو کی جاسکتی ہے۔

غربت کے خاتمے کا نبوی ماڈل

مفتی محمد مبارک حسین ازہری بریلوی، شیخ الأدب دار العلوم غریب نواز گلشن رضا بریلی شریف

غربت انسانی معاشرے کا ایسا قدیم مسئلہ ہے جو ہر دور میں مختلف شکلوں کے ساتھ موجود رہا ہے۔ یہ صرف مالی وسائل کی کمی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا ہمہ گیر بحران ہے جو انسان کی عزتِ نفس، فکری آزادی، تعلیمی ترقی، خاندانی استحکام اور سماجی امن کو متاثر کرتا ہے۔ جب معاشرے میں غربت بڑھتی ہے تو جرائم، استحصال، بے روزگاری، جہالت، بھیک، بدعنوانی اور معاشی ناہمواری بھی فروغ پاتی ہے۔ اسی لیے دنیا کے تمام معاشی نظاموں نے غربت کے خاتمے کے لیے مختلف نظریات پیش کیے، لیکن آج بھی دنیا کے کروڑوں انسان بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہیں۔

اسلام نے چودہ سو سال قبل ایسا جامع معاشی نظام پیش کیا جو صرف دولت پیدا کرنے تک محدود نہیں بلکہ اس کی منصفانہ تقسیم، معاشرتی عدل، انسانی وقار اور اجتماعی کفالت کو بھی یقینی بناتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم فرمایا جہاں غربت کے خاتمے کے لیے صرف مالی امداد پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ ایمان، اخوت، محنت، تجارت، زکوٰۃ، انفاق، عدل اور سماجی ذمہ داری کو ایک مکمل نظام کی شکل دی گئی۔

قرآنِ کریم نے غربت کو محض ایک اقتصادی مسئلہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور سماجی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اسی لیے قرآن نے دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾(1)

تاکہ دولت صرف تمہارے مالداروں کے درمیان گردش کرتی نہ رہ جائے۔

یہ آیت اسلامی معاشی فلسفے کی بنیاد ہے۔ اسلام ایسی معیشت نہیں چاہتا جس میں دولت چند افراد یا خاندانوں تک محدود ہو جائے، بلکہ وہ دولت کی گردش کو پورے معاشرے میں جاری رکھنا چاہتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾(2)

اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم رہ جانے والے کا ایک مقرر حق ہے۔

غور کیجیے! قرآن نے غریب کی مدد کو احسان نہیں بلکہ حق قرار دیا ہے۔ یعنی معاشرے کا ہر صاحبِ استطاعت فرد اس ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ پھر ارشادِ ربانی ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا﴾(3)

آپ ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کیجیے، تاکہ اس کے ذریعے انہیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ فرمائیں۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ زکوٰۃ صرف غریب کی کفالت نہیں بلکہ مالدار کے اخلاقی تزکیے کا بھی ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے غربت کے خاتمے کا آغاز انسان کی فکر کی اصلاح سے فرمایا۔ آپ ﷺ نے محنت کو عبادت، تجارت کو سنت، زکوٰۃ کو فرض، صدقے کو برکت اور خودداری کو ایمان کی علامت قرار دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ﴾(4)

کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کبھی کوئی کھانا نہیں کھایا۔

اس مختصر حدیث میں اسلامی معاشی فکر کا عظیم اصول پوشیدہ ہے کہ بہترین روزی وہ ہے جو انسان اپنی محنت سے کمائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى﴾(5)

اوپر والا (دینے والا) ہاتھ، نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

یہ تعلیم ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتی ہے جہاں ہر شخص دوسروں کا محتاج بننے کے بجائے دوسروں کی مدد کرنے والا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے غربت کا علاج صرف خیرات میں نہیں دیکھا بلکہ ایک ایسے متوازن نظام میں دیکھا جس میں:

ایمان انسان کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرے۔

زکوٰۃ دولت کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنائے۔

تجارت روزگار کے مواقع پیدا کرے۔

محنت کو عزت دی جائے۔

سود کا خاتمہ استحصال کو روکے۔

اخوتِ اسلامی معاشرتی تفاوت کم کرے۔

ریاست کمزور طبقات کی کفالت کی ذمہ دار ہو۔

یہی وہ عظیم نبوی ماڈل ہے جس نے چند برسوں میں مدینہ منورہ کو ایک ایسی فلاحی ریاست میں تبدیل کر دیا جس کی مثال تاریخِ انسانیت میں کم ہی ملتی ہے۔

ہجرتِ مدینہ اسلامی تاریخ کا محض ایک جغرافیائی سفر نہ تھا، بلکہ انسانی تہذیب کے ایک نئے معاشی، سماجی اور اخلاقی نظام کا آغاز تھا۔ مہاجرینِ مکہ اپنے گھر، جائیداد، تجارت اور مال و اسباب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے چھوڑ کر مدینہ منورہ پہنچے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کے پاس نہ رہائش تھی، نہ ذریعۂ معاش اور نہ کوئی مالی سہارا۔ بظاہر یہ ایک سنگین معاشی بحران تھا، مگر رسولِ اکرم ﷺ نے اس کا حل صرف امدادی رقوم یا وقتی خیرات میں تلاش نہیں فرمایا، بلکہ ایک ایسا مستقل اور پائیدار نظام قائم کیا جس نے انسانی تاریخ میں فلاحی معاشرے کی نئ

بنیاد رکھی۔ آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات (اخوت) قائم فرمائی۔ یہ صرف رسمی بھائی چارہ نہ تھا بلکہ معاشی شراکت، سماجی تعاون، جذباتی ہم آہنگی اور دینی رفاقت کا ایسا بے مثال نمونہ تھا جس کی مثال دنیا کے معاشی نظریات پیش نہیں کر سکے۔ قرآنِ مجید نے انصار کے اس بے مثال کردار کو ان الفاظ میں سراہا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(6)

اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود محتاج ہوں۔

یہ آیت اسلامی معاشی فکر کا وہ سنہری اصول بیان کرتی ہے جس میں دولت صرف ذاتی ملکیت نہیں رہتی بلکہ معاشرتی ذمہ داری بھی بن جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کو مستقل طور پر دوسروں کا محتاج نہیں بنایا، بلکہ جلد از جلد انہیں معاشی طور پر خود مختار بنانے کی حکمتِ عملی اختیار فرمائی۔ اس کی روشن مثال حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کا بھائی چارہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ سے قائم فرمایا تو سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی آدھی جائیداد پیش کرنے کی پیش کش کی، مگر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجیے۔(7)

یہ مختصر جملہ نبوی معاشی فکر کی روح ہے۔ اسلام ضرورت مند کی مدد ضرور کرتا ہے، لیکن اس کا آخری ہدف یہ ہے کہ وہ شخص اپنے قدموں پر کھڑا ہو، محنت کرے اور دوسروں کے لیے بھی آسانی کا ذریعہ بنے۔ رسول اللہ ﷺ نے سوال کرنے کے بجائے محنت کو ترجیح دینے کی تعلیم دی۔ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور مدد طلب کی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اس کے گھر میں کیا موجود ہے۔ جب معلوم ہوا کہ ایک چادر اور ایک پیالہ ہے تو آپ ﷺ نے وہ فروخت کروا کر اس کے لیے ایک کلہاڑی خریدی اور فرمایا: "جاؤ، لکڑیاں کاٹو، انہیں فروخت کرو، اور پندرہ دن بعد آنا۔" جب وہ شخص واپس آیا تو وہ اپنی محنت سے خوش حال ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ تمہارے لیے اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن سوال کا داغ تمہارے چہرے پر ہو۔(8)

یہ واقعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نبوی ماڈل غربت کا علاج صرف امداد سے نہیں بلکہ روزگار، ہنر، محنت اور عزتِ نفس کے ذریعے کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آزاد اسلامی بازار قائم فرمایا تاکہ تجارت چند

مخصوص گروہوں کی اجارہ داری سے آزاد ہو جائے۔ آپ ﷺ نے ایسا بازار قائم کیا جہاں ناجائز ٹیکس، مصنوعی مہنگائی، ذخیرہ اندوزی اور استحصال کی گنجائش نہ تھی۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا﴾ (9)

جس نے دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: ﴿لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ﴾(10)

ذخیرہ اندوزی صرف گناہگار شخص ہی کرتا ہے۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ایسی منڈی قائم کی جس کی بنیاد دیانت، شفافیت، آزاد تجارت اور اخلاقی ذمہ داری پر تھی۔ یہ اسلامی معاشی نظام کا نہایت اہم ستون ہے، کیونکہ روزگار کے مواقع پیدا کیے بغیر غربت کا خاتمہ ممکن نہیں۔ نبوی معاشی ماڈل کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں نہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے لگام آزادی ہے، نہ اشتراکیت کی جبری مساوات؛ بلکہ اس میں عدل، محنت، اخوت، دیانت اور سماجی ذمہ داری کا حسین امتزاج ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے غربت کے خاتمے کے لیے خیرات سے پہلے اخوت، امداد سے پہلے روزگار، اور انحصار سے پہلے خود کفالت کو فروغ دیا۔ یہی وہ اصول ہیں جو آج بھی اگر حقیقی روح کے ساتھ اپنائے جائیں تو معاشی ناہمواری، بے روزگاری اور غربت میں نمایاں کمی لائی جا سکتی ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے غربت کے خاتمے کے لیے محض اخلاقی نصیحتوں پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک ایسا عملی اور پائیدار معاشی نظام قائم کیا جس میں ہر صاحبِ استطاعت فرد کو معاشرے کے کمزور طبقات کی کفالت کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اس نظام کی بنیاد زکوۃ، صدقات، انفاق فی سبیل اللہ اور سماجی تکافل پر رکھی گئی۔ یہ محض رفاہی اقدامات نہ تھے بلکہ اسلامی ریاست اور معاشرے کی اقتصادی ساخت کے بنیادی ستون تھے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں زکوۃ کو نماز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ﴿أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ کا

حکم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جس طرح نماز بندے کے روحانی تزکیے کا ذریعہ ہے، اسی طرح زکوٰۃ معاشرے کے معاشی تزکیے کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾(11)

آپ ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کیجیے تاکہ اس کے ذریعے انہیں پاکیزہ کریں اور ان کا تزکیہ فرمائیں۔

اس آیت میں زکوٰۃ کے دو اہم مقاصد بیان ہوئے ہیں: مال کی پاکیزگی اور انسان کے نفس کا تزکیہ۔ گویا اسلام دولت کی محبت کو انسان پر غالب نہیں آنے دیتا بلکہ اسے معاشرے کی امانت قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ ...﴾(12)

اس ایک آیت میں اسلام نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کر کے یہ واضح کر دیا کہ اسلامی معیشت کا مقصد صرف انفرادی خوش حالی نہیں بلکہ معاشرے کے ہر کمزور طبقے کی کفالت ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے نفلی صدقات کی بھی غیر معمولی ترغیب دی، کیونکہ ہر ضرورت مند صرف زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں فوری انسانی ہمدردی بھی مطلوب ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ﴾(13)

صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔

یہ حدیث اسلامی معاشی فکر کا ایک بنیادی اصول بیان کرتی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خسارہ نہیں بلکہ برکت، وسعت اور روحانی غنا کا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ فکر اس شخص کی تھی جو بھوکا سو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ﴾(14)

وہ کامل مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے جبکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

یہ حدیث اسلامی معاشرت کا معیار مقرر کرتی ہے کہ ایمان صرف عبادات کا نام نہیں بلکہ معاشرے کے کمزور افراد کے احساس کا بھی نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل فرمائی جس میں ہر شخص دوسرے کے لیے سہارا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ﴾(15)

مومنوں کی باہمی محبت، رحم دلی اور ہمدردی ایک جسم کی مانند ہے؛ جب جسم کا ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو پورا جسم اس کے ساتھ بے خوابی اور بخار میں شریک ہو جاتا ہے۔

یہی اسلامی سماجی تکافل (Social Solidarity) کا حقیقی تصور ہے۔ اس میں غریب صرف ریاست کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے معاشرے کی ذمہ داری ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مقروض اور تنگ دست افراد کے ساتھ نرمی کی تلقین فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ لَهُ أَظَلَّهُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ﴾(16)

جو کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا کچھ قرض معاف کر دے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا۔

یہ تعلیم موجودہ معاشی نظام کے لیے بھی نہایت اہم ہے، جہاں قرضوں کا بوجھ لاکھوں خاندانوں کو غربت کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ نبوی ماڈل میں زکوٰۃ، صدقات، انفاق، قرضِ حسن، اخوت، خود کفالت اور سماجی تکافل ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک مربوط معاشی نظام کے اجزا ہیں۔ ان کا مقصد صرف وقتی ریلیف فراہم کرنا نہیں بلکہ ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جہاں کوئی انسان بھوک، محرومی، بے روزگاری یا بے بسی کا شکار نہ رہے، اور ہر فرد عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ آج دنیا بے مثال معاشی ترقی، صنعتی انقلاب اور جدید ٹیکنالوجی کے باوجود غربت، بے روزگاری، معاشی عدم مساوات اور وسائل کے غیر منصفانہ ارتکاز جیسے سنگین مسائل سے دوچار ہے۔ ایک طرف دولت چند ہاتھوں میں سمٹتی جا رہی ہے اور دوسری طرف کروڑوں انسان دو وقت کی روٹی، تعلیم، علاج اور رہائش جیسی بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ اس صورتِ حال نے واضح کر دیا ہے کہ محض اقتصادی ترقی، شرحِ نمو یا سرمایہ کاری غربت کے خاتمے کے لیے کافی نہیں، بلکہ ایک ایسے اخلاقی اور عادلانہ معاشی نظام کی ضرورت ہے جو انسان کو محض صارف نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ دار بندہ اور معاشرے کا خیر خواہ فرد سمجھے۔

نبوی ماڈل کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس نے معیشت کو اخلاق سے، دولت کو ذمہ داری سے، تجارت کو دیانت سے اور خوش حالی کو خدمتِ خلق سے جوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں قائم ہونے والا اسلامی معاشرہ صرف اقتصادی طور پر مستحکم نہیں تھا بلکہ باہمی ہمدردی، عدل، امانت اور تکافل کا عملی نمونہ بھی تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے غربت کے خاتمے کے لیے چند بنیادی اصول سامنے آتے ہیں:

دولت کو چند ہاتھوں میں محدود نہ ہونے دیا جائے۔

زکوٰۃ اور صدقات کا نظام پوری دیانت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔

تجارت کو سود، دھوکہ دہی اور احتکار سے پاک رکھا جائے۔

ہر فرد کو محنت، ہنر اور خود کفالت کی ترغیب دی جائے۔

معاشرے میں اخوت، ایثار اور سماجی تکافل کو فروغ دیا جائے۔

ریاست کمزور، یتیم، مسکین، بیوہ اور بے سہارا افراد کی کفالت کو اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھے۔

تعلیم اور ہنر مندی کو غربت سے نجات کا مستقل ذریعہ بنایا جائے۔

یہ تمام اصول آج بھی اسی طرح مؤثر ہیں جیسے عہدِ نبوی میں تھے، کیونکہ ان کی بنیاد انسانی فطرت اور الٰہی ہدایت پر قائم ہے۔

اگر مسلم معاشرے نبوی معاشی تعلیمات کو حقیقی روح کے ساتھ نافذ کریں، زکوٰۃ کے نظام کو مؤثر بنائیں، اوقاف کو فعال کریں، نوجوانوں کے لیے ہنر اور روزگار کے مواقع پیدا کریں، تجارت میں دیانت کو فروغ دیں اور سماجی ذمہ داری کے احساس کو زندہ کریں، تو غربت، بے روزگاری اور معاشی محرومی میں نمایاں کمی لائی جا سکتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم غربت کے مسئلے کو صرف خیرات سے حل کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اس جامع ماڈل کو اپنائیں جو انسان کو باعزت روزگار، اخلاقی تربیت، معاشرتی تعاون اور معاشی عدل فراہم کرتا ہے۔

اس تحقیقی مطالعے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

اول: اسلام غربت کو ایک سماجی و معاشی چیلنج سمجھتا ہے اور اس کے خاتمے کے لیے جامع اور متوازن نظام پیش کرتا ہے۔

دوم: رسول اللہ ﷺ نے غربت کے علاج کے لیے صرف امدادی پالیسی اختیار نہیں فرمائی بلکہ محنت، خود کفالت، تجارت، زکوٰۃ، مواخات، سماجی تکافل اور عدل پر مبنی ایک مکمل معاشی نظام قائم فرمایا۔

سوم: نبوی ماڈل میں غربت کا خاتمہ صرف ریاست کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر صاحبِ استطاعت فرد کی دینی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔

چہارم: موجودہ دور کے معاشی بحرانوں کا دیرپا حل اسی وقت ممکن ہے جب نبوی معاشی اصولوں کو ان کی اصل روح کے ساتھ عملی زندگی میں نافذ کیا جائے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے دنیا کو ایسا معاشی نظام عطا فرمایا جس میں دولت کا مقصد تفاخر نہیں بلکہ خدمت، ملکیت کا مقصد استحصال نہیں بلکہ امانت، اور خوش حالی کا مقصد عیش پرستی نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس نے مدینہ کی مختصر سی ریاست کو عدل، اخوت، امن اور خوش حالی کا عالمی نمونہ بنا دیا۔

آج اگر امتِ مسلمہ اپنی معاشی زندگی کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق استوار کرے، نبوی اصولوں کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر نافذ کرے اور زکوٰۃ، انفاق، محنت، دیانت اور سماجی تکافل کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لے تو غربت صرف ایک معاشی مسئلہ نہیں رہے گی بلکہ اس کے خاتمے کی عملی راہیں ہموار ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں رسولِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو صحیح طور پر سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کے معاشی، سماجی اور اخلاقی اصولوں کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارے معاشروں سے غربت، بے روزگاری، ظلم، استحصال اور محرومی کا خاتمہ فرمائے، زکوٰۃ و صدقات کی روح کو زندہ کرے، ہمیں حلال رزق، قناعت، سخاوت اور خدمتِ خلق کی دولت عطا فرمائے، اور ہماری نسلوں کو ایسا صالح، خود کفیل اور باکردار معاشرہ نصیب فرمائے جو سیرتِ نبوی ﷺ کا حقیقی آئینہ دار ہو۔

مصادر و مراجع

(1) سورۃ الحشر: 7 (2) الذاریات: 19 (3) التوبہ: 103 (4) صحیح البخاری
(5) صحیح البخاری، صحیح مسلم (6) سورۃ الحشر: 9 (7) صحیح البخاری (8) سنن ابی داود
(9) صحیح مسلم (10) صحیح مسلم (11) سورۃ التوبہ: 103 (12) سورۃ التوبہ: 60
(13) صحیح مسلم (14) طبرانی (15) بخاری و مسلم (16) صحیح مسلم

سیرتِ نبوی اور معروضی پیشہ ورانہ مہارت: امت کی گمشدہ میراث اور انقلاب کا نقطۂ آغاز

ڈاکٹر محمد کاشف رضا خان۔ ڈائریکٹر: انسٹی ٹیوٹ آف لیڈرشپ اینڈ مینجمنٹ اسکلز

آج ہر شخص کمیونٹی کی حالت میں زبردست، مثبت تبدیلی کی ضرورت سے واقف ہے اور اس کے لیے شدید فکر مند بھی ہے۔ تبدیلی کی اتنی شدید خواہش کے باوجود، یہ سمجھنا کافی مشکل ہے کہ مطلوبہ تبدیلی کیسے لائی جائے۔

ایک سائیکل کے پہیے کی مثال پر غور کریں۔ ہم اس سے اسلامک مینجمنٹ کا ایک بہت ہی حکمت عملی والا اور نہایت اہم سبق سیکھیں گے۔ اس پہیے کا ایکسل / ہب (Hub) بالکل مرکز میں ہونا چاہیے اور تمام تیلیاں مختلف زاویوں اور مختلف جگہوں سے، چاروں طرف سے، مرکز کے ساتھ مضبوطی سے جڑی ہوتی ہیں۔ یہی چیز سائیکل کو استحکام، تسلسل اور بہترین مضبوطی، کارکردگی اور طویل عمر عطا کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں تمام تیلیاں مضبوطی سے مرکزی مقصد کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ اب اس میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اول: اگر تمام تیلیاں مرکزی ہب کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے ساتھ مضبوطی سے جڑی ہوں۔ تو یہ صحت، کارکردگی، پیداواریت اور زندگی، ہر لحاظ سے بہترین حالت ہوگی۔ اگرچہ ہر تیلی کا زاویہ اور مقام مختلف ہے۔

دوم: اگر تمام تیلیاں اب بھی مرکزی ہب کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے جڑی بھی ہوں لیکن مضبوطی سے جڑی ہوئی نہ ہوں، تو یہ پورے پہیے کو غیر صحت مند، کمزور، خطرناک اور غیر یقینی صورتحال اور ٹوٹنے کے قریب خطرے سے بھر دے گا۔

سوم: سوچئے! کیا ہوگا اگر مرکزی ہب کو مرکز سے ہٹا کر کہیں اور بائیں یا دائیں یا اوپر یا نیچے، کنارے کی طرف کھسکا دیا جائے؟ اس کا پہیے / سائیکل کی مجموعی کارکردگی، معیار اور زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟

چہارم: مزید سنجیدگی سے غور کریں کہ پہیے کی کارکردگی، پیداواریت، معیار اور مجموعی زندگی پر اثر کے ابعاد کیا ہوں گے، اگر تیلیوں کی اکثریت مرکزی مقصد کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ تمام تیلیوں کے اپنے اپنے مقاصد ہوں، وہ سائیکل سے باہر مختلف سمتوں میں جارہی ہوں۔ یہ حالت پہیے کی، پوری سائیکل کی اور ہر تیلی کی ہر چیز کو تباہ کر دے گی۔

اب آپ کو پہچاننا چاہیے کہ یہ گول پہیہ ہماری قوم ہے، تیلیاں مختلف مقام اور مختلف کرداروں کے حامل کمیونٹی کے افراد ہیں اور آخر میں ہب / ایکسل کمیونٹی کا مرکزی مقصد ہے یعنی:

الف: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾

ب: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾

ج: ﴿لِوَجْهِ اللهِ﴾

مولانا روم نے کہا:

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی، شرمندگی

مقصد کی پہچان، مقصد کی وضاحت، مقصد سے پرجوش وابستگی، فیصلہ سازی کا عنصر اور ہمارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فاتح مومنین کی انتہائی اعلیٰ کارکردگی کے جذبے کے اعتراف میں ڈاکٹر اقبال نے کہا:

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
پھر تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
اور ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میدان سے اکھڑ جاتے تھے

لیکن ہماری ہماری حالت نمبر چہارم جیسی ہے، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہم سب اپنی زندگی کے اپنے مقاصد کے لیے بہت زیادہ مصروف، منہمک، حکمت عملی بنانے والے اور محنتی ہیں۔ ہم سب اپنی زندگی کے اہداف و مقاصد کے لیے بہت زیادہ کوششیں کر رہے ہیں، اور اسی کی طرف ہم مسلسل اپنی تمام توجہ، سرمایہ کاری، کوششوں اور امیدوں کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔ لیکن یہ یقیناً وہ مقصد نہیں ہے جو اللہ نے دیا تھا۔ ہم بحیثیت قوم زندگی کے مرکزی ہب کو چھوڑ چکے ہیں، یعنی ہم نے زندگی اور وجود کا مرکزی مقصد ترک کر دیا ہے۔ عام طور پر، ہم بغیر کسی خاص فکر کے مسلسل صراط مستقیم سے مختلف راستے پر چل رہے ہیں۔ چاہے ہم معلم ہوں یا جج یا وکیل یا افسر یا ڈاکٹر یا انجینئر یا پیشہ ور یا ملازم یا تاجر یا مزدور یا کچھ بھی، ہم کیریئر، مالی کامیابیوں، فیشن اور پر تعیش زندگی وغیرہ کے مقاصد کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ یہ سب وہ مقاصد ہیں جن کی ہم پیروی کر رہے ہیں۔ تو ہمارے مقاصد ہماری کارکردگی، رویے، شخصیت، پوری زندگی اور ہماری آخرت پر بھی سب سے زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے: ﴿انما الاعمال بالنیات﴾

یعنی: تمہاری نیت تمہاری کارکردگی، تمہارے کام کے عمل اور نتائج پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اور خبر دار! اللہ تمہاری اصل نیت، مقصد، غرض سے باخبر ہے۔

جب ہم اللہ کو فیصلہ سازی کا بنیادی عنصر بناتے ہیں (وجہ اللہ)، جب رضائے الٰہی ہمارا بنیادی مقصد اور سنت ہماری بنیادی مہارت ہوتی ہے، تو ہماری کارکردگی کہیں بہتر ہو جائے گی، ہماری کامیابیاں کہیں بہتر ہوں گی اور اس سے بڑھ کر ہر چیز میں برکت ہو گی۔ ہماری نیت / مقصد / غرض ہماری کارکردگی، پورے عملی طریقہ کار اور نتائج پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اللہ ہماری اصل نیت سے واقف ہے۔ ہم اپنی جھوٹی اور بناوٹی نیتوں سے دھوکہ نہیں دے سکتے۔

ایک سادہ مثال کے لیے، اگر میں ایک بیچنے والا ہوں، تو میں اپنا منافع زیادہ سے زیادہ کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ دوسرے سب کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے، میں کئی طرح کی بے ضابطگیاں کرتا ہوں جیسے:

الف: میں قیمت، معیار، فوائد، نقصانات، ڈیلیوری اور واپسی کے بارے میں جھوٹ بولتا ہوں۔

ب: میں وزن کم کر دیتا ہوں۔

ج: میں ترازو کے توازن میں خلل ڈالتا ہوں۔

د: میں اپنے گاہکوں سے زیادہ پیسے لینے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہ: میں کم دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

و: میں زیادہ پیسہ جمع کر رہا ہوں۔

ز: گاہک خود کو دھوکہ کھایا ہوا، غیر مطمئن محسوس کریں گے۔

ح: اللہ کے غضب کو دعوت دوں گا۔

ط: کوئی برکت نہیں ہوگی۔

ی: مختلف قسم کی کئی مصیبتیں / آفات آئیں گی۔

ک: اور ہمیشہ شکایت ہی کرتا رہوں گا۔

یہ سب نیت کے اثرات ہیں جو کارکردگی، عمل اور نتائج پر پڑتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری نیت رضائے الٰہی ہے تو درج ذیل اثرات ہوں گے:

الف: میں معیار، کارکردگی، قیمت، ڈیلیوری اور واپسی کے بارے میں سچ بولوں گا۔

ب: میں صحیح وزن کو یقینی بناؤں گا۔

ج: میں صحیح توازن کو یقینی بناؤں گا۔

د: میں کوئی دھوکہ دہی نہ ہونے کو یقینی بناؤں گا۔

ہ: میں اس توفیق پر مطمئن اور اللہ کا شکر گزار رہوں گا۔

و: اللہ مجھ سے اور میرے کاروبار سے خوش ہوگا۔

ز: بہت زیادہ برکت ہوگی۔

اسی طرح کے اثرات کمیونٹی میں ہر قسم کے لوگوں پر لاگو ہوتے ہیں، چاہے وہ معلم ہوں، منتظم ہوں، افسر ہوں، پیشہ ور ہوں، ملازم ہوں وغیرہ۔

ہمیں اپنے موجودہ راستے، حالت، عادات اور اصولوں سے صراط مستقیم اور رضائے الٰہی کی طرف ہجرت شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

ذاتی تبدیلی کے لیے حل کی تجویز:

1 :اپنی زندگی کے مقصد کو درست کریں،2. اپنے پیشے کے مقصد کو درست کریں،3. اپنی کارکردگی کے مقصد کو درست کریں اور 4. اپنی شخصیت کے مقصد کو درست کریں۔ 5. آج سے ہی درست مقصد کو اپنائیں اور اس پر زندگی گزاریں6. بنیادی اصلی مقصد کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔

سوچئے !دوبارہ سوچئے:

1 : کیا ہمیں اپنے مقصد کو درست نہیں کرنا چاہیے؟

2 : کیا ہمیں درست مقصد کے مطابق زندگی نہیں گزارنی چاہیے؟

ہمارے نبی محمد ﷺ تمام قسم کے ذاتی، پیشہ ورانہ، سماجی، سیاسی، روحانی اور دیگر مسائل کے لیے روشنی اور حل کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں کے مقصد، شخصیت، کارکردگی اور زندگی میں انقلاب برپا کیا، جن کی زندگیوں میں تاریکی تھی۔ جب لوگوں کے دل رسول اللہ ﷺ کی محبت کے حامل بن گئے اور ان کے دلوں اور زندگی میں ایمان کا نور روشن ہوا، تو وہ سب "دنیا میں کچھ بھی نہیں" سے "اس زمین کی اہم ترین چیز" بن گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں وجود کا مقصد دیا اور انہیں اس مقصد کو جینے کی تربیت دی، حقیقت میں، عملی طور پر۔ وہ مختلف مقامات پر تھے جن کے مختلف کردار تھے اور وہ سب زندگی اور کمیونٹی کے بنیادی مرکزی مقصد کی طرف متوجہ تھے۔

ایک بار پھر درست مقصد کے ذریعے احیاء کا وقت ہے، پھر ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آج اپنی زندگی میں، اپنے پیشوں، ہر کارکردگی، مہارتوں، قابلیتوں، رویے، فیصلہ سازی، کوششوں اور مجموعی شخصیت کے ذریعے اس عظیم مقصد کو کیسے جینا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے دین کی روشنی میں، اپنے دلوں میں حب رسول ﷺ کی طاقت کے ساتھ، سماجی تعمیر نو کے متعدد ضروری HRD آلات کو دوبارہ ڈیزائن، تیار اور نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

کمیونٹی کے لوگوں کے معیار، کارکردگی، پیداواریت اور شخصیت میں مطلوبہ تبدیلیوں کی تعمیر نو کے لیے، رسول اللہ ﷺ کی سنت کی روشنی میں چند تجاویز ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

الف: قومی تعلیمی نظام کو دوبارہ ڈیزائن کرنے کی ضرورت ہے

ب: کھوئے ہوئے کمیونٹی HRD سسٹم میں اصلاح کی ضرورت ہے

سماجی تبدیلی / کمیونٹی کی نشاۃ ثانیہ کے لیے حل کی تجاویز:

الف: اسکولوں اور کالجوں کے لیے ادارہ جاتی استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

ب: مدارس کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

ج: طلبا کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

د: اساتذہ کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

ہ: علما کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

و: پیشہ ور افراد کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

ز: والدین کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام

ح: خواتین کے لیے استعداد کار بڑھانے کے پروگرام۔

یہ سب قومی اصلاح کا حصہ ہیں۔ یہ سب اسلامی مینجمنٹ اور پیشہ ورانہ مہارت کے مطابق ہونے چاہیے، جس پر عمل کرنا ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ ہر قدم کو وجود کے اصل مقصد کے مطابق دوبارہ سوچنا اور دوبارہ ڈیزائن کرنا ہو گا۔ تبدیلی کے تمام اقدامات پر الگ سے تبادلہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ میں تبادلہ خیال کے لیے دستیاب رہوں گا۔

رزقِ حلال کی اہمیت
ارشاداتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

مولانا ارشد رضا مدنی لکھنوی، مدرس جامعۃ المدینہ لکھنؤ

اللہ جل شانہ نے ہر انسان اور چوپائے کی زندگی گزارنے کے لیے رزق کا انتظام فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ کریم، سورۂ ہود، آیت نمبر ۶ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾

اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمۂ کرم پر نہ ہو۔

تفسیر صراط الجنان میں ہے: {دَآبَّةٌ} کا معنی ہے: ہر وہ جانور جو زمین پر رینگ کر چلتا ہو۔ عُرف میں چوپائے کو "دَآبَّةٌ" کہتے ہیں، جبکہ آیت میں اس سے مطلقاً جاندار مراد ہے، لہٰذا انسان اور تمام حیوانات اس میں داخل ہیں۔ (1)

رزق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

﴿الرزق: اسمٌ لما يسوقه الله إلى الحيوان فيأكله، فيكون متناولًا للحلال والحرام﴾(2)

رزق اس کا نام ہے جسے اللہ پاک حیوان تک پہنچاتا ہے کہ وہ اسے کھائے، چاہے حلال ہو یا حرام۔

ارشاداتِ نبوی ﷺ میں رزقِ حلال کی فضیلت

اسلام نے اکتسابِ رزق کی تعلیم ہی نہیں دی، بلکہ حرام رزق سے بچتے ہوئے طلبِ رزقِ حلال کی بھی تعلیم دی ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ اپنے اہل وعیال اور بال بچوں کے لیے حلال رزق کی جستجو کرے۔ کئی احادیث میں رزقِ حلال کھانے اور حرام سے بچنے کا حکم اور ترغیب وارد ہے۔

حدیث نمبر ۱: نبی پاک ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: جو شخص اس لیے حلال کمائی کرتا ہے کہ سوال کرنے سے بچے، اہل وعیال کے لیے کچھ حاصل کرے اور پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، تو وہ قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا۔(3)"

حدیث نمبر ۲: ﴿عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُؤْمِنَ الْمُحْتَرِفَ﴾(4)

ترجمہ: نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شک اللہ کریم اپنے ہاتھ سے کمائی کرنے والے مومن کو پسند فرماتا ہے۔

مرقومہ بالا حدیثِ طیبہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ کی کمائی ہی کرے، اور اللہ پاک اس شخص کو پسند فرماتا ہے جو اپنے ہاتھ سے اپنے اہل وعیال کے لیے کوشش کرے۔ انسان سستی اور کاہلی کا شکار نہ بنے، بلکہ "السعي مني والإتمام من الله" کے جذبے کے ساتھ رزقِ حلال کے حصول کی کوشش کرتا رہے۔

حدیث نمبر ۳: ﴿عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ، وَإِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ.﴾(5)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی وہ ہے جو تم اپنی کمائی سے کھاؤ، اور تمہاری اولاد تمہاری اپنی کمائی ہے۔

مذکورہ حدیث روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام اس بات کا درس دیتا ہے کہ بہترین اور پاکیزہ کمائی وہی ہے جو اپنی کوشش سے کما کر کھائے، دوسروں پر بوجھ نہ بنے۔

حدیث نمبر ۴: ﴿وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ: قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟ قَالَ: عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ﴾ (6)

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: عرض کیا گیا: ”یارسول اللہ ﷺ! کون سی کمائی سب سے پاکیزہ ہے؟“ فرمایا: ”انسان کی اپنے ہاتھ کی دستکاری اور ہر سچی تجارت۔

مرآۃ المناجیح میں ہے: دستکاری میں کھیتی باڑی، کتابت اور دوسری حلال صنعتیں داخل ہیں، اور سچی تجارت سے ہر حلال و صحیح تجارت مراد ہے۔ فاسد، باطل اور مکروہ تجارتیں اس سے خارج ہیں۔ اس قسم کی احادیث میں ”ید“ یعنی ہاتھ سے مراد پوری ذات ہوتی ہے، لہٰذا پاؤں سے چل پھر کر، آنکھ سے دیکھ کر، دماغ سے سوچ کر جو کمائیاں کی جائیں، وہ بھی حلال ہیں۔ طبابت، وکالت، قضاء وغیرہ بھی ہاتھ ہی کی کمائیاں ہیں۔(7)

حدیث نمبر ۵: ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ، فَاسْعَوْا﴾(8)

ترجمہ: اللہ کریم نے تم پر کوشش کرنا فرض کر دیا ہے، لہٰذا تم کوشش کرتے رہو۔

درحقیقت جب کوشش کی جائے تو کامیابی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ کہیں وہ کامیابی دنیا میں ظاہر ہو جاتی ہے، تو کبھی آخرت میں اس کا بہتر صلہ ملنے والا ہوتا ہے۔ جو انسان بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک سورۂ نجم، آیت نمبر ۳۹ میں فرماتا ہے: ﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾

ترجمہ: اور یہ کہ آدمی نہ پائے گا مگر اپنی کوشش۔

حرام رزق کی مذمت پر احادیثِ کریم

حدیث ۱: ﴿الدُّنْيَا خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ، مَنِ اكْتَسَبَ فِيهَا مَالًا مِنْ حِلِّهِ وَأَنْفَقَهُ فِي حَقِّهِ أَثَابَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَوْرَدَهُ جَنَّتَهُ، وَمَنِ اكْتَسَبَ فِيهَا مَالًا مِنْ غَيْرِ حِلِّهِ وَأَنْفَقَهُ فِي غَيْرِ حَقِّهِ أَحَلَّهُ اللّٰهُ دَارَ الْهَوَانِ، وَرُبَّ مُتَخَوِّضٍ فِي مَالِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ، لَهُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔﴾(9)

ترجمہ: حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”دنیا سرسبز اور میٹھی ہے۔ جس نے دنیا میں حلال طریقے سے کمایا اور اسے جائز جگہ خرچ کیا، تو اللہ پاک اسے ثواب عطا فرمائے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا۔ اور جس نے دنیا میں حرام طریقے سے مال کمایا اور اسے ناجائز جگہ خرچ کیا، تو اللہ تعالیٰ اسے ذلت و ہلاکت کے گھر، یعنی جہنم، میں داخل کرے گا۔

اسلام حرام کمائی سے اجتناب کا درس دیتا ہے کہ سود، رشوت، دھوکا، چوری اور ناجائز تجارت سے حاصل ہونے والا مال پاکیزہ نہیں۔ پاکیزہ مال یقیناً وہی ہے جو بالکلیہ حلال طریقے پر کمایا جائے۔ جو حلال کمائے، تو اللہ کریم ثواب عطا فرما کر جنت عطا فرمائے گا، اور اگر کوئی اکتسابِ حرام کی طرف قدم بڑھائے، تو اللہ پاک اسے جہنم میں داخل کرے گا۔ الامان والحفیظ!

موجودہ دور میں رزقِ حلال کے حصول کے تقاضے

سب سے پہلے حلال رزق کے لیے اللہ پاک کی بارگاہ میں دعا کی جائے، پھر اس کے لیے کوشش بھی لازمی کی جائے۔ اپنے تمام تر کاروباری معاملات میں علمائے اہلِ سنت سے رہنمائی حاصل کریں۔ یوں رابطہ بالعلماء بھی رہے گا، جو باعثِ شفاعت ہوگا۔ کتبِ اہلِ سنت کا مطالعہ نہایت مفید ہے، خصوصاً تاجر صحابۂ کرام کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے۔

حرام تجارت کی چند مثالیں:

(۱) چوری شدہ مال کی تجارت۔ (۲) دھوکا، ملاوٹ یا ناپ تول میں کمی پر مبنی تجارت۔ (۳) جعلی برانڈ یا نقلی مصنوعات کی تجارت۔ (۴) فحش مواد دکھا کر تجارت۔ (۵) جوا، سٹے یا دیگر ناجائز آن لائن گیمز کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا۔ (۶) فراڈ پر مبنی تجارت۔ (۷) اعضائے انسانی کی غیر قانونی تجارت۔ (۸) شراب کی تجارت۔ (۹) رشوت لے کر سرکاری کام کروانا۔ (۱۰) وعلیٰ ہذا القیاس۔

خلاصہ

مذکورہ احادیث و توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کو حلال رزق کھلائیں اور اکتسابِ حلال کی تعلیم دیں؛ اس لیے کہ حدیثِ پاک ہے: لوگوں میں ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ انسان پرواہ نہ کرے گا کہ کہاں سے لیا، حلال سے یا حرام سے۔ پیٹ کی فکر میں ہر طرح پھنس جائیں گے، آمدنی بڑھانے اور مال جمع کرنے کی فکر کریں گے، اور ہر حلال و حرام لینے پر دلیر ہو جائیں گے، جیسا کہ آج کل عام حال ہے۔ (10)

حالاتِ حاضرہ میں اکتسابِ حلال رزق نہایت مشکل امر ہوتا جارہا ہے، اور اس مشکل کا سبب علمائے دین اور دین سے دوری ہے۔ اس پُر فتن دور میں حلال رزق کی کوشش کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ”حلال“ یا

"حرام" کا فیصلہ صرف کاروبار کے آن لائن یا آف لائن ہونے سے نہیں ہوتا، بلکہ کاروبار کی نوعیت، لین دین، سود، دھوکا، جوا، حرام اشیاء کی خرید و فروخت وغیرہ پر ہوتا ہے۔

آج سود، رشوت، دھوکا اور جھوٹ عام ہو چکے ہیں، جن کے نتیجے میں مال میں بے برکتی، دل کی سختی اور دنیا و آخرت کی رسوائی جنم لیتی ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک طریقے پر چلتے ہوئے دیانت داری، امانت اور تقویٰ کے ساتھ رزقِ حلال حاصل کرے۔ اللہ کریم ہر انسان کو سچا، دیانت دار اور صالح تاجر بنائے۔ آمین۔

مصادر و مراجع

(1) خازن، ہود، تحت الآیۃ:۶، ۲/ ۳۰۳

(2) کتاب التعریفات، ص:۱۱۰، ناشر: دار الکتب العلمیہ، بیروت

(3) شعب الایمان، باب فی الزہد و قصر الامل، الحدیث:۱۰۳۷۵، ج۷، ص۲۹۸

(4) المعجم الأوسط للطبراني، ج۸، ص۳۸۰، ناشر: دار الحرمین

(5) مشکاۃ المصابیح، ج۲، ص۸۴۴، ناشر: المکتب الاسلامی

(6) کنز العمال، ج۴، ص۱۲۴، ح۹۸۶۰

(7) مرآۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، جلد۴، حدیث نمبر:۲۷۸۳

(8) الجامع الصغیر وزیادتہ، ص۲۶۷۹

(9) جامع الاحادیث، ج۱۳، ص۸

(10) مرآۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، جلد۴، حدیث نمبر:۲۷۶۱

حضور ﷺ کی زندگی میں وقت کی قدر و قیمت

محمد صادق الاسلام علیمی، اتر دیناج پور، مغربی بنگال

وقت اللہ تعالی کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے، انسان کے لئے دنیا و آخرت کی کامیابی وقت کے درست استعمال میں ہے، نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اس بات کی بہترین علمی مثال ہے، کہ وقت کو کس طرح قیمتی بنایا جائے، اور اس کا صحیح استعمال کیسے کیا جائے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر لمحہ اللہ کی عبادت، دعوت، تعلیم، خدمت خلق اور تربیت امت میں صرف کیا۔

قرآن کریم کی شہادت:

رب لم یزل نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾(1)

ترجمہ: تو جب تم فارغ ہو تو خوب کوشش کرو اور اپنے رب کی طرف رغبت رکھو۔

اس آیت کے تحت تفسیر خازن اور تفسیر ابن کثیر کے مطابق یہاں حضور ﷺ کو من جانب اللہ تاکید ہوئی ہے کہ وقت کو کسی نہ کسی خیر و نیکی میں لگائیں۔

نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی میں وقت کا استعمال:

عبادت میں وقت کی پابندی:

حضور ﷺ نے عبادت کے لیے وقت کی پابندی کو لازم قرار دیا۔

دعوت و تبلیغ:

حضور ﷺ نے دن و رات اللہ کے دین کی دعوت دی، مکی اور مدنی دور میں حضور ﷺ نے مختلف مواقع پر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، چاہے وہ طائف کا سفر ہو یا مدینہ میں مختلف قبائل سے ملاقاتیں۔

تعلیم و تربیت:

حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم کی تعلیم و تربیت کے لیے وقت نکالا، مسجد نبوی ﷺ میں حلقہ ہائے درس کا انعقاد اصحاب صفہ کی تعلیم اور انفرادی تربیت حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا حصہ ہے۔

گھریلو زندگی:

حضور ﷺ نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ وقت گزارا اور ان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا اور ان کے ساتھ حسن سلوک فرمایا۔(2)

احادیث میں وقت کی اہمیت پر زور:

دو نعمتیں ایسی ہے جن میں اکثر لوگ خسارے میں رہتے ہیں۔ اول: صحت۔ دوم: فراغت۔(3)

بروز حشر بندے کے قدم تب تک نہیں ہٹیں گے، جب تک اس سے چار چیزوں کے متعلق سوال نہ کیا جائے: اول: عمر کہاں صرف کی؟ دوم: علم پر کتنا عمل کیا؟ سوم: مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ چہارم: جسم کو کہاں کھپایا (برباد کیا)؟(4)

وقت کی اہمیت پر فرمانِ مصطفیٰ ﷺ:

وقت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان مبارک کافی ہے: جو حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿اغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ﴾(5)

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، اور اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اور دولت مندی کو غربت سے پہلے، اور اپنی فراغت کو اپنی مشغولیت سے پہلے، اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔

یہ حدیث مبارک علم و عمل، عبادت و ریاضت بلکہ دنیا و آخرت کے کثیر امور کو جامع ہے۔ جو شخص اس حدیث کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے کوشش کرے گا تو ضرور کامیابی حاصل کرے گا اور دنیا و آخرت میں پچھتانے سے محفوظ رہے گا۔

دنیاو آخرت میں کامیابی کی کلید :

عقلمند وہی ہے جو وقت جیسی عظیم نعمت کو غنیمت جان کر نیک اعمال کی انجام میں مصروف زندگی بسر کرتا ہے، جس کا آج، گزشتہ کل سے اچھاہو، آئندہ کل، آج سے بہتر ہو، اور وہ ان اعمال کو اختیار کرے جو اُسے پرودگار عالم مسلم ان کے قریب کردیں، نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی کوشش کرے، اور برائیوں سے دور رہے۔ انسان نیک اعمال کی بجاآوری میں تاخیر لمبی امیدوں کے باعث کرتا ہے، لیکن جب انسان وقت کو غنیمت جان کر رضائے الٰہی کے حصول میں لگ جاتا ہے، تب جنت کی ابد الآباد نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اور اگر وقت کو صرف عیش و عشرت، خوش گپیوں اور مسخرہ پن میں ضائع و برباد کر دے، تو نقصان و خسران اٹھاتا ہے، حضور نبی کریم ﷺ نے فرصت وقت کو عظیم نعمت قرار دیا ہے، اور اس سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کو گھاٹے میں پڑنے والے بتایا، حضرت سیدنا ابن عباس ﷺ سے روایت ہے

﴿نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: (١) الصِّحَّةُ (٢) وَالْفَرَاغُ﴾(6)

دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ خسارے میں رہتے ہیں (۱) تندرستی (۲) اور فراغت۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ آدمی کبھی فارغ نہ رہے، کہ جسے جسمانی صحت حاصل ہو، اور وہ اس حال میں اللہ تعالی کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے، اور وقت کو یونہی ضائع کر دے تو وہ خسارے میں ہے کہ اللہ تعالی کا شکر اس کے احکام پر عمل کرنے، اور اس کی منع کردہ چیزوں سے بچنے میں ہے، تو جو ان اُمور میں حد سے تجاوز کرے وہی خسارے میں ہے، خسارے کا مطلب یہ ہے کہ جب انہیں صحت اور خوشحالی ملی تھی، تو اللہ تعالی کی یاد، عبادات ذکر و اذکار و اوراد زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے تھا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، جس کے سبب نقصان اُٹھایا۔ رب ذوالجلال کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ہم سب کو ان باتوں باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ اور وقت کو بہترین کام میں صرف کرنے کی توفیق بخشے (آمین یارب العالمین)

مصادر و مراجع

(1) سورۃ الانشراح
(2) سیرت النبی ﷺ
(3) بخاری، کتاب الرقاق
(4) ترمذی، کتاب صفۃ القیامہ
(5) المستدرک
(6) بخاری

سیرت اور نوجوان

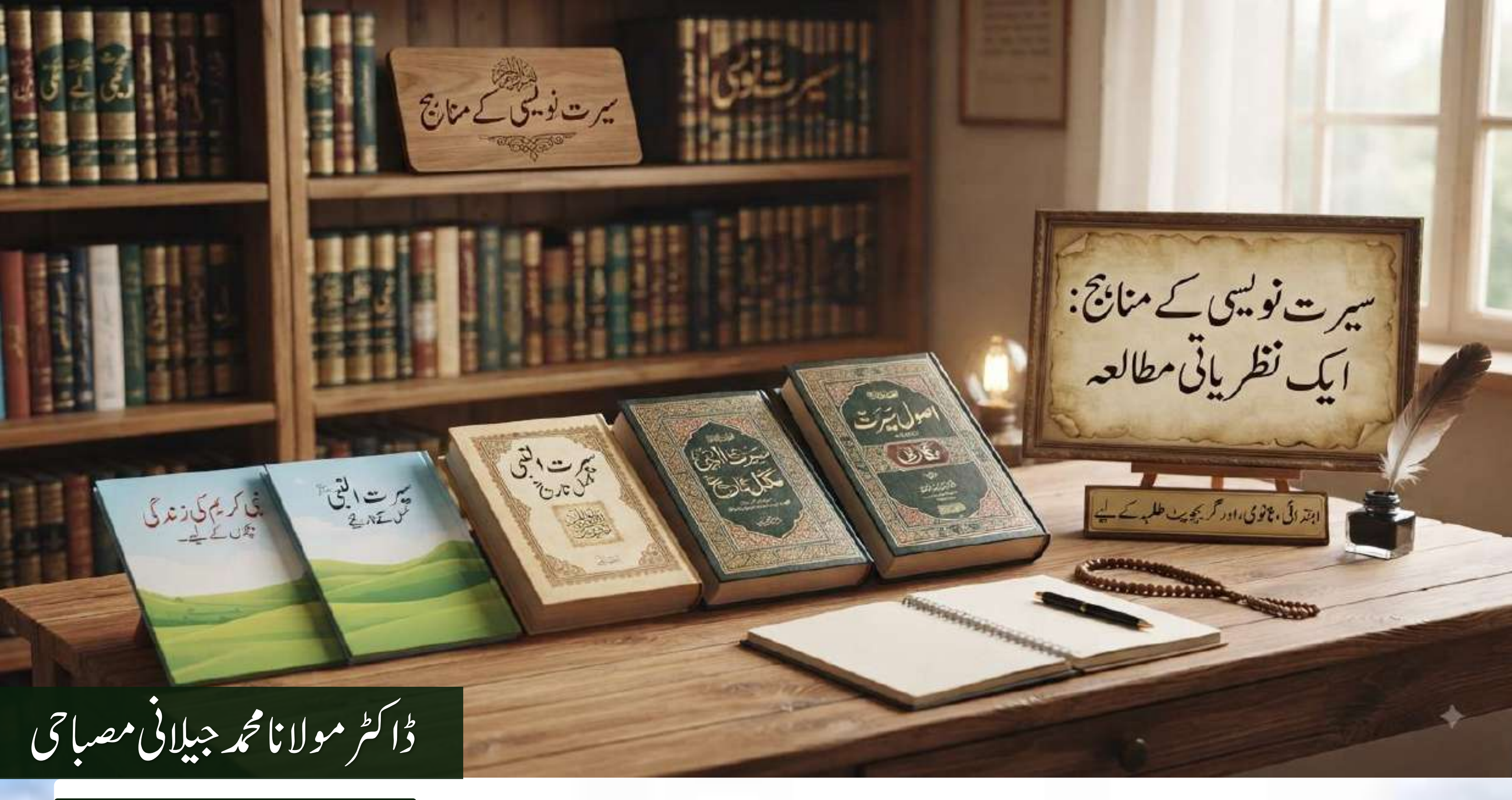

ڈاکٹر مولانا محمد جیلانی مصباحی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم، والصلوۃ والسلام علی رحمۃ للعالمین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ومن والاھم اجمعین الی یوم الدین

منتخب موضوع کے آفاق:

میں نے کوشش کی کہ میرا موضوع نہایت ذیلی اور قابل عمل ہو۔ ہمارا موضوع اپنے آپ میں اتنے آفاق سموئے ہے کہ تناظری امور پر گفتگو کی ضرورت کی وجہ سے یہ تحریر قدرے طویل ہو جائے۔ میرے موضوع "ابتدائی، ثانوی اور گریجویٹس طلبہ کے لیے سیرت نویسی کے مناہج" ایک نظریاتی خاکہ "کا اصل ہدف سیرت کریمہ کو نئی نسل کے پرداخت، تعلیمی، اور فکری ارتقا کے مراحل میں پیوست کرنا ہے۔ ان امور پر توجیہی گفتگو ہوگی جن پر سیرت نویس کی گہری نظر ضروری ہے، مثلا بدلتے ہوئے حالات، تناظری ماحول، سماجی اقدار، فکری ارتقاء، عہد تعلیمی میں تعلم و تعقل و؛ ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے، مختلف عمر میں طلبہ کے جسمانی نشو نما، عقلی نشو نما، اور جذباتی نشو و نما پر بھی گہری نظر ہو، اس لیے اس پر بھی کچھ گفتگو ہوگی۔

ان جوانب پر گفتگو اس امر کی متقاضی ہے کہ ان نظری پہلوؤں پر گفتگو کی جائے، جن پر اس موضوع کا دارومدار ہے۔ مدار موضوع کے دو بنیادی پہلو ہیں:

پہلا: مہبط انطباع کے طریقہ کار

مہبط انطباع سے مراد انسانی قوی ادراکیہ ہیں جو سمع، بصر اور فواد پر مشتمل ہیں۔ اس میں ان قوی کا ارتقاء، طریقہ کار اور عمری تقاضے شامل ہیں۔

دوسرا: انطباعی امور اور تاثیر انطباع کے طریقہ کار

انطباعی امور سے میری مراد خارجی امور واردہ ہیں جس میں مرئیات، مسموعات اور محسوسات (مبصرات) شامل ہیں۔ امور واردہ کے مہبط انطباع پر اثر اندازی کا طریقہ، اس کے تقاضے، شرائط شامل ہیں۔

منہج استدلال کا قیام:

ہمارے مباحث غیر حوالہ جاتی طور پر اسلامی مراجع سے مستفیض ہوں گے۔ ہاں ان مراجع کے مختلف جوانب پر تدقیقی گفتگو کی جائے گی۔ ظواہر کے ماوراء، گہرے محرکات و علل پر قدرے تفصیلی گفتگو ہو گی۔ ضروری نظری اصطلاحات کی وضاحت بھی پیش کی جائے گی۔ بعض مقامات پر سلسلہ وار گہرے محرکات پر بھی کچھ گفتگو ہو گی جو اس موضوع کی افادیت کے لیے لازم ہے۔

ہم بعض مقامات پر سائنسی معلومات کو مرجع استدلال بنائیں گے، لیکن ایسا کرنا سائنسی مرجعیت کو قبول کرنے کی غرض سے نہ ہو گا۔ کیوں کہ بسا اوقات سائنسی تحقیقات، سماجی اور فکری آفاق میں دراندازی کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں، اور بنام تحقیق محض رائے تراشی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی دراندازی اور علمی تلفیق سائنسی تحقیقات کا سیدھا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ عقلی طور پر مستنبط ہوتی ہیں اور منطقی استدلال میں بہت کمزور ثابت ہوتی ہیں۔ ایک ہی سائنسی تحقیق گوناگوں افکار اور اقدار کو ہوا دینے کی وجہ بن جاتی ہے، اور طلبہ کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے، خاص طور پر اگر ان طلبہ کی قوت فکر اور منطقی استدلال پر گرفت کمزور ہو۔ طلبہ بلکہ عامۃ الناس عموماً سائنس کے نام پر بیانیے / اختلاق کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسی حد تک سائنسی بنا کا استعمال کریں گے جہاں تک یہ اسلامی مصادر و مراجع پر مبنی موقف کی توضیح کر سکیں۔ قرآن و حدیث کے علوم کم از کم تا قیامت علوم پر مشتمل ہیں، جبکہ سائنس رفتہ رفتہ، اور ٹکروں میں تحقیقات سامنے لاتی ہے۔ سائنسی وسائل کی ارتقاب بھی باقی ہے، نئے وسائل سے نئی تحقیقات سامنے آئیں گی۔ اور اسی لیے بعض سائنسی مواقف سے اسلامی مصادر کو متصادم

ہونے کا الزام بے جا ہے۔ یہ بعینہ ممکن ہے کہ اب تک ایسے وسائل ناپید ہوں جو اسلامی مصادر پر مبنی باریکی تک رسائی حاصل کر سکیں۔ سائنس کی اس حد کو سمجھتے ہوئے گفتگو کرنے سے سائنس سے نفع حاصل کرتے ہوئے اس کے ضرر سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ سائنسی مرجعیت عام تحریروں کا روش بن چکی، لہذا اس پر تھوڑی توضیحی گفتگو کر لی جائے۔

سائنسی مرجعیت کی اسلامی صورت:

قرون جدیدہ میں سائنسی دعوے عام طور پر کفار و مشرکین کی طرف سے آئے ہیں۔ ان میں اختلاق و تلفیق بھی کی گئی ہے۔ جزوی حقائق کو کلی و کونی حقائق کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ جزوی حقیقت کے ظہور کا مطلب یہی ہے کہ اس حقیقت کی موجودہ تفسیر و توضیح غلط ہے، نئے شواہد کا انتظار لازم ہے۔ سائنسی مرجعیت کی گونا گوں پیچیدگیاں اور توضیحی رد و بدل، بیانیے پر مبنی تفسیریں، ان کی مشتبہ صداقت اس بات کا اقتضا کرتی ہیں کہ سائنسی مراجع ﴿إذا جاءكم فاسق بنبإ فتبينوا﴾ کے زمرے میں رکھا جائے، خاص طور پر خلائی اور آسمانی دعووں اور آفاق و انفس سے متعلق تحقیقاتی دعووں کو۔ اس کا مطلب یہ کہ کسی بھی سائنسی حقیقت کو اس وقت اسلام میں قابل استدلال نہ سمجھا جائے جب تک کہ اس پر شہادت عدل قائم نہ ہو۔ انہی شواہد کو مرجعیت کا مقام عطا کیا جائے جس کی تحقیق یا تصدیق عادل مسلم محققین نے کی ہے۔ اگر نہیں کر پائے ہیں تو مسلم حکمران یا تعلیمی اور تحقیقی تنظیمیں ایسے شعبہ جات قائم کریں جہاں سائنسی دعووں کا از سر نو تجربہ و مشاہدہ کیا جائے، اور از سر نو تحقیق کی جائے۔ سائنسی مشاہدات و نتائج کا تجزیہ کیا جائے اور ان پر مبنی دعووں اور استنباط کے حدود کی تعیین کی جائے۔ اس سے سائنسی مرجعیت اسلام کے زیر دست آ جائے گی۔ اس کے کچھ اضافی فوائد بھی ہوں گے۔ اسے بھی دین کا کام سمجھا جائے گا اور علوم دینیہ و دنیوی کی خلش کم ہو گی۔ (حالاں کہ یہ خلش محض نظام اسلام کے فقدان کی بنیاد پر پیدا ہوئی ہے۔) اسلامی حکومتوں میں سائنسی ترقی میں تیزی بھی آئے گی، اور نئے ایجادات میں مسلم سائنسداں سر فہرست ہوں گے۔ عامۃ المسلمین کی ایک بڑی تعداد سائنسی مرجعیت کی دلدادہ ہے۔ جب ان مراجع میں سر فہرست کفار و مشرکین کے نام آتے ہیں، تو ان پر کفر و شرک کے تئیں نرم گوشہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی عقلی مرجعیت اسلامی مرجعیت سے بتدریج دور ہو کر سائنسی مرجعیت کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ کفار و

مشرکین کے انکشافات کے زیر اثر ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں، اور یہی عین فطرت ہے، جب کسی کی حقانیت آپ کو مبہوت و مرعوب کر دے اور کسی کی عقل و فہم کے رعب کا گہرا اثر ہو جائے اس کے بعد اس کی ہر جائز و ناجائز بات کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ حالاں کہ انہیں عصمت بھی حاصل نہیں۔ بہت سارے سائنسداں خاص نظریات کے متناسب تحقیق کے پہلو ہی اجاگر کرتے ہیں، جس سے سائنسی مرجعیت کے دلدادہ افراد گمرہی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ کفار و مشرکین کی باتوں کا اعتبار علماء اسلام کی باتوں سے زیادہ ہے۔ اس کی اور بھی وجہیں ہیں، لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اسی لیے تمام سائنسی دعووں کی اسلامی مرجعیت ضروری ہے۔

ہمارے استدلال کا دوسرا پہلو نظری گفتگو ہے۔ ان مقامات پر بھی نظری گفتگو کرنا ضروری ہے جہاں بداہت مقبول ہے۔

بداہت کی حقیقت:

"بچہ جذباتی ہوتا ہے؛ وہ دوسروں کی نقل کرتا ہے؛ با اخلاق گھروں میں بچے اخلاق حسنہ سے مزین ہو جاتے ہیں؛ علمی ماحول میں نمو یافتہ بچے، علمی اور فکری آداب کے مالک ہوتے ہیں۔" اس طرح کی گفتگو کو بدیہی گفتگو کہتے ہیں۔ حوادث واقعات کے ظواہر پر حکم لگانے کو بدیہی کہتے ہیں اور یہ عامۃ الناس کا طرز فکر اور طرز کلام ہے۔ اولو الالباب کے نزدیک ہر بدیہی امر نظری ہوتا ہے۔ ہر بدیہی امر کے پس پردہ اسباب و علل کا ایک لمبا سلسلہ ہوتا ہے؛ ان اسباب و علل کے سلسلوں پر نظر کی حد اصحاب فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی پر منحصر ہے۔ بعض حضرات ظواہر کے دوسرے اور تیسرے تہہ تک ہی رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔

بچوں اور نوجوانوں کے تیار کردہ اسلامی اور سیرت نبوی ﷺ کی تحریریں پس پردہ گہرائی اور دقت نظری کی عکاس ہوں۔ عامۃ الناس کی فکر و کلام سے ہم آہنگ ہوں، پس پردہ گہری بصیرت موجود ہو جس کا اثر سامعین پر پڑے تو ضرور، لیکن ان بصیرتوں کی گہرائی اتنی ہو کہ وہ تحریروں سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوں، کیوں کہ ایسی تحریری گہرے مبہم معانی کو روشن کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ کلام بدیہی کلام لایعنی ہے یا تحصیل حاصل ہے اور اس پر سطحیت فکری کا بھی اطلاق موزوں ہے۔ ایسی صورت میں لوگوں پر بحکم ظاہر قائل کی باتیں اثر انداز نہیں ہوتی۔

اثر انگیزی کے لیے ضروری ہے آپ کی تحریر مضمر پیچیدگیوں کی بلیغ انداز میں عقدہ کشائی کریں، افکار کی باہمی کشمکش کا حل پیش کریں؛ فکر و قلب کی بے ہنگامی کو ہم آہنگ کریں جس سے داخلی اضطراب کا مداوا ہو۔ ارباب قلم اور سیرت نویس حضرات کی دقت نظری ایسی ہو کہ بدلتے انسانی رویوں کے اسباب پر ان کی بہت ہی گہری اور بنیادی نظر ہو؛ آپ کی فراست ان زاویوں کو محیط ہو جو قارئین کے حاشیہ ذہن سے بالاتر ہوں۔ ارباب فکر و قلم قدرے مطلوبہ گروہ کی عملی اور نفسانی رد عمل کے پیشین گوئی بھی کر سکیں۔ ورنہ تحریروں کا انبار ہو یا کلام شعلہ بار سب لایعنی ہے۔ گہری نظری بنا پر مبنی تحریروں سے قول و قلم کا وزن اور قائل کا علمی رعب دونوں فزوں ہوتا ہے۔ اس کی ظاہری تمثیل یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ سطح کی تحریک سطح کو متاثر کرتی ہے اور زود رو بھی ہوتی ہے جیسے مقررین کی لفاظی اور شعلہ بیانی۔ اور گہرائی میں پیدا کی گئی تحریک گہرائی سے لیکر اطراف ستہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور دیرپا بھی جیسے صوفیائے کرام کی صحبت و نصیحت اور ان کی تحریریں۔ اور اس کی توفیق خالص اخلاص سے حاصل ہوتی ہے۔ ولیس ذلک الا بتوفیق اللہ الکریم۔ خود یہ کلام بھی سماعۃ بدیہی ہے۔ لیکن ارباب اخلاص و فکر پر عیاں ہے کہ اس بداہت کی فہم عموماً ناپید ہے جس میں کثیر تعداد خواص العوام کی بھی ہے۔

میرے نظری زاویہ بیانی کا مخصوص ہدف اطفال، نوبالغ اور گریجویٹس ہیں۔ اصلاحی جدوجہد کے ناکامی کے اسباب ایسے چیلنج ہیں جو ناقابل حل معلوم ہوتے ہیں، بسا اوقات ان اسباب کی سببیت شاید عام عقلوں پر ابا کرتی ہیں یا پھر بے اعتنائی کے شکار ہیں۔

نسل جدید کے دو بڑے چیلنج:

آنے والے سطروں میں ہم اس بات کو واضح کریں گے کہ کیوں موجودہ جوان و معمر نسل کے اخلاق و اقدار ہی اگلے نسلوں کی اہلیت اور نااہلیت کی بڑی حد تک ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اگر موجودہ نسل سیرت نبوی سے مزین ہوتی تو جدید نسل کی داخت و پرداخت کی اکثر مشکلیں ناپید ہوتیں۔ اسی میں پہلا چیلنج مضمر ہے۔ ہم قدرے اس نسل کی محرومی پر گفتگو کرتے ہوئے اسے واضح کریں گے۔ دوسرا چیلنج نسل نو کے مفاہیم و اقدار کے مصادر کا مسئلہ

ہے۔ انسانی سماعت، بصارت اور فواد پر نووارد مضامین، نئے انداز اور نئے وسائل ہیں۔ اگر پہلا چیلنج امر بالمعروف کی ناکامی کا تو دوسرا معاملہ نہی عن المنکر کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔

پہلا چیلنج:

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اور عالم اسلام میں عثمانی سلطنت کے زوال کے وقت سے مسلمانوں کا زوال تیزی سے شروع ہوا۔ نظام کے فقدان کے ساتھ مسلم معاشرے کے تانے بانے تار تار ہونے لگے۔ معاشرے کی احیاء نو کی کئی سطحوں پر کوششیں چلتی رہی پر نظام کی سطح پر کوشش کو ناقابل حصول یا ناقابل عمل سمجھا گیا ہے۔ پچھلے ادوار زوال کے بر خلاف، فکری زوال، اس زوال نظام کے ہمرکاب رہا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو یہ محسوس ہونے لگا بلکہ آج بھی کثرت مسلمہ کو لگتا ہے کہ نظام اسلام کی معنویت ختم ہو گئی ہے، حالانکہ اسلام کی معنویت سے وہ بھی روگردانی نہ کر سکے۔

لہذا جہد و عمل کا پورا زور سطح نظام کے ماوراء صرف ہونے لگا۔ لیکن یہ کیوں کر ممکن ہو کہ خدوخال بغیر استخوانی ڈھانچے کے برقرار رہ سکیں۔ نظام کا وجود وہ بنیادی ڈھانچہ ہے جس پر اصلاح کا صحت مند جسم نمو پاتا ہے۔ اس کے فقدان سے کوششیں بار آور نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ساری کاوشوں کا نتیجہ ایک بے جان امت مسلمہ کے شکل میں متصور ہونے لگا۔ اس کا ایک گہرا اثر ہر نئی نسل پر پڑا۔ ہر نوعمر نسل کے سامنے ایک بیمار اسلامی معاشرہ کی گھناونی تصویر سامنے رقصاں ہونے لگی۔ ہر نوعمر نسل اپنی اگلی نسل کو اس کا ذمہ دار سمجھنے لگی جو کہ ایک معقول بات بھی تھی۔ ہر معمر نسل کی ناکامی، نوعمر نسل کے ذہن میں ان کی نااہلیت کے مترادف تھا۔ ہر نسل نو کے دل میں اپنی سابق نسل کے تئیں احترام کا جذبہ ختم ہونے لگا اور تاہنوز جاری ہے۔ ایسی صورت میں، نوعمر طبقہ، اسلامی معاشرہ کے مثالی اور قابل تقلید معمر افراد سے محروم ہو گیا اور نظام تربیت درہم برہم ہو گیا۔ تدریجا، نسل نو اسلاف کے فکر و اقدار سے متنفر ہوئی اور بیرونی اصول اقدار کی طرف مائل ہونے لگی۔

نظام جدید کی جامع در اندازیوں نے اسے مزید ناسور بنا دیا۔ دوسری طرف، سودی نظام کے غلبے نے ہر طبقہ کو معیشت کا غلام بنا دیا، جس کے نتیجے میں قومیت اور وطن پرستی جیسے ناجائز بتوں نے بھی جنم لیا۔ سودی نظام کے زیر اثر جس میں معیشت کو ہر پانچ، سات سال میں مضاعف ہونا لازم ہے، شاید ہی غیر ملحف، رزق حلال کے متلاشی

کے پاس کسب معیشت سے زیادہ وقت میسر ہو، اور معیشت سے وراء عقل وفکر کی رسائی ہو الا ماشاء اللہ۔ فاقہ اور سماجی وقار کے خوف سے اکثر و بیشتر آبادی کا رجحان دنیا طلبی یا معیشت طلبی کی طرف غالب ہوا۔ ان تعلیمی نظام کی طرف اکثریت کا ازدحام ہوا جہاں سے رجائے معیشت منسلک ہوئی۔ یہاں پر ہم نظام جدید کے جالوں میں جا گرے۔ اب نظام جدید کی تعلیم و تربیت اور ثقافت سازی کی دراندازیوں نے نشو و نما کے ادوار کا اختیار ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس نے اس ناسور کو ناقابل علاج بنا دیا۔ ایسی نسلیں وجود میں آنے لگیں جو اسلامی تربیت سے محروم رہیں اور پھر جدید مبادی اور اصولوں کے حامل بن گئیں۔ اور بڑی تعداد اس محرومیت کے احساس سے بھی محروم ہو گئی۔ اس منظر کشی کا ہدف یہ ہے کہ سیرت نبوی ﷺ سے مزین ہونے کا سب سے اہم وسیلہ ہم نے کھو دیا اور کھوتے ہی جا رہے ہیں۔ اگرچہ دینی اور دنیاوی معلومات کی کثرت ہوئی پر ان کے واقعی محمل اور عملی معانی کی سمجھ، قابل تقلید سلف کی اہمیت ختم ہونے کی وجہ سے مفقود ہو گئی۔ معاشی دباؤ اور نظامی دباؤ کے مختلف عوامل کی وجہ سے عامۃ الناس کی اکثریت، اور علماء سے لیکر خانقاہوں تک سارا طبقہ روح علم سے محروم ہو تا گیا اور دنیاداری تقریباً سب کا شیوہ بن گیا الا ماشاء اللہ۔

ان حالات میں ضروری ہے کہ سیرت نویسی کا ایک بڑا حصہ معمر حضرات کی طرف مرکوز کیا جائے۔ دوسری طرف، نسل نو کے لیے جدید تعلیمی نصابوں میں سیرت اور اسلامی اقدار پیوست کی جائیں۔ سماجیات اور سیاسیات اور ان سائنسی افکار کی کتابیں اسلامی حاشیوں سے مزین ہوں، جس سے فکری مرجعیت متاثر ہوتی ہیں۔ اسکولوں کا ثقافتی ماحول خالص دینی ہو اور غربی تناظر کے معاکس ہو۔ ان تحریروں میں مغربی ثقافت کے اقدار کی مناسب اور اثر انگیز تقبیح ہو اور متبادل اسلامی اقدار کو بلند مقام دیا جائے۔

معمر نسلوں کی ایسی گمرہی کی وجہ زمن زوال کی پیچیدگیاں بھی ہیں۔ زمن زوال کی پیچیدگیوں سے میری مراد وہ بڑے خلا اور اس کے ناقابل تلافی اثرات ہیں جو نظام قوت کے فقدان سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ خلا اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ افرادی قوت اس کی تلافی کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ ساری کوششوں کے باوجود بھی اپنے ہدف کو پورا کرنے میں ہم ناکام معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر نسل معمر ہونے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم بھی کرتی ہے۔ لیکن عمر نو میں سلف کو ذمہ دار بنا کر ان سے متنفر ہو چکی ہوتی ہے۔ حالاں کہ یہ وقت باہمی دست گیری کا ہے۔ زمن زوال

کی پیچیدگیوں سے معمر اور نسل نو دونوں کو آگاہ کیا جائے اور نسل نو اور معمر نسل میں خلا و خلش کو کم کیا جائے۔ نو عمر اور معمر نسل دونوں کے رویے فی نفسہ معقول معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں نسلوں کو زمن زوال کے پیچیدگیوں سے آگاہ کیا جائے تو دوریاں کم ہوں گی اور بنیان مرصوص کی طرف اقدام ہو گا۔ اور اسی طرح ہدف اسی یعنی قیام نظام کی طرف جہد و کاوش کو مہمیز دیا جا سکے گا، گو کہ اس کے بھی مختلف اور عقدہ دار تقاضے ہیں۔

دوسرا چیلنج:

اضطراری اور اختیاری طور پر سیکھنے کے مصادر و وسائل کا مسئلہ ہے اب سیرت نبوی ﷺ پر تعلم و تربیت کا انحصار اس مرکزی چیلنج کے حل پر بڑی حد تک موقوف ہے۔ پہلے چیلنج نے ایک بڑا خلا پیدا کر رکھا ہے۔ اب ماحول میں موجود وسائل کا کردار بہت اہم ہو گیا جو غیر شعوری یا اضطراری طور پر بچوں کے اخلاق و اقدار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وسائل تعلم کے مصادر بشمول ڈیجیٹل وسائل اور لٹریچر کا اغیار کے فکر و تحریر پر مبنی ہونا ایک بڑا چیلنج ہے۔

ماحول کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے قبولیت یا عدم قبولیت کی فطری اور عمر پر مبنی انطباعی ارتقا کا سمجھنا ضروری ہے۔ کسی بھی مفہوم کا ذہنی قبولیت کی حد تک پہنچ جانا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ قابل انحصار عوامل کا نظام اس کے متناسب ہے یا نہیں۔ کسی بھی مفہوم کا وجود، وجود محض نہیں ہوتا۔ اس وجود کے کئی جوانب و اطراف ہوتے ہیں۔ عقل ہر نئے مفہوم کو اس کے مناسب محل میں محفوظ کرنے کے لیے ان اطراف و جوانب کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر اطراف و جوانب کسی نئے مفہوم کی تائیدی میلان سے مزین ہیں اور تائیدی عوامل کا غلبہ و کثرت ہے تو ذہن قبولیت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مفہوم یا اس کے عوامل و اطراف صحیح ہوں یا حق پر مبنی ہوں، بلکہ اس کی کثرت پر مبنی ہوتا ہے۔

تائیدی میلان کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ پہلے سے موجود ماحول میں مناسب نئے مفہوم کا تعارف کرایا جائے، مثلاً جب بچے کی تربیت اپنے ہی ثقافتی ماحول میں کی گئی ہو، تو متعلقہ جوانب و اطراف کثرت واقعات

اور تمثیل سے مزین ہوتے ہیں، اس سے قبولیت آسان ہوتی ہے، اسی لیے دینی ماحول میں پروردہ بچوں یا نو عمروں کو دینی موقف سمجھانا آسان ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مفہوم کے تعارف سے پہلے عقل کے نزدیک ان عوامل واطراف کو پیوست کر اکر عادی بنایا جائے جس پر یہ نیا مفہوم مبنی ہے۔ اور اس طرح ایک نیا مفہوم قابل قبول ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں قبولیت کا مدار نئے مفہوم کا ماحول کے متناسق ہونے پر ہے۔ اسی امر کو مختلف اصطلاحات جیسے ماحول اور پس منظر اور تناظر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام متناسق تناظر کا فقدان:

نظام اسلام کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایک ایسے بڑے ماحول کا وجود مٹ گیا جو اسلامی مفاہیم کو تناظر بخشے، اور تا حال یہی معاملہ ہے۔ نظام اسلام سے مراد، اسلامی فکر و فلسفہ و علوم کی بالادستی اور غیر متنازع اسلامی قوت کا وجود ہے۔ لیکن پچھلے چند سو سالوں سے اس کی جگہ ایک ایسے نظام نے لے لی ہے جہاں وسیع تر تناظر اسلام سے متنافر ہے۔ جس ماحول میں امت کے افراد کی نشو نما ہو رہی ہے، اس میں اسلام متنافر واقعات اور تمثیل کی کثرت ہے۔ اسلامی موقف کی عدم قبولیت اور الحاد وارتداد کی طرف میلان اس فطری عمل کے نتائج ہیں۔ یوں ہی قوت حکومت کا اصل منبع بھی قوت فکر و نظر ہے۔ اسی سے نظام حکومت کی قبولیت کا وسیع تر تناظر قائم ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کی عدم صلاحیت کا تصور اور مغربی نظام کے قبولیت کا میلان اسی کے حتمی مصیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری طاقتوں کے اسلامی خطوں سے کوچ کر جانے کے بعد بھی اسلام متصادم نظام حکومت قائم ہوئے۔ قوت حکومت اور نظام فکر وفلسفہ دونوں باہمی مترابط ہیں اور ایک دوسرے کی تقویت و تضعیف کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن فکر وفلسفہ کی بالادستی آئین اول ہے۔ مکی اور مدنی زندگی اس اسبقیت کی نظری شواہد ہیں۔ مکی زندگی میں قوت فکر و نظر کی ترویج و تبلیغ پر زور ہے۔ اسی سے ایک وسیع تر متناسب تناظر حیز وجود میں آتا ہے۔

ایک سوال ذہن میں ابھر کر آتا ہے کہ کیا اسلامی فکر وفلسفہ کی تائیدی لٹریچر کی قوت، مخالف فکر وفلسفہ سے کمزور ہے؟ بڑی حد تک نہیں۔ علماء و مفکرین نے الگ الگ سطحوں پر کام کیا ہے اور کچھ مضبوط لٹریچر موجود ہیں۔ کمزوری در اصل ان کی ترویج و تبنی میں ہے۔ مغربی فلسفہ بنیادی طور پر سودی نظام معیشت کے لیے متناسب تناظر پیدا کرنے پر مبنی ہے، جس کی تفصیل کسی اور تحریر میں انشاء اللہ قلم بند کی جائے گی۔ اس بنیاد پر اس کے ترویج پر

بڑی معاشی قوتیں بر سر پیکار ہیں، ان کی کوششیں، رضاکارانہ اور مخلصانہ کوششوں کے بنسبت کافی زیادہ ہیں۔ یہی سودی معاشی قوتیں، مغربی فکر و فلسفہ کو نظام حکومت اور نظام منہج و تعلیم میں دراندازی کے اصل محرک اور ذمہ دار ہیں۔ اور یہ سب مل کر من جملہ اسلام متنافر تناظر کی ارتقاء میں حصہ دار ہیں۔

ارباب فکر و قلم کے لیے ایک پیچیدہ سوال یہ ہے کہ ہماری محدود قوت (جب تک مسلم حکمرانوں کو ہمنوانہ بنالیا جائے) اور رسائی سے کس حد تک قابل عمل اقدام ممکن ہے؟ کیا ارباب فکر و قلم نظام معیشت، نظام حکومت اور نظام فکر و فلسفہ ہر چہار جانب سعی و جہود کی ذمہ دار ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں۔ لیکن انہیں ارباب فکر و قلم کے ہاتھ میں اصل مہمیز ہے، امت میں فکری بنا کا قیام انہیں کے کندھوں پر ہے خواہ بروقت ترویجی کوششیں کی جائیں یا نہیں۔ ناقبل شکست فکری لٹیریچر کی پیداواری اصل الاصول ہے۔ پھر ان تحریروں کا ایسے قوی ہاتھوں میں جانا ضروری ہے جو اس کی ترویج و تبنی کو فعال کریں، اور یہ دوسرا عظیم مرحلہ ہے۔ خاص طور پر نظام معیشت اور نظام حکومت کے نظریاتی مبادی کی تحریریں، کیوں کہ انہیں پر نظام قوت و معیشت کا دار و مدار ہے۔ اس میں خلا نوعمروں میں الحاد و ارتداد کی لہریں پیدا کر سکتی ہیں۔ اس کی وضاحت میں نے اگلے سطروں میں کی ہے۔

لٹریچر کی کمزوری:

اپنے محدود مطالعے میں جن ارباب قلم کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان میں تین میلان نظر آتے ہیں۔

پہلا ایمانی: اس قسم کی تحریر میں مبنی استدلال قال اللہ عزوجل و قال الرسول ﷺ ہوتی ہے۔ اس میں استدلال کی بنا ظواہر نصوص اسلامیہ یا اسلامی مبادی کے ظواہر ہوتے ہیں۔ (نظری اور تدقیقی گفتگو کے اثرات بالکل الگ ہوتے، جس کی وضاحت ہم اخیر میں کریں گے) اس قسم کی تحریر اس بنیادی مفروضے پر قائم ہیں کہ قاری وسامع ایمانیات سے مزین ہوگا، یا ان سے مزین ہونا شرط اول ہے۔ اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: اسلامی فکر و نظر کا غلبہ، یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلامی قوت اپنے اوج پر تھی، دنیائے فکر و قوت پر اس کا غلبہ تھا۔ ایسی صورت میں اسلام و کفر دونوں پر اسلامی فکر و فلسفہ کا غلبہ تھا اور کسی اسلامی موقف کو ثابت کرنے کے لیے متناسق بات کہنا کافی تھا۔ کیوں کہ آفاقی تناظر کی دنیا جو کہ کسی بھی بات کی قبولیت کے لیے

ایک لازمی شرط ہے، اس پر پہلے سے ہی اسلامی نظام فکر و نظر کو غلبہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نظام اسلام کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔

دوسری صورت: فرد مطلوب کا ایمان اس قدر راسخ ہو کہ ایمان ہی اس کا آفاقی تناظر بن جائے اور کسی بات کی قبولیت کے لیے آیات و احادیث کا ایک حوالہ کافی ہو۔ موجودہ مسلم آبادی کی اکثریت اس رسوخ سے عاری ہے۔ اسلام متنافر تناظر میں اس رسوخ کا پیدا کرنا مشکل ترین امر ہے، الا ماشاء اللہ۔ اس دوسری صورت کے بھی امکانات کمزور ہیں۔ آج کی ہماری آبادی ایمان اور غربی عقلانیت کے درمیان ہے، اگر عہد طفلی میں عقلانیت کا سامنا نہ بھی ہو تو عہد نو عمری اور مابعد میں غربی عقلانیت کا سامنا ہو گا۔ صرف ایمانی اپیلیں کافی نہیں ہوں گی۔ کیوں کہ افق تناظر پر مغربی فکر و فلسفہ کا غلبہ ہے۔ یوں ہی ایمان راسخ کے حصول کا عہد طفلی یا نو عمری میں امکان بہت کم ہے، اور عموماً چالیس سالہ عمر کے بعد اس کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اوائل عمر میں، ایمان کی طرف مائل کرنے والی تحریریں اور تربیت کے ماحول کے ساتھ ساتھ غربی عقلانیت کے بیخ کن مواد تحریر و تقریر اور ان کے متناسق ماحول سازی لازمی امور ہیں۔ اسلام متناسق وسیع تر تناظر، عقلانی عقدہ کشائی، عمری تناسق اور تربیت کے عدم موجودگی میں ایمانیات پر مبنی اپیل غیر موثر ہوتی ہے۔

دوسرا، مظاہری: جب ہم تمثیل کے ذریعے گفتگو کریں تو اسے ظواہر پر حکم لگانا کہتے ہیں، بعض اوقات اس پر استنباطی طریقہ اور بداہت کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔ قائل و مصنف اپنی گفتگو کی بنیاد ایسے ظواہر اور مبادی پر رکھتا ہے جس کا ادراک عامۃ الناس، بلکہ عمر بلوغت کے قریب بچوں کو بھی ہوتا ہے۔ بداہتیں تغیر پذیر ہوتی ہیں اور بداہت کی توجیہی نظریوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ بداہتیں صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی۔ مختلف طبقوں کی بداہتیں بھی مختلف ہو سکتی ہے اور بسا اوقات متعارض ہوتی ہیں۔ بداہت پر نظریاتی گیرائی کے بغیر قیل و قال کی بنیاد رکھنا غیر معتبر ہوتا ہے۔ ایسی بداہتیں تناظر کی پہلی اور ظاہری سطح کی مثالیں ہیں۔ جبکہ گہرے تناظر علت و معلول، وجہ و توجیہ کے لمبے سلسلے پر مبنی ہوتے ہیں۔ بداہت پر مبنی تحریر و تقریر عامۃ الناس کے منال میں ہونے کی بنیاد پر، خود ان کے نزدیک قابل اعتنا نہیں سمجھے جاتے، اور وہ ایسی تحریر و تقریر کے تشنہ ہوتے ہیں جو ان کے ذہن و قلب میں اٹھنے والے تناظری سوالات کا تشفی بخش، گہرا استبدال یا مخاصم پیش کر سکیں۔ بداہت پر مبنی تحریریں ان افراد کو

بالکل متاثر نہیں کرتیں جو بداہت کو بھی نظریاتی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، آج عام تحریر و تقریر کا معیار ایسی ہی بداہت ہے۔

تیسرا غربی عقلانی: یہ طریقہ عموماً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں رائج ہے۔ اس قسم کی تحریروں کا اصل مفروضہ یہ ہے کہ اسلامی اصول و فروع کی حقانیت ان کے مغربی تحقیق، فکر، فلسفہ اور سائنس سے ہم آہنگ ہونے پر ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ، اس طرح سے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے باوجود اسلام مغلوب معلوم ہوتا ہے اور مغربی تائید کا محتاج ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس اثبات کے اصل مراجع کفار و مشرکین ہوتے ہیں۔ اور یقیناً عقل کے نزدیک مرجع کا مقام راجع سے بلند ہوتا ہے۔ یعنی اسلام مغربیت پر ایمان لاتا ہے، جب کہ ہدف اصلی یہ ہونا چاہیے کہ مغربیت اسلام پر ایمان لائے۔ یہ طبقہ **یومنون ببعض الکتاب و یکفرون ببعض** کے مصداق بن جاتا ہے، کیوں کہ یہ انہیں چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تائید غربی عقلانیت سے ہوئی۔ پچھلے سو دو سو صدی میں تجدیدی مزاج کے بانیان بھی اسی کا شکار ہوئے، مثلاً جمہوریت کو اسلامی بتانا، مغربی مساوات کا اسلام میں پایا جانا وغیرہ۔

ضرورت: ہر اہم تحریر، مظاہر سے پرے نظریاتی اور فلسفیاتی آفاق پر مبنی ہو، یا اسلامی طور پر متحقق سائنسی تصدیقات پر مبنی ہو۔ اور لازمی طور پر مغربی نظریاتی اور فلسفیاتی افق سے بھی بالاتر ہو۔ ایسی تحریریں مغربی نظر و فلسفہ کی بنا کی قلع قمع بھی کریں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے، کہ مغربی نظر و فلسفہ کی سیدھی تردید مفید نہیں۔ یہ برگ برگد کی طرح پھیل چکے ہیں۔ پتے جھڑ بھی جائیں تو تنا و بیخ باقی رہ جاتے ہیں۔ ہاں ان نظر و فلسفہ کی جن اصول و مبادی پر بنا ہے اس کی تردید ضروری ہے یا ان کے ہمسر اور برتر فلسفیانہ مبادیات کی ایجاد لازم ہے جس کے لیے وسیع قوت مطالعہ درکار ہے۔ عام طور پر نہایت ہی معیاری تحریروں کے زمرے میں شامل اعلیٰ تحریریں ان سے عاری ہوتی ہیں۔ عموماً وہ فلسفہ مغرب کی تردید کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسی تحریروں سے ایک قاری ایک فکر کا حل تو پاجاتا ہے پر اس پر مبنی دوسرے فکر میں دوبارہ الجھ جاتا ہے۔ عقل کی منطقیت اور نئے معلومات کو ذہن نشیں کرنے کی روش بھی یہ بتلاتی ہے کی عقل کسی ایسے مفہوم کو عقل میں اس کے مناسب مقام پر رکھنے سے اباء کرتی ہے جس کی بنیاد موجود نہ ہو، یا جس کی بنیاد ڈھادی گئی ہو۔ جب تک مغربی فلسفہ کی بنیاد نہ ڈھائی جائے، ان پر

مبنی موقف کو کمزور نہیں کیا جاسکتا، گو ان کے ظواہر پر حملہ کر کے کچھ بدنما داغ لگائے جاسکتے ہیں، جسے تنقید کہتے ہیں، پر بنا کی قوت اس کو وہ مضبوطی بخشتی ہے کہ اس طرح کی ظاہری گفتگو کو عقل زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس لیے لازم ہیں فلسفہ کے مبادیات پر کافی کام ہو اور مغربی فلسفہ ہمارے فکری دائرہ اختیار میں آجائے جس کی حد بندی نئے برتر فلسفیانہ مبادی کریں۔ مغربی فلسفے نے اسلامی اصول ومبادی اور متناسق فلسفے کو چند الفاظ میں محدود کر کے اسے مغلوب بنادیا۔ اس کے اصل مبادی کی بیخ کنی کی اور اس کے بالمقابل جدید طرز کے فلسفیانہ مبادیات قائم کیے اور بڑی تعداد میں اس پر تحقیق وتدقیق کا کام کیا اور اس کی منہجی ترویج کی گئی۔

قوت ترویج کی کمزوری:

پچھلے پانچ سو سالوں میں اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ غربی فکر وفلسفہ کے غلبے کا راز اور اس سے ظہور پذیر ہونے والے نظام کے قیام میں ترویج واشاعت کا سب سے اہم کردار ہے۔ جدید تمدن بتمامہ سودی نظام معیشت کی مرہون منت ہے اور قوت معیشت کو استعمال کرتے ہوئے مدبرانہ طور پر جدید فکر وفلسفہ کی تحریر وترویج ہو ئی، یہی وجہ ہے کہ اس تمدن کو قائم کرنے کا سہرا عام طور پر تاجر طبقے کو جاتا ہے جبکہ اس سے ماقبل علم وفلسفہ میں انقلاب کا سہرا اشرافیہ کو جاتا رہاہے۔ حالیہ غزہ قتل عام کے خلاف امریکی مظاہروں میں یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ ہاورڈ سے لیکر ایم آئی ٹی اور کارنیگی وغیرہ تمام ممتاز مغربی جامعات یہودی عطیوں کی مرہون منت ہیں۔ اسی طرح وہاں کی مصنفین اور عقلاء بھی ایک خاص مقصد کے تحت زور قلم کا استعمال کرتے ہیں۔ بعدہ پوری دنیا میں ان کی اور ان کے تصنیفات کی مختلف تنظیمی، سرکاری اور غیر سرکاری وسائل کا استعمال کرتے ہوئے ترویج و اشاعت کی جاتی ہے۔ فکری زاویوں کی عملی تصویریں پیش کر کے سراہا جاتا ہے یا شدید تقبیح کی جاتے ہے تا کہ وہ عامۃ الناس کے بداہت کا حصہ بن جائیں۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ ہے کہ عقلوں پر ان کی حکمرانی ہے، تاہم نفاق کا یہ چہرہ حالیہ دنوں میں بہت تیزی کے ساتھ بے نقاب ہوا ہے۔

نظام فکر اور تناظری آفاق پر غلبے کی طرف بڑھنے کی حکمت عملی:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾(1)

اس نص کا عام مفہوم یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے لوگوں کی فطرت دین متین پر کی ہے، اور حدیث "**کل مولود یولد الخ**" میں بھی اس مفہوم کی تائید ملتی ہے۔ جس کا ما حصل یہ ہے کہ دین قیم سے روگردانی، فطرت سے روگردانی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ اس کے دوررس نتائج ہوں گے۔ اور یہی وہ خلا ہے جس کا استعمال کرتے ہوئے اسلام فکری غلبے کی طرف بڑھ سکتا ہے اور مغربی فلسفے کے مبادی کے بالمقابل نئے مبادی کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ مثلا "معمر عمر میں والدین کا احترام و خدمت"۔ عام تحریروں کا پورا زور اسلام کے اس جذباتی پہلو پر صرف ہو جاتا ہے کہ مجبور و لاچار والدین جنھوں نے پوری زندگی بچوں پر صرف کر دی اور اپنے عیش و عشرت کو بھول کر بچوں کے لیے خون اور پسینہ ایک کر دیا، ایسے والدین کے لیے جو مقام و انتظام اسلام میں ہے وہ ہر جگہ ناپید ہے۔ حالانکہ یہ وہ پہلو ہے جس کا استعمال کرتے ہوئے وجود انسانی کے فلسفوں کے نشیب و فراز میں غوطہ زنی کرتے ہوئے نت نئے نظریات اور فلسفے قائم کیے جاسکتے ہیں اور مغربی فلسفی مبادیات کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔ ایک چھوٹے سے پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے: اس سے جنسی حقوق کے مختلف پہلوؤں پر سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں مثلا 'میرا جسم میری مرضی' یعنی اپنے جسم پر اپنا اختیار۔ اس کو بنا بناتے ہوئے اختیار سے متعلق سے بہت سارے سوالات قائم کیے جاسکتے ہیں؛ جیسے اصول اختیار کی تعمیل اس صورت میں کیسے کی جائے گی جب عورت کا ضعیفی کی حالت میں اپنے آپ پر اختیار ختم ہو جاتا ہے؟ اس حال کا کیا جب بچپنے میں ایک لڑکی کا اختیار متصور نہیں۔ اس پر بحث کرتے ہوئے نیا فلسفہ اختیار قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے نظریہ اختیار کی، ذاتی اور غیر ذاتی اختیار اور پھر اس کے پیچھے نظریہ حقوق کی اور پھر اس کے پیچھے وجود انسانی پر تکلیف کی اور پھر مقصد تخلیق وغیرہ ہر پہلو پر ایسے متبادل نظریات اور فلسفے قائم کیے جاسکتے ہیں جس سے مغربی عقلانیت کو زیر دست کیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ماتحت نظریۂ ازدواج، اس کے نظریاتی پہلو، جنسی شذوذ، آزادانہ جنس پرستی، اور پھر پردہ وغیرہ بہت سارے پہلوؤں پر مغربی فلسفہ کی بنیادوں سے ہٹ کر تفصیلی گفتگو کی جاسکتی ہے جس کی بنا خالص اسلامی اصولوں پر ہو گی لیکن عقلانیت کی میدان کی شہسواری بھی ہمیں حاصل ہو گی۔ ان سارے جوانب کا مرکز فلسفہ حقوق و اختیار ہے جس پر بہت مضبوط گفتگو کی جاسکتی اور غربی فکر و فلسفہ سے بالکل مغایر، اور اسلام سے ہم آہنگ نظریات اور فلسفے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ قرآن عظیم کی ہر آیت پر ایک عظیم فلسفے کی بنیاد رکھی جا

سکتی ہے جس کی عقلانیت کفر و شرک کی عقلانیت پر بھی غالب ہو گی۔ ہاں ایسے مصنفین پر فلسفوں کا علمی احاطہ لازمی ہو گا۔ اور ایمانی قوت کے ساتھ میدان فلسفہ کو سر کرنا ہو گا۔ ان سب کا ایک ہدف ہو گا: نظام فکر و فلسفہ کا غلبہ، جس کے سائے میں آگے مناسب تناظری ماحول میں نظام قوت کی تشکیل ہو گی۔ اور ان خلاوں کو پر کیا جا سکے گا جس پر ایک ایسی نسل پروان چڑھے گی جو سیرت نبوی ﷺ کی تجسیم ہو گی۔

بداہتوں کی نئی نظریاتی تشکیل:

مغربی مصنفین نے اسلامی مراجع پر معتدبہ تدقیقی کام کیا، اور حاصل گفتگو میں انہیں چند تعبیروں میں سمیٹ دیا۔ ان کا کوئی ایجابی مقصد نہ تھا، بلکہ اسلام کے علوم و فلسفے کو محدود متصور کرانا تھا۔ اور اگلا مقصد ہمسر یا اسلامی مبادی کے بالمقابل دوسرے مبادی قائم کرنا تھا۔ انہوں نے گہرے نظریاتی امور کو بداہت کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ اور بداہتوں کی نظریاتی تشکیل نو کی۔ بہت سارے نظریاتی مباحث کی نسبت اپنے طرف کی اور یہ باور کرایا کہ، اسلامی بداہیتں، نظریاتی گہرائیوں سے عاری ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مغربی مصنیفین کی تحریروں کی کثرت و ترویج کی وجہ سے، ان کی تصنیفات آسانی سے قابل حصول ہو گئے۔ نظریاتی مباحث کو اصطلاح سازی کے ذریعہ محدود بنانے کی کوشش نے غیر شعوری طور پر اپنے اور غیروں دونوں کے نزدیک دقیق نظریاتی گفتگو کو سطحی متصور کرا دیا۔ اس لیے اب ضروری ہے کہ اس بداہت کو از سر نو ان کے صحیح نظری مقام تک پہنچایا جائے اور اصطلاحی محدودیت سے آزاد کرایا جائے۔ مغربی فکر و فلسفہ کا تدقیقی احاطہ کیا جائے۔ اس کے بغیر غلبہ ممکن نہیں۔ اسے زمین پر اتارنے کے لیے ضروری ہے نظام نو کی منطقی کمزوریوں اور عملی ناکامیوں کے تناظر میں، اپنے ماضی سے ماخوذ نئے فکر و فلسفے قائم کیے جائیں۔ متناسق آفاقی تناظر کے قیام میں ان کا کردار غیر معمولی ثابت ہو گا۔ مذکورہ بالا لازمی تناظری گفتگو کے بعد ہم اپنے محدود موضوع کا رخ کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل گفتگو میں گاہے بگاہے مذکورہ بالا تناظر کی طرف اشارہ ہو گا۔ اور اس لیے بھی مذکورہ بالا گفتگو ضروری تھی۔

سیرت نویسی کے اہداف:

سیرت نویسی کا اولین ہدف امت محمدیہ ﷺ کا اخلاق محمدی میں تجسیم ہے۔ اس کا ثانوی ہدف افراد امت کا اخلاق و کردار کے ذریعے رسالت محمدیہ ﷺ کی ترسیل ہے۔ اس کا تیسرا ہدف ایک صالح معاشرے کا قیام ہے جو امت مسلمہ اور آدمیت کے لیے نفع بخش ہو۔ اس کا چوتھا ہدف امت مسلمہ بمثل ہزار جسم یک جاں کی تشکیل ہے۔ ان اہداف میں اصل و فروع کی نسبت ہے۔ جس کا اصل مصیر، رضائے رب جلیل و حبیب رب جلیل ہے ﷺ ۔

سیرت نویسی کے تفصیلی اہداف:

مذکورہ بالا اہداف اس امر کے متقاضی ہیں کہ ایسے اقدامات بر سر کار لائے جائیں، جو موثر طور پر ان اہداف کو کامیابی سے ہمکنار کریں۔ ان اقدامات سے مزید ذیلی اہداف کا التزام پیدا ہوتا ہے۔ ہر بڑے ہدف کی تہوں میں مزید اہداف کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ اگر اس کی تفصیل پر گفتگو کی جائے تو ایک لائبریری بھی تنگ پڑ جائے۔ یوں ہی، ان اہداف کو قابل عمل بنانے کے لیے لازم ہے کہ زاویہ گفتگو کو محدود کیا جائے، تاکہ اس زاویے کے گونا گوں پہلوؤں، نزاکتوں، تقاضے، خاکہ سازی، عمل آوری کا بغور جائزہ لیا جا سکے۔ اور اسی حد تک مذکورہ بالا تفصیلی تمہید کی افادیت ہے۔

عام سے خاص کی طرف:

مذکورہ بالا جہاں مطلقاً مفید ہے اسی قدر ہمارے نفس موضوع کے لیے بھی درکار ہے۔ لیکن خاص موضوع کی اپنی باریکیاں ہوتی ہیں اور ان باریکیوں کے لیے مزید دقت فکر و قلم درکار ہوتی ہے۔

سیرت نویسی کے مختلف منہج:

نظریاتی خاکہ سازی کے لیے مطلوبہ گروہوں کو ہم اولاً دو حصوں میں تقسیم کریں گے، ماقبل بلوغت اور مابعد بلوغت۔ ماقبل بلوغت کے تین مراحل ہیں۔ عہد طفلی اور عہد ابتدائی اور عہد ثانوی اول۔ مابعد بلوغت کے دو مراحل ہیں عہد ثانوی ثانی اور گریجویشن۔ ہمارے اس انتخاب کا پس منظر اسکول اور کالجوں میں جانے والے طلبہ اور طالبات ہیں اور ایک مفروضہ یہ ہے کہ ان دو بنیادی ادوار میں شخصیت سازی کے عناصر کی بنیاد سازی ہو جاتی ہے۔ اس کے اثرات تاحیات ہوتے ہیں اور نو وارد نسلیں انہیں ادوار کی کامیابی یا ناکامی کی عکاس ہوتی ہیں۔

ما قبل بلوغت کے تینوں ادوار میں سیرت نویسی کی نوعیت:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾(2)

﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾(3)

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾(4)

﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ﴾ (5)

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (6)

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾(7)

﴿قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾(8)

﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾(9)

مذکورہ بالا آیتیں، مندرجہ ذیل تحریر کی استلہامی آیتیں ہیں۔ سمع، بصر اور فؤاد، نشاۃ ونفخ کے بعد اولیں انطباع محل ہیں جن سے علم، تعقل، اخلاق، تکلیف، ہدایت، غفلت وگمرہی کے آفاق متعلق ہیں۔

چھ سال کی عمر تک بچے کے سمع وبصر وفواد پر وارد مسموعات، ومرئیات اور محسوسات کی چھاپ بنتی ہے۔ مادری زبان دانی کے ساتھ ان حقائق کا اسماء سے التصاق ہوتا ہے۔ سات سال کی عمر سے اسماء کی باہمی احتکاک سے

ابتدائی مظاہر فہمی شروع ہوتی ہے۔ دوران تعلم اسماء سے اسماء کا تعلم شروع ہوتا ہے اور مظاہر کی دوسری، تیسری اور مزید کی تمثیلی چھاپ بنتی جاتی ہے۔

بلوغت کے مرحلے میں تناسلی تغیرات کا زبردست دباو پیدا ہوتا ہے اور دماغ کے مختلف حصوں میں تحریک نو اور ترتیب نو کی زبردست مداخلت ہوتی ہے جس سے پورا تعقل متاثر ہوتا ہے اور مسموعات، مرئیات اور محسوسات، اس پر مبنی اسماء و تمثیلات کے احتکاک میں غیر معمولی تیزی آتی ہے کیوں کہ ان وسائل کے لیے موجودہ جسمانی حصہ پر تناسلی دباو پیدا ہوتا ہے اور جسمانی عقل غیر مساۃ، غیر مودل، اور غیر ضروری مرئیات، مسموعات اور احساسات کو حاشیے میں رکھنے یا بالکل اخراج کی کوشش کرتا ہے۔ مقتضائے وجودی کے مطابق وجود و تعقل کے لیے لازمی بصیرتوں کو کافی جگہ ملتی ہے۔ تناسلی دباو اور لازمی بصیرتوں کے حصول کی کثرت ہوتی ہے۔ بلوغت کے بنیادی سالوں میں ذاتی وجود کے تحفظ کی بصیرتی جنگیں ہوتی ہے۔ اس عمر کی بصیرتیں ہر اس چیز سے تہی دامنی کی طرف راغب کرتی ہیں جو ذاتی وجود کے لیے خطرہ ہو۔ پچیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے، ذاتی وجود کے خطرے سے تعقل باہر آتا ہے، اور اپنے وسیع تر وجود کے تحفظ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بصیرت و وجود کے تصور میں اعتدال پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس عمر سے چالیس سال کی عمر تک اس میں اضافہ پیدا ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دور انحطاط شروع ہو۔ اب تناسلی دباو کم ہوتا ہے، بصیرتیں خطرات سے کم متاثر ہوتی ہیں، حاصل شدہ بصارتیں، بے خوف و خطر احتکاک کرتی ہیں اور حکمت اور گیرائی کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ارذل عمر کے دور کی شروعات ہوتی ہے، اب مرئیات و مسموعات اور احساسات کی احتکاکی قوتیں کمزور پڑنی شروع ہوتی ہیں، اور بسا اوقات تعقل کے الگ الگ خانے منجمد سے ہو جاتے ہے اور حصول علم کے تینوں مدار یعنی سمع وبصر و فواد درجہ انجماد کو پہنچ جاتے ہیں اور علم سے لاعلمی کا دور شروع ہوتا ہے جس میں بے حسی، پاگل پن، بے ہنگامی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

عہد طفولت کے مرئیات، مسموعات اور محسوسات بنیادی تناظر کی بنا رکھتے ہیں۔ جس طرح کے تناظر کی کثرت اس عمر میں ہوگی، عقل فرد پر وہ چیز اس قدر بدیہی ہوگی اور اسے اس کے بر خلاف باور کرانا مشکل ہوگا۔ گھر، محلے، اسکول، قریبی معاشرہ جس میں بچے کی نشو و نما ہوتی ہے اور دوسرے ماحولی مقامات جس طرح کے

معمولات کی عادی ہوں گی اسی قسم کی مرئیات، مسموعات اور محسوسات بچے کا عقل طفل پر انطباع ہو گا اور اس کی عقل میں وہی چیزیں عام قابل عمل چیز مانی جائیں گی، مثلاً اگر اسکول میں آئے دن ڈانس کلاسیز ہوتے ہیں، تصویر سازی کی تمرین کرائی جاتی ہے، موسیقی سکھائی جاتی ہے، بے پردہ اجسام ہیں، یا مغربی لباس کا غلبہ ہے، بالغ ہونے کے بعد ایسے فرد کو یہ باور کرانا کہ یہ چیزیں شریعت میں ممنوع ہیں، اس کی عقل کے نزدیک ایک بھدا مذاق متصور ہو گا۔ ایسی ہی حالت اقدار کی بھی ہے۔ اسی طرح اگر بچے کی عقل پر وارد اشیاء دوسرے وسائل مثلاً دوسرے معاشروں کے ساتھ میل جول کی کثرت، یا ڈیجیٹل مواد کا کثرت سے دیکھنا، کثرت مرئیات، مسموعات اور محسوسات کا باعث بنتا ہے۔ کس طرح کے وارد مواد کی کثرت ہوتی اسی پر اس بات کا انحصار ہو گا کہ کس طرح کی عقلیت بعد بلوغت پروان چڑھے گی۔ فی الحال اطراف وماحول کو ساز گار بنانا آسان نہیں ہے، نا ہی عوام الناس کو اس کی آگاہی، جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ، وسیع تر تناظر اسلام متنافر ہے۔ ایسی صورت میں پہلے بڑے افراد کو اس کی نزاکت سمجھانا ضروری ہے، اور پھر ممکنہ احتیاطی تدابیر کرانا لازم ہے۔ اس عمر میں اسلام و سیرت کی معمولات کو اکثر الورود بنانا لازم ہے۔ اس کی کیا صورتیں ہوں گی جب کہ معمر نسل خود ان سے عاری ہے، اس پر گفتگو تفصیل طلب ہے۔ اس عمر تک سیرت کی عملی صورت ہی کار گر ہو گی۔ اسی لیے ظواہر کی سطح پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ بچے اپنے بڑوں کی نقل کرتے ہیں۔

عہد ثانوی: سیرت نویسی کا اصل دور سات سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اس عمر کی سیرت نویسی میں اس بات کا التزام ضروری ہے، اگر متناسق تناظر میں نشوونما ہوئی ہے، کہ جن مرئیات، مسموعات اور محسوسات کا ورود عقل طفل پر ہوا ہے انہیں کا ذکر ہو تا کہ ان کا التصاق اسماء سے ہو اور پھر اس بنا پر مزید ساخت کا کام ہو۔ ان امور واردہ کا ورود تا حیات ہو گا، لیکن عہد طفلی کے امور واردہ ایک طرف بنیادی تناظر کا کردار ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف بداہت کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہیں جس سے قبولیت آسان ہو جاتی ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر اسلام متنافر ماحول میں ایک بچے کی نشوونما ہوئی ہے تو سات سال کی عمر کے بعد ایک متناقض ماحول میں اس کی تربیت کی جائے اور سیرت نویسی میں سیرت کے ان پہلوؤں پر زور صرف ہو جو متنافر امور واردہ کو کمزور کریں۔ اس سے متناسب امور کو بہت تقویت تو نہیں ملے گی لیکن تضعیف کا فائدہ عمر استدلال

میں ظاہر ہو گا۔ بنیادی متنافر تناظر کی شدت کمزور ہو گی۔ اگر سیرت خوانی سے ایک بچہ سات سال کی عمر کے بعد بھی محروم رہے تو بلوغت اور بعد بلوغت کے استدلالی مراحل میں، متنافر بنیادی تناظر پر استدلالی طریقہ بھی اباء کرے گا۔

اسماء اور امور واردہ (مرئیات، مسموعات، محسوسات بر فواد) کے احتکاک سے مظاہر فہمی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اسماء کی کثرت کے ساتھ امور واردہ باہم تیزی سے احتکاک کرتے ہیں۔ اسماء، نسبتی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور جہاں کہیں مناسب حد تک تماثل پایا جاتا ہے، اسماء اس حد تک ان سے التصاق کرتے ہیں۔ مثلاً دائرہ، اس کی بناء مدور اشیاء کے مرئیاتی شکل میں حاصل ہوتی ہے، پھر اس کو دائرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اب یہ اسم تمام مدور مرئیات سے احتکاک کرتا ہے اور اشیاء کثیرہ جیسے، سیب، سنترہ، گیند، برتن، کنچے وغیرہ وغیرہ کے درمیان اس مظہر کا عقل استنباط کرتی ہے۔ یہی اور دوسرے امور واردہ اور ان کے اسماء کا ہے۔ اس قسم کے مظاہر فہمی کو استنباطی استدلال بھی کہا جا سکتا ہے۔ تعبیر و بیان میں تمثیل و استعارہ کا استعمال، ظواہر کا ادراک، ابتدائی مظاہر فہمی اسی درپردہ عامل کا نتیجہ ہیں۔

اس عہد سے متعلق سیرت نویسی کے لیے ضروری ہے کہ سیرت کریمہ کے ان پہلوؤں کو شامل کریں جو ایک طرف اس کے ذاتی تحفظ سے متعلق تجربات کو دینی غلاف فراہم کریں، مثلاً والدین، صفائی ستھرائی، صدق، امانت، دیانت سے متعلقہ ماثورات کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ ساتھ ہی تقریباً آٹھویں اور نویں کلاس میں مظاہر پر مبنی ماثورات کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ دس سال کے قریب عمر میں مظاہر فہمی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اس انداز میں سیرتی مواد کی تقدیم و ترتیب دی جائے کہ سات سے دس سالہ بچے کے استنباطی استدلال میں اسلامی اقدار کا آسانی سے استنباط ہو سکے۔ اس میں یہ بھی لازم ہے کہ والدین، اسکول، معلمین اور علاقائی مصلحین کے لیے بھی ہدایتی مواد فراہم کیے جائیں۔ جن میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہو کہ کس طرح کے امور واردہ سیرت کے خاص تعالیم کی فہم میں مدد کریں گے۔ جس قدر زیادہ تناسق پیدا ہو گا، اسی قدر بطور علم قلب پر اس کا ورود ہو گا۔ قلب ہی منتہائے سلسلہ اسباب تعلم ہے اور اسی پر من اللہ ورود علم ہوتا ہے۔ اس کیفیت سے طالب کے اندر علمی استدلال کا دور شروع ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اسکولوں میں درجہ نہم میں تناسلی نظام کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ بعدہ اسی کو بنیاد بنا کر ارتقاء انسانی کا نظریہ قائم کیا جاتا ہے۔ سببیت کو منتہائے سبب مان لینے کا رجحان پیدا کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جینیات کو اعضاء، رویے اور اقدار کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ سببیت کی حد تک مسئلہ درست ہے۔ لیکن جب یہی سببیت، مسبب الاسباب کے غیر ضروری ہونے اور اس کے انکار کے طرف استنباطی رویے کو تحریک دیتا ہے تو آہستہ آہستہ ہم الحاد کی آہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں طلبہ کی تعلیمی نصاب میں خلقت عام اور خلقت انسان کی آیات واحادیث کا ذکر اور مظاہر بیانی تک ان کی وضاحت ضروری ہے، تاکہ اگلے استنباط کا مرحلہ وہ خود طے کریں اور اپنی عقل کے ہر ممکنہ گوشے تک اسے پہنچائیں۔ قرآن عظیم نے اس کو نہایت پیارے انداز میں اپنایا ہے۔ اللہ تعالی نے درمیانی اسباب کا ذکر فرماتے ہوئے اس بات کو مسلسل واضح فرمایا ہے کہ ان اسباب کا خالق ومالک میں ہوں۔ مثلاً ﴿أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ (58) أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ (59) نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ (60) عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (61) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ (62) أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ (63) أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (64) لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ (65) إِنَّا لَمُغْرَمُونَ (66) بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (67) أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ (68) أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ (69) لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ (70) أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ (71) أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ (72) نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (73) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (74) ۞ فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ (75) وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ﴾(10)

بہت سارے مسائل خود سات سال کی عمر کے بعد سے قرآن فہمی سے حل ہو جاتے۔ بلا مبالغہ تلاوت آیات، کائناتی اہمیت کے حامل ہیں، اور شاید سطح فہم سے زیادہ گہرے تلاوت کے اثرات ہیں۔ لیکن دوران تعلم، امور فہمی کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن فہمی کا سلسلہ اول عمر میں شروع ہو جائے، اور نصابی طور پر ان آیات اور احادیث کو مرتب کیا جائے جو استنباطی استدلال کو اسلامی طریقے کی طرف راجع کریں۔ یوں تو قرآن

فہمی کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا، تاہم مخصوص آیات کی اہمیت ہر دور میں الگ الگ ہو گی۔ اسی نزاکت کو دھیان میں رکھتے ہوئے قرآن فہمی کی طرف بھی پہل کی جائے۔

مغربی اور اسلامی تحریروں میں فرق یہ ہو گا کہ جہاں مغربی تحریریں سببیت ظاہری کو اصل سبب کی طرح بیان کرتی ہیں، وہیں اسلامی اور سیرت کی تحریریں ہمیشہ خالق الاسباب کی طرف مفضی ہوں گی۔ سببیت کی تدقیق اور گوناں گو تفصیل میں کوئی دقت نہیں جب کہ ربنا ما خلقت ہذا باطلا کی طرف مفضی ہوں۔ اسکولی نصاب کے ہمرکاب ایک اسلامی اور سیرتی نصاب کی سخت ضرورت ہے۔ بلکہ یہ زیادہ مناسب ہو گا، کہ ساتویں تا بارہویں کے پوری کتابوں کے مصنفین مسلم علماء ہوں، اگر پرائمری تا چھٹی کے نہ ہوں تو بھی؛ یہ بھی زیادہ مناسب ہوتا، کیوں کہ ذہن پر منطبع بنیادی تناظر کو ہم اسلام متناسق بنانے میں ایک حد تک کامیاب ہو جاتے۔

ان کتابوں کی اس انداز میں تصنیف ہو کہ چھ سالہ نصاب تین سالہ مواد میں ہو۔ ہم نے پایا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں بلکہ بہتر ہے۔ پر یہ لازم ہے کہ ان کی امتحانی کامیابی متاثر نہ ہو۔ حالانکہ آنے والا دور خود ہی ان نصابی کتابوں کو لایعنی بنادے گا۔ پھر بھی خلا کو پر کیا جائے گا، اور اسے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ باقی ماندہ وقت اسلامی اور سیرتی تعلیم اور فکری ارتقا میں صرف ہو۔ اس سے ہمارے طلبا کے اندر تفوق بھی پیدا ہو گا۔

عظمت مقام نبوت کی مرکزیت:

رائج اسکولی لٹریچر میں ذات نبوی ﷺ کو محض ایک بہتر انسان میں محدود کر دیا گیا ہے۔ معاذ اللہ۔ ظلم بالائے ظلم یہ کہ اگلے صفحات میں دوسرے سماجی مصلحین کا ذکر کر دیا گیا۔ اس طور پر ایک طالب علم جس امر کا استنباط کرے گا وہ اہل بصیرت پر مخفی نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے اس بات کا استنباط قریب ترین ہے کہ معاذ اللہ کچھ تاریخی لوگوں کی طرح ہی آپ ﷺ کی ذات اقدس ایک اچھی شخصیت تھی۔

تقلیل عظمت کا یہ رویہ ایک طالب علم کے استنباطی فکر میں، مقام الوہیت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سیرت نویسی میں تعظیم کی مرکزیت ہو۔ عظمت تعظیم اس انداز میں مرتب ہو کہ عقل انسانی آپ ﷺ قدموں میں سلام عظمت پیش کریں۔ الحاد کا رجحان عموماً اس طبقے میں زیادہ ہے جو خود ساختہ توحید کے قائل تو ہیں پر عظمت نبی ﷺ کے قائل نہیں اور اسے غلو سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے بنیادی تناظر کی قلت جس کا انسانی

ادراک میں تمثیل نہ بن سکے، استنباطی طریقہ کار کو کالعدم کر دیتی ہے۔ اللہ عزوجل کی قدرت و کبریائی کی تمثیل کا تصور ممکن نہیں ورنہ قدرت و کبریاءِ الٰہی کی محدودیت کا لزوم پیدا ہوگا۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا۔ ہاں اس کے مظہر کی عظمت پر آکر تمثیلی تصور کا بعض امکان ہے۔ جب عقلیں آکر مقام عظمت مصطفی ﷺ پر غش کھا کر گرنے لگیں، تو ذات باری وحدہ لا شریک کی قدرت و کبریائی کی طرف عقل کی جرآت بھی نہ ہو۔ نبی پاک ﷺ کی ان پہلوؤں کی واضح تصویر کشی جو مظہر صفات الوہیت ہوں ضروری ہے، قدرت، کبریائی، علم اور دیگر صفات۔ عقل ایسی قوت نادیدہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار ہوتی ہے جس کی بعض حسی مثالوں کا رعب عقل پر بیٹھ جائے۔ جب عقل ہار مان جائے تو اسے تسلیم کہتے ہیں۔ سیرت نبوی کے ان پہلوؤں پر نصابی عمل ضروری ہے۔ معہ ان احادیث کا ذکر ضروری ہے جس سے کفر، الحاد اور شرک کے غلبے کی مثالیں کمزور کر دی جائیں۔

الحاد کی لہر نے لوگوں کے اندر اعلی درجے کی خود پرستی پیدا کر دی ہے۔ الحاد میں یہ معقول بات بھی ہے۔ وجود ذات (اپنا ذاتی وجود) کا تحفظ اصل الاصول بن جاتا ہے۔ اس میں کسی بھی کمی کو قبول کرنے کے لیے کوئی واضح محرک نہیں پایا جاتا۔ اپنے وجود کا حصہ کسی اور کو کیوں دیا جائے جبکہ اس کا نہ تو کوئی عقلی حکم ہے اور نہ مستقبلی مآل۔ لیکن وجود ذات کی یہی تعلی، دوسرے وجود کو کالعدم بناتی ہے۔ خود پرستی میں انکساری اور احسان کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایسے دور میں کبیدہ خاطر وجود کو جب انکساری اور دست احسان کا سہارا ملتا ہے، تو اس کے وجود ذات کو دوبارہ زندگی عطا ہوتی ہے۔ اور اس حیات کے لیے وہ شخص یقیناً اس اصول کے سامنے سر تسلیم خم کرے گا جس نے اسے وجود نو بخشا۔ اس لیے ایسے اخلاق کریمانہ جو وجود ذات کو وجود کل کا حامل بنائیں، کو سیرت نویسی میں جگہ ملنی ضروری ہے۔ اس کے لیے بہتر عمر ہے گریجویشن کا دور۔ عہد طفلی میں وجود ذات غیر پر منحصر ہوتا ہے، اور والدین و اقرباء سے شدید لگاو، اور ان کی غیر موجودگی میں شدید اضطراب اسی کا عکاس ہے۔ بلوغت کے دور میں، وجود ذات پر خود مختاری کے حصول کی کوشش ہوتی ہے۔ بلوغت کے دوران شدید بدلاو کے دوران وجود ذات کو یکجا کرنے کی کوشش ہوتی ہے، اور خود مختار ذاتی معنویت کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ اس دور میں وجود اور

وجود کی معنویت کے سوالات اٹھنے شروع ہوتے ہیں۔ اس سوال سے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن اگلے مرحلے میں وجود ذات کو لے کر تحفظاتی خطرات کا احساس کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وجود کی معنویت کی حدود وسعت کا تقاضا کرتی ہے۔ وجود ذات کا تحفظ، اس مرحلے میں مجموعی وجود کے تحفظ کا تقاضا کرتی ہے۔

اس لیے بلوغت کے پہلے مرحلے میں گھریلو اور قریبی سماجی وجود کو تقویت دینے والے سیرت کے پہلوؤں کا ذکر ضروری ہے، مثلاً والدین، خویش و اقرباء، پڑوسی، قبائلی اور علاقائی رشتے۔ کیوں کہ اس دور میں وجود ذات کے معاون وجودوں کی اہمیت کی طرف فرد مائل ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں گہرے ذاتی قریبی رشتے استوار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ظواہر سے بواطن کی طرف تجسس کا زور بڑھنے لگتا ہے۔ کیوں کہ انطباعات، اسماء، احتکا کی متصورات بہت تیزی کے ساتھ مسلسل احتکاک کرتے ہیں۔ ایسی معلومات کی پیاس بڑھتی جاتی ہے جو اس بے ہنگم احتکاک کو منطقی معانی کا جامہ پہنائیں۔ منطقی معانی کی جستجو بے انتہا سوالوں کو جنم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے بلوغت کے بعد زبان سوال کثرت سے دراز کرتے ہیں۔ پر یہی وہ مرحلہ ہے جس میں اسلام متناسق مفاہیم کو عقلوں میں تیزی سے بٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہی موقع ایک ڈراؤنا موڑ لیتی ہے، جب تجسس کی پیاس ایسے ینابیع سے بجھتی ہے جو الحاد و کفر سے نکلتی ہیں۔ سیرت نویسی میں اس زمانے میں ان پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے، جو مزید ان آفاق کو مہمیز دیں۔ معجزات کو ایسے پیرائے میں تحریر کرنے کی ضرورت ہے، کہ وجود انسانی، اپنے ہی وجود کو لے کر مبہوت ہو جائے۔ قرآن و حدیث کے بہت سارے معانی عقل کشائی کے بہترین وسائل ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایسی احادیث کریمہ کو مقدم کیا جائے جس پر بحث و تدقیق کرتے ہوئے علم مصطفے ﷺ کی ایسی آفاقیت کی تصوری پیش ہو سکے کہ لوگ اسی مقام پر آکر مقام حیرت میں پہنچ جائیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ الحاد کی ایک بڑی وجہ مرجعیت غیر ہے۔ مرجعیت علوم کا رخ ذات اولیا، وانبیا کی طرف کرنے سے، اغیار کی مرجعیت تار تار ہو گی۔ فلسفہ و سائنس کے سیدھے زد میں ذات ربوبیت نہ ہو گی۔ ثانوی اور گریجویشن اور بعدہ تمام مراحل میں اس کی کافی افادیت ہو گی۔

گریجویشن کے مرحلے میں، تقریباً بیس کی عمر میں وجود ذات، وسعت وجود کا تقاضا کرتی ہیں۔ اپنے وجود کو اپنے وسیع وجود میں کردار ادا کرنے کی طرف فرد مائل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں، تدریجاً ان تمام سیرت کے پہلوؤں کا تعارف ضروری ہے جو نوجوان افراد کو نظام امت کا متحرک حصہ بننے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیس سے پچیس سال کے عمر کے افراد اپنے مجموعی سیاسی، معاشی اور سماجی حیثیت کو لے کر کافی بے چین ہوتے ہے، اور جو مجموعی نظام سب سے مضبوط اور وسیع تر وجودی معنویت فراہم کرتے ہیں، اس کی طر مائل ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ان سب کے پیچھے ذہنی ساخت میں تبدیلی کے اسباب ہیں، پر یہاں پر ان کا ذکر زیادہ تفصیل کا متقاضی ہے اور یہ عملی محل اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

اسی عمر میں، اجتماعی، سیاسی، معاشی، دفاعی اور وہ تمام نظریے فرد کے لیے اہم ہوتے جاتے ہیں جو اس کے وسیع تر وجود کے لیے ضروری ہے۔ اگر سیرت کی ہدایت سے بہرہ ور نہ ہوں، تو جدید نظریات میں اس کا حل تلاش کریں گے۔ اور جیسا کہ مذکورہ بالا سطروں میں میں نے واضح کیا ہے، فرد کی اسلامی مرجعیت، غیر اسلامی مرجعیت کی طرف منتقل ہونے لگے گی۔

نظام اسلام کے فقدان کے بعد، افراد کی سیرتی تربیت کا یہ پہلو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ فردی ارتقا کا بہت بڑا پڑاؤ ہے۔ اسی پر اس بات کا انحصار ہے کہ فرد کا وجود جزو امت کے طور پر ہوگا یا نہیں۔ اسی پر سارے اصلاحات کے اثراندازی کا دارومدار ہے۔ اسی پر اجتماعی کوششوں کی کامیابی اور ناکامی کا مدار ہے۔ اس کے فقدان سے، فرد اپنے فردیت میں محصور ہو جاتا ہے اور قوم کی مجموعی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہی نہیں، یہ کمزوری آنے والی نسلوں میں، مذہب اسلامیت کی عدم صلاحیت کی کھلی مثال بن جاتی ہے اور ہر اس نظام کی طرف لوگ مائل ہونے لگتے جو نظام غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اس زمانے میں وہ نظام الحاد ہے۔ ردع الحاد، اور میلان ارتداد کی تمام کوششیں نظریاتی طور پر سطحی مانی جائیں گی، اگر اس سطح پر اس کا حل پیش نہیں کیا گیا۔ اور کبھی بھی الحاد و ارتداد کی لہر کو نہیں روکا جاسکے گا۔

نسل نو کے مردوں کی طرح، نسل نو کی خواتین بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ نظام کے سائے تلے جب تک امت کے مرد حضرات مختلف ضروری تحفظ کو پورا کرتے رہے، خواتین نظام کے تلخ تجربوں سے محفوظ رہیں۔ نظام کے فقدان کے بعد تدریجاً حالات بدتر ہوئے، اور شرف، عزت اور معاشی خودداری متاثر ہوئی۔ ماضی میں خواتین کا شرف ان کے وجود کا سب سے بڑا حصہ رہا، اسی پر ان کی حیا و انا کا دارومدار رہا۔ غیر یقینی صورتحال کے تسلسل نے ان کا اعتماد مردوں میں کمزور کر دیا۔ جس طرح نسل نو نے معمر افراد پر لعن طعن کرتے ہوئے خلا کو پر کرنے کی کوششیں کی، گو کہ ان کے سامنے بھی وہی عوامل حائل راہ ہوئے جو ان کے اگلوں کے سامنے آئے تھے، اس طرح خواتین اسلام کے اندر اپنے اور اپنوں کے تحفظ کو اپنے اختیار میں لینے کا رجحان شروع ہوا۔ شرف اور خودداری پہلے سے ہی داؤ پر تھے، اب تحفظ کی تگ و دو نے انہیں اسلامی نسوانیت سے دور کر دیا۔ مسلم مردوں کے بالمقابل ان کے قیادت کی قبولیت اس تلخ حقیقت کی عکاس ہے۔ نسوانی ارتداد کے پس پردہ یہی گہرے اسباب ہیں، اور علامات کے علاج سے اس کی روک تھام ممکن نہیں۔ ظواہری تجزیے اس حقیقت کو سینکڑوں نئے تعبیروں کے ذریعے پیش کر سکتے ہیں۔ ان ظواہری تجزیوں سے اس مسئلے کا فہم و ادراک ممکن نہیں۔

بڑی بڑی اصلاحی تحریکیں اس جانب کو ناقابل مس سمجھتی ہیں۔ بلکہ اصلاحی تحریکیں اس گوشہ سے پہلے ہی دست کشی کا اعلان کر دیتی ہیں۔ لیکن اس سے بڑی شکست یہ ہے کہ یہ نظام مغرب کی فکری مغلوبیت کو ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں۔ اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے نظام اسلام کے ظواہر پر گفتگو کی ہے۔ ظواہر کے باہمی ربط کو اس کی منطقیت قرار دی اور اس منطقیت کو افادیت سے تعبیر کیا۔ نتیجۃً یہ گفتگو بداہت کی نقص کا شکار ہو گئی۔ اپنی بداہت کو نظری بنا کر پیش کرنا، اور غیروں کی نظریات کو بداہت کے ساتھ پیش کرنا فکری غلبے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ چند جملوں میں اسلامی فلسفے کو محصور کرنے کا ایک شاطر مغربی طریقہ یہی رہا اور وہی رویہ مدافعین کا بھی رہا۔ بلکہ بسا اوقات مغربی تعبیریں زیادہ تفصیلی ہوتی ہیں۔ میں نے مذکورہ بالا سطروں میں بداہت و نظر پر مزید تفصیلی گفتگو کی ہے۔

سیرت نویسی میں نسوانیات کا التزام:

بد سے بد تر ہوتے حالات نے ایسے مظاہر کو جنم دیا، جس کا شاید کبھی تصور ممکن نہ تھا۔ بہر حال حالات نے ہماری اس آبادی کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں اصلاحی کوششوں کا ان کی طرف ہونا ناگریز ہو گیا ہے۔ غربی متناسق ماحول اور مشاہدے، غربی افکار کو مردوں کے بنسبت ان کے نزدیک مزید پر کشش اور جاذب بناتے ہیں۔ بد سے بد تر ہوتے مسلم معاشراتی حالات، انہیں اس کی طرف مہمیز دیتے ہیں۔

اسلام و سیرت کے ان پہلوؤں کی نظریاتی تقدیم و ترتیب ضروری ہے ایسے انداز میں کرنا ضروری ہے جس سے فکری آفاق کو متاثر کیا جا سکے۔

دوسری طرف تقابلاتی لٹریچر کی ترتیب بھی ضروری ہے۔ مغربی معاشرہ، انسانی اقدار کے فقدان کے گوناگوں منفی اثرات سے متاثر ہے۔ وہ معاشرے اپنے منفی نتیجے کی طرف رواں ہیں۔ وہاں سے مختلف کیس اسٹڈیز اٹھائے جا سکتے ہیں، اور تقابلاتی مواد ترتیب دیے جا سکتے۔ اس سے مغرب متنافر تناظر قائم ہو گا، جس میں اسلامی موقف کی قبولیت کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اس کی تفصیل ایک مستقل مقالے کی مقتضی ہے۔

آخر میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلام کی مغربی اقدار کی ہمنوائی سے بالکل انکار کیا جائے۔ خواہ وہ جمہوریت، حقوق، مساوات، امن و انسانیت یا اور دوسرے جاذب نظریات کی بات ہو۔ اگر کچھ مماثلت پائی بھی جائے تو، مغربی مماثلت کو اسلامی نظام فکر و فلسفہ کے ایک ناقابل اعتناء جز کی طور پر پیش کیا جائے۔ عموماً ہمارے ارباب قلم، اسلامی اقدار کو، مغربی اقدار کے محاذی بنا کر اپنی کاوش کو کامیابی کے نشے سے مخمور کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ انہیں اس بات کا بنیادی تعقل ہونا چاہیے کہ اس روش سے غربی فلسفہ و اقدار من جملہ قوی ہوں گے اور ان کی آفاقیت کو اس قدر وسیع تسلیم کر لیا جائے گا جس میں اسلام بھی سما جائے۔ دوسری طرف انہیں اس بات کا ادراک بھی ضروری ہے کہ بعض امور میں محاذاۃ قائم کر بھی لیا جائے، تو دوسرے امور میں انکار کے علاوہ ان کے نزدیک بھی کوئی اور گنجائش نہیں بچتی۔ مثلاً عورتوں کی فلسفہ حقوق میں اگر آپ حق ذات، حق اذن و نکاح، حق خلع، حق وراثت کو ثابت کر کے مغربی اقدار کے ہمنوا بنا بھی لیں تو، لیو ان ریلیشن، شذوذ جنسی کے مقام پر جا کر انکار ناگریز ہو جائے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے اسلامی آفاق، مغربی آفاق سے یکسر مختلف ہیں۔ اسلامی آفاق وسیع اور صواب تر آفاق کے حامل ہیں۔ لیکن ایسی آفاقی توضیحیں، آفاقی تصانیف کا اقتضا کرتی ہیں۔ اس طرح کی

تصانیف اس بات کا اقتضا کرتی ہیں کہ خود صاحب قلم میں گہری عقلی بصیرت ہو، آفاق اسلامی کی باریکیوں اور گہرائیوں تک علمی رسائی ہو اور غربی آفاق کے احاطے کی صلاحیت ہو۔ ان میں سے اگر ایک بھی امر مفقود ہے تو غیر شعوری طور پر ایسی تحریریں پر ضرر ثابت ہو سکتی ہیں۔ قلم رانی سے پہلے فکر رانی کے نشیب و فراز سے گہری واقفیت ضروری ہے۔

اللهم تقبل كما تتقبل من عبادك الصالحين آمين بجاه سيد المرسلين صلى الله عليه وعلى آله وصحبه أجمعين

مصادر و مراجع

(1) الروم، 30

(2) البقرہ، 31

(3) النحل، 78

(4) الغافر، 67

(5) النحل، 70

(6) الإسراء، 36

(7) النحل، 108

(8) الملک، 23

(9) السجدة، 9

(10) الواقعة. 76

تعلیم وتربیت کا نبوی منہج اور جدید تعلیمی چیلنجز

مولانا محمد ناصر رضا امجدی، ناسک مہاراشٹر

مقام علم اور اہمیت تعلیم

تخلیق انسانیت کے ساتھ ہی جس چیز کو رب تبارک وتعالی نے خصوصی مقام عطا فرمایا اور جو وجہ حق خلافت قرار پائی وہ علم ہے، تبلیغ مصطفی جان رحمت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور آپ کی تربیت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ تعلیم کو جو اہمیت اور مقام آپ نے عطا فرمایا تاریخ انسانیت اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے تعلیم کو جو مقام بلندی اور اعلی درجہ عطا فرمایا کوئی قوم، کوئی ملت، کوئی مفکر، کوئی مدبر تعلیم کو وہ مرتبہ نہ دے سکا۔ سفر وحضر، مرد وعورت، بچے بوڑھے، دن کا اجالا یا شب کی تاریکی ہر جگہ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے تعلیم کی انجمن سجا کر مقام علم اور مرتبہ تعلیم کو آشکار کیا یہاں تک کہ رب کا قرآن اس کی ترغیب دیتے ہوئے اعلان فرماتا ہے۔ ﴿یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾(1)

ترجمہ: اللہ تمہارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا، اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

یہی وجہ تھی کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے تربیت یافتہ اصحاب نے جہاں قدم رکھا پورے خطے کو علم سے بھر دیا۔ جہاں تک اسلام کی شمع روشن ہوئی تعلیمی مراکز کا جال بچھتا گیا۔

امتِ مسلمہ کی موجودہ تعلیمی زوال اور اعداد و شمار

لیکن افسوس آج ملت اسلامیہ اپنی ہمہ جہت تنزلی کے ساتھ تعلیمی میدان میں بھی پستی کی انتہائی نازک موڑ پر کھڑی ہے، مسلمانوں کی تعلیمی شرح صرف چالیس فیصد ہے جب کہ ۲۰۰۵ء کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں ۸۷/ فیصد عیسائی تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۷/ مسلم ممالک میں آدھی سے زیادہ بالغ آبادی پڑھنا لکھنا نہیں جانتی، جن کی اکثریت مسلم خواتین کی ہے۔

مجموعی سطح پر کیے گئے سروے کے نتیجے میں سامنے آنے والے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ 22 عرب ملکوں میں سالانہ 300 کے قریب کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے جبکہ صرف یونان میں اس کا پانچ گنا زیادہ ترجمے کا کام ہوتا ہے اور یہ تراجیم بھی محض مذہبی ہوتے ہیں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور دیگر علوم پر کام بالکل نہیں ہوتا ہے۔

پوری دنیا کا سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیا کے ۵۷/ مسلم ممالک جو کہ آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن (OIC) کے ممبر ہیں ان میں کل ۶۰۰/ سے کم یونیورسیٹیاں ہیں۔ او آئی سی کی آبادی ۱،۴ billion سے زیادہ ہے۔

مسلمانوں کا علمی ورثہ اور عصری علوم کی بنیاد

مسلمانوں کے تعلیم سے بے رغبتی نے جہاں مسلمانوں کا سماجی وملی نقصان کیا وہیں عالمی ترقی اور سوسائٹی کا بھی بہت نقصان کیا، جب مسلمان تعلیم کو اہمیت کا ملہ دیتے تھے اس کا نتیجہ ہے کہ آج کے ہمہ جہت ترقی کے اسباب اور تعلیمی ترقیات میں قرون اولی و وسطی کے مسلمانوں کے انمٹ نقوش موجود ہیں، مسلمانوں نے آج جن علوم کو عصریات سے تعبیر کر کے ثانوی حیثیت دے رکھی ہے ان علوم کے بانی مسلم مفکرین ہی ہیں۔

آج مغربی ترقی کا نام دے کر مغربی ممالک کو، ان کے تعلیمی اداروں کو اور ان کے تحقیقات کو سراہا جارہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آج تک جدید فنون کے موجد نہ بن سکے بلکہ مسلم مفکرین کے دیئے گئے فنون کو جدید نام دے کر ان پر تحقیق کے دروازے کھول دیئے۔ علم قرآن، حدیث، فقہ، میراث، عقائد، کلام، تصوف، اخلاق، نفس، بدائع، عجائب، صرف، نحو، لغۃ، اشتقاق، الٰہیات، منطق، ریاضیات، حساب، ہندسہ، مساحۃ، ہیئت، نجوم، رمل، طبعیات، کیمیا، معدن، طب، فلاحت، معاشیات، عمرانیات، خواب، فال، مقامہ، محاضرات، فروسیہ، بحریات، جمال، ادب، سیرت، سوانح وغیرہ علوم وفنون انھیں مسلم مفکرین کے کارنامے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج تعلیم محض دنیا کمانے کا ذریعہ بن چکا ہے، بلا نکیر مختلف جہتوں میں ترقیاتی علم نصب کیے جارہے ہیں لیکن اس میں تعمیری پہلو کم اور تخریبی استعمال زیادہ ہے، حفاظتی تدابیر کے لیے تیار کیے جانے والے ہتیار آج انسان کی ہلاکت وبربادی اور دنیا کو تباہ و تاراج کرنے کے لیے استعمال کیے جارہے ہیں، یہ یقیناً بے لگام علم کا نتیجہ اور مسلمانوں کی عدم توجہی کا خمیازہ ہے، اس امر کی اصلاح کے لیے مختلف چیلنجز کا سامنا ہے جس کا تدارک بالخصوص تربیتی میدان میں منہج مصطفی ﷺ سے رہنمائی حاصل کرکے ہی ہو سکتا ہے۔

علم کی اقسام: علمِ نافع اور علمِ غیر نافع

بنیادی طور پر علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ علم جو انسان کے لئے نفع بخش ہو، خواہ دنیا کے لیے ہو یا آخرت کے لیے۔ اور دوسرے وہ علم جو بے فائدہ ہو۔ پہلا علم مطلوب ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور دوسری قسم کا علم مذموم اور ناپسندیدہ ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿سَلُوْا عِلْماً نَافِعاً، وَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ﴾(2)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دُعا کیا کرو اور بے فائدہ علم سے اللہ کی پناہ چاہو۔

جدید تعلیمی نظام کے چیلنجز اور سیرتِ نبوی سے حل

ا۔ تعلیم کا باہمی گرانی اور تجارتی بننا:

جدید تعلیمی نظام کا ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ تعلیم کو حد درجہ مہنگا کر دیا گیا ہے، جس کے سبب تعلیم عام پہنچ سے دور ہو چکی ہے، جبکہ سیرت رسول اکرم ﷺ نے اصحاب صفہ کی تربیت کے ذریعے بتا دیا کہ تعلیم کو دولت سے جوڑنا غلط ہے، نتیجہ دیکھ لیں مسلمانوں کو سب سے بڑا محدث صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کی شکل میں اسی اصحاب صفہ سے ملا، تعلیم کی یہی تسہیل تحصیل کا نتیجہ تھا کہ ایک دھاگہ کاتنے والے کا یتیم بیٹا امام غزالی بن کر آسمان علم وادب میں چمکا، ایک دھوبی کے پاس کام کرنے والا یعقوب امام ابو یوسف بن کر قاضی القضات فی العالم کا منصب حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے بے شمار نام کتب تاریخ میں رقم ہیں۔

۲۔ علم اور اخلاق کے درمیان تضاد:

جدید تعلیمی نظام کا ایک بڑا چیلنج یہ بھی ہے کہ وہ علم اور اخلاق کے درمیان باہمی تضاد کا درس دیتا ہے جس کا مقصد محض تعلیم کو ایک آلہ بنانا ہے جس کے ذریعے دنیاوی کامیابی مادی ترقی اور اقتدار وغیرہ کا حصول ہو نتیجتاً انسان نفسیاتی الجھن اور ڈپریشن اور ذہنی بے چینی واضطراب کا شکار ہے۔

جبکہ قرآن میں رب تبارک وتعالی نے اپنے محبوب کے بارے میں فرمایا: "جیسا کہ ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا اور کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے، اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے جس کا تمہیں علم نہ تھا"(3)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجت اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں: انبیا کا بنیادی مقصد انسانوں کی اخلاقی اور روحانی تطہیر ہے اور علم اسی تطہیر کا ذریعہ ہے۔

۳۔مادری زبان کے بجائے غیر مادری زبان کا تسلط:

جدید تعلیمی نظام کا ایک بڑا چیلنج بالخصوص مشرق وسطی کے لیے یہ ہے کہ انگریزی زبان کو فوقیت دیتے ہوئے وقت کا بڑا حصہ اسی زبان کی تحصیل میں صرف کیا جاتا ہے، ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ غیر انگریزی زبانوں میں تعلیم لینے والے اگرچہ علوم جدیدہ پر کامل دسترس رکھتے ہوں مگر اصطلاحات کی غیر مانوسیت ان کے قدم روک دیتی ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ مخاطب کے زبان کا مکمل خیال رکھتے تھے، آپ ﷺ نے قبیلہ بنی اشعر کے لوگوں کو انہیں کی زبان اور لہجہ میں مخاطب کر کے فرمایا:

﴿ليس من امبر امصيام في امسفر﴾(4)

ترجمہ: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

علامہ زرقانی تحریر فرماتے ہیں: ﴿لأن المصطفى يخاطب كل إنسان بلغته﴾(5)

یعنی حضور ﷺ ہر انسان کے ساتھ اسی کی زبان میں بات فرماتے تھے۔

۴۔استاد اور شاگرد کے تعلقات میں کمی:

جدید تعلیمی نظام کا ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان ربط کی بہت بڑی کمی ہے، مقدار نصاب کی تکمیل میں استاد کا انہماک اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ وہ شاگرد سے ہم آہنگ ہی نہیں ہو پاتا، جبکہ اس عقدہ کا بڑا پیارا حل سیرت رسول اللہ ﷺ میں ملتا نظر آتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد نے ان کے سامنے اپنی خواہش ظاہر کی کہ کاش! آپ روزانہ ہمیں وعظ و نصیحت فرماتے! تو انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ اس لیے نہیں کرتا کہ کہیں تم اکتاہٹ میں نہ

مبتلا ہو جاؤ، پھر فرمایا: ﴿إن رسول الله صلى عليه وسلم كان يتخولنا بالموعظة في الأيام، مخافة السآمة علينا﴾(6)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ ناغہ فرما کر نصیحت کرتے تھے، تا کہ ہم اُکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔

استاد وشاگرد کے درمیان باہمی رشتے کو واضح کرتے ہوئے اپنے ایک جگہ فرمایا:

﴿نَّمَا أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ، أُعَلِّمُكُمْ﴾(7)

میں تمہارے والد کے مانند ہوں، تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔

۵۔ سخت گیر تعلیمی معیار اور نفسیاتی دباؤ:

جدید تعلیمی نظام کا ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ وہ محض اپنے نصابی اہمیت کے لیے اعلیٰ تعلیمی معیار کو سخت سے سخت تر کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے آئے دن مختلف شعبوں کے طلبا کی خودکشی تک کی خبریں آتی ہیں ،بجائے افسوس کے اظہار کے اتنے بڑے سانحات کو بھی وہ قابل فخر گردانتے ہیں، مختلف حکومتوں نے اس کے تدارک کے مختلف قوانین ترتیب دیے لیکن نتیجہ صفر ہی رہا، یہاں بھی سیرت رسول اللہ ﷺ ہماری رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے، تعلیم کے لئے مخاطب کے ذہن کا خیال رکھنا، اور مختلف جہتوں سے اس کی فہمائش کرنا سیرت رسول کا اعلی پہلو ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا، جسے اپنے بیٹے کے بارے میں شک وشبہ تھا، اور عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میرے ہاں ایک سیاہ لڑکا پیدا ہوا ہے (جبکہ وہ شخص خود سیاہ نہیں تھا اور بظاہر اس کے آباء واجداد میں بھی کوئی کالا نہیں تھا)، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے پوچھا: وہ کس رنگ کے ہیں؟ اس نے کہا: سرخ، حضور ﷺ نے پوچھا: کیا ان میں کوئی سفید مائل بسیاہی بھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ رنگ کہاں سے آیا؟ اس نے عرض کیا: ہو سکتا ہے کسی رگ نے اسے کھینچ لیا ہو، یعنی اس کی نسل میں کوئی اس رنگ کا ہو، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ممکن ہے تمہارے بیٹے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔(8)

یوں ہی بے جا جوش وجذباتی انداز کو ناپسند فرماتے ہوئے تعلیم کا انداز بیان فرمایا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک دیہاتی آیا اور کھڑے ہو کر مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی طرف اُٹھ کھڑے ہوئے اور "رک جاؤ، رک جاؤ" کہنے لگے، حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، پیشاب سے

مت روکو، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ پیشاب کر کے فارغ ہو گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: یہ مساجد پیشاب اور گندگی پھیلانے کے لیے نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے ذکر، نماز اور قرآن کی تلاوت کے لیے بنائی گئی ہیں، پھر آپ ﷺ نے ایک آدمی کو حکم دیا، وہ پانی کا ڈول لے کر آیا اور اس جگہ پر بہا دیا۔ نیز حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: تم لوگ آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، سختی کرنے کے لیے نہیں۔(9)

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عصر حاضر کے تعلیمی چیلنجز خواہ وہ اخلاقی زوال ہو مادیت پرستی ہو، روحانی فقدان ہو یا تہذیبی یلغار ہو ان سب کا واحد حل سیرت رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے۔

مصادر و مراجع

(1) المجادلہ:۱۱

(2) سنن ابن ماجہ ۳۸۴۳

(3) البقرہ:۱۵۱

(4) مسند احمد:۲۳۶۷۹

(5) شرح الزرقانی علی المواہب ۱/ ۱۳۴

(6) صحیح البخاری:۶۴۱۱

(7) سنن ابی داؤد:۸

(8) صحیح البخاری ۵۳۰۵

(9) صحیح البخاری ۲۲۰

نوجوانوں کے مسائل اور ان کا نبوی حل

(حافظ) افتخار احمد قادری (پیلی بھیت)

آج کا نوجوان غیر معمولی ذہانت، بے پناہ توانائی اور بلند حوصلوں کا مالک ہے مگر یہی نوجوان ایک ایسے دور میں زندگی گزار رہا ہے جہاں فکری انتشار، اخلاقی انحطاط، دینی بے رغبتی، بے مقصدیت، مادہ پرستی اور بے شمار فتنوں نے اس کی شخصیت کو مختلف سمتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا، مغربی تہذیب کے اثرات اور دین سے دوری نے نوجوان نسل کو ایسے سوالات اور آزمائشوں میں مبتلا کر دیا جن کا صحیح جواب صرف سیرتِ نبوی ﷺ میں ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے نوجوانوں کی تربیت محض نصیحتوں سے نہیں بلکہ کردار، محبت، حکمت اور عملی نمونے کے ذریعے فرمائی، اسی لیے آپ ﷺ کی تعلیمات ہر دور کے نوجوان کے لیے کامل رہنمائی ہیں۔ اسلام نے نوجوانی کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت قرار دیا۔ کیوں کہ یہی وہ عمر ہے جس میں انسان کے فیصلے اس کی پوری زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانی کی قدر و قیمت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن بندے سے جن امور کے بارے میں سوال ہوگا ان میں ایک سوال اس کی جوانی کے بارے میں بھی ہوگا کہ اسے کہاں صرف کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن بندہ اس وقت تک اپنے رب کے سامنے سے نہیں ہٹے گا جب تک اس سے اس کی عمر، اس کے علم، اس کے مال اور اس کی جوانی کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے کہ جوانی کس کام میں گزاری۔(1)

جوانی صرف خواہشات پوری کرنے کا نام نہیں بلکہ ذمہ داری، عبادت، کردار سازی اور امت کی خدمت کا بہترین زمانہ ہے۔ آج نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ دینی شعور کی کمزوری ہے۔ بہت سے نوجوان اسلام کو محض چند عبادات تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام مکمل نظامِ حیات ہے۔ جب انسان اپنے رب سے تعلق مضبوط کرتا ہے تو اس کے اندر خود اعتمادی، سکون، استقامت اور اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بیشک یہ نوجوان اپنے رب پر ایمان لائے تھے اس لیے ہم نے انہیں ہدایت میں اور زیادہ بڑھا دیا۔"(2)

اصحابِ کہف کی یہ مثال نوجوانوں کے لیے واضح پیغام ہے کہ جب ایمان مضبوط ہو تو دنیا کی بڑی سے بڑی آزمائش بھی انسان کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کو سب سے پہلے ایمان کی مضبوطی کی تعلیم دی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے لڑکے! میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں۔ اللہ کی حفاظت کرو اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔" (3)

آج کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ نوجوان اپنی شناخت کھوتا جا رہا ہے۔ وہ دوسروں کی نقل میں اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنی دینی اقدار اور اپنے خاندانی تشخص کو بھولتا جا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ مسلمانوں کو باوقار شناخت اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے ایسا کردار عطا فرمایا جس میں عزت بھی تھی، وقار بھی اور اعتدال بھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے۔(4)

یہی اخلاق نوجوان کی اصل پہچان ہے۔ اگر کردار بلند ہو تو معاشرہ خود اس کا احترام کرتا ہے۔ آج اخلاقی گراوٹ بھی نوجوانوں کے لیے ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے۔ جھوٹ، بدزبانی، بے حیائی، غصہ، والدین کی نافرمانی اور دوسروں کی تضحیک عام ہوتی جا رہی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اخلاق کو ایمان کا حصہ قرار دیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔"(5)

یاد رکھیں کہ کامیابی ڈگری، دولت یا شہرت نہیں بلکہ اعلیٰ کردار ہے۔

نوجوانوں کو درپیش ایک اور خطرناک مسئلہ بے مقصد زندگی ہے۔ بہت سے نوجوان یہ نہیں جانتے کہ انہیں اپنی صلاحیتیں کس رخ پر استعمال کرنی ہیں۔ نتیجتاً وقت فضول مشاغل، غیر ضروری تفریح اور بے فایدہ سرگرمیوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ خسارے میں رہتے ہیں: صحت اور فراغت۔"(6)

یہ حدیث نوجوان کو وقت کی قدر، منصوبہ بندی اور مثبت مصروفیات اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اسی طرح فحاشی اور بے حیائی بھی موجودہ دور کا بڑا فتنہ ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے گناہوں تک رسائی آسان بنا دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس فتنے کا علاج نگاہوں کی حفاظت، پاکیزگی اور نکاح کی ترغیب میں بیان فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ نکاح کر لے کیونکہ یہ نگاہ کو جھکانے اور شرم گاہ کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے۔"(7)

یہ نبوی تعلیم آج بھی نوجوانوں کے لیے پاکیزہ زندگی کی مضبوط بنیاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں پر اعتماد بھی فرمایا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو کم عمری میں عظیم لشکر کا سپہ سالار مقرر کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام نوجوانوں کو ذمہ داری، قیادت اور اعتماد دیتا ہے، بشرطیکہ ان میں صلاحیت، دیانت اور تقویٰ موجود ہو۔(8)

یہ واقعہ موجودہ دور کے نوجوان کو یہ سبق دیتا ہے کہ عمر سے زیادہ کردار، علم اور اہلیت اہم ہوتی ہے۔ اگر نوجوان اپنی صلاحیتوں کو علم، دیانت اور اخلاص کے ساتھ استعمال کرے تو وہ معاشرے کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے نوجوانوں کو کبھی کمتر نہیں سمجھا بلکہ انہیں امت کا سرمایہ قرار دیتے ہوئے ان کی تربیت، حوصلہ افزائی اور عملی میدان میں رہنمائی فرمائی۔ یہی نبوی طرزِ عمل آج بھی نوجوان نسل کی اصلاح اور معاشرے کی فلاح کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

آج نوجوانوں کی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ذہنی اضطراب، بے چینی اور مایوسی ہے۔ جدید دور میں سہولتوں کی فراوانی کے باوجود نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اندرونی سکون سے محروم ہے۔ تعلیمی دباؤ، بے روزگاری، خاندانی اختلافات، مقابلے کی فضا، سوشل میڈیا پر دوسروں کی ظاہری کامیابیوں سے مسلسل تقابل اور مستقبل کا خوف انہیں ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں سیرتِ نبوی ﷺ انسان کو امید، حوصلہ، صبر اور اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد کا درس دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ سے امید وابستہ رکھنے کی تعلیم دی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

اگر پوری امت تمہیں کوئی فایدہ پہنچانا چاہے تو وہ اتنا ہی فایدہ پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور اگر پوری امت تمہیں نقصان پہنچانے پر جمع ہو جائے تو اتنا ہی نقصان پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر فرمایا ہے۔(9)

یہ حدیث نوجوان کے دل میں توکل، اطمینان اور یقین پیدا کرتی ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں مگر اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھنے والا کبھی حقیقی معنوں میں ناکام نہیں ہوتا۔

آج تعلیم سے بے رغبتی اور علم کو صرف روزگار کا ذریعہ سمجھنا بھی موجودہ نوجوانوں کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام میں علم کا مقصد صرف معاشی ترقی نہیں بلکہ شخصیت کی تعمیر، اخلاق کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے علم حاصل کرنے کو عبادت کا درجہ عطا فرمایا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔(10)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے علماء کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہوتی ہے۔(11)

معلوم ہوا علم محض ڈگری کا نام نہیں بلکہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے اور معاشرے کا مفید فرد بنانے کا ذریعہ ہے۔ بے روزگاری اور معاشی مشکلات بھی نوجوانوں کو شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ بعض نوجوان

رزق کی تلاش میں ناجائز ذرائع اختیار کرنے لگتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے محنت سے کمانے کو بہترین ذریعہ معاش قرار دیا ہے۔

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کسی انسان نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام بھی اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔(12)

آج نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد سوشل میڈیا کی اسیر بنتی جا رہی ہے۔ قیمتی اوقات فضول ویڈیوز، غیر ضروری تبصروں اور بے فایدہ مشاغل میں ضائع ہو رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عبادت، مطالعہ، والدین کی خدمت اور معاشرتی ذمہ داریاں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انسان کو ہر بے فائدہ چیز سے بچنے کی تعلیم دی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے۔(13)

والدین سے دوری اور ان کی نافرمانی بھی ایک سنگین سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات نے خاندانی نظام کو کمزور کیا ہے، جبکہ اسلام والدین کی خدمت کو عظیم عبادت قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تمہارے رب نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔"(14)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اللہ تعالی کو سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے پوچھا اس کے بعد کون سا عمل؟ فرمایا: والدین کے ساتھ حسنِ سلوک۔(15)

بری صحبت نوجوان کی شخصیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ انسان اپنے دوستوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نیک اور بد صحبت کی مثال مشک فروش اور لوہار سے دی کہ نیک ساتھی سے خیر ہی خیر ملتی ہے جبکہ برا ساتھی نقصان پہنچاتا ہے۔(16)

اچھی صحبت انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور بری صحبت گناہوں کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی اصلاح میں سختی کے بجائے محبت، شفقت اور حکمت کو اختیار فرمایا۔ جب ایک نوجوان نے حاضر ہو کر زنا کی اجازت طلب کی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت ناگواری ہوئی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے قریب بٹھایا، محبت سے سمجھایا کہ جس چیز کو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتا، دوسرے بھی اسے پسند نہیں کرتے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔ اس کے بعد وہ نوجوان ہمیشہ کے لیے اس گناہ سے متنفر ہو گیا۔(17)

یاد رکھیں کہ نوجوانوں کی اصلاح صرف تنقید اور ملامت سے نہیں بلکہ محبت، اعتماد، حکمت اور خیر خواہی سے ممکن ہے۔ یہی نبوی طریقہ تربیت آج بھی ہر استاد، والدین، داعی اور سماجی رہنما کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ کیوں کہ نوجوان کسی بھی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اگر ان کے اندر ایمان کی پختگی، کردار کی مضبوطی، علم کی روشنی اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ معاشرے کی تقدیر بدل سکتے ہیں، لیکن اگر یہی نوجوان دین سے دور، اخلاق سے محروم اور بے مقصد زندگی گزارنے لگیں تو پوری قوم زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی تربیت اس انداز سے فرمائی کہ وہ بعد میں دنیا کے عظیم رہنما، فاتح، محدث، فقیہ، مبلغ اور عادل حکمران بن کر ابھرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسے نوجوان اس نبوی تربیت کے روشن نمونے ہیں۔

آج نوجوانوں کے اندر عبادت سے غفلت بھی ایک بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔ مصروفیات، سستی اور دنیا کی رنگینیوں نے نماز، تلاوتِ قرآن، ذکرِ الٰہی اور دعا سے تعلق کمزور کر دیا ہے، حالانکہ عبادت ہی وہ قوت ہے جو انسان کے دل کو سکون، عقل کو بصیرت اور کردار کو استقامت عطا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا، ان میں ایک وہ نوجوان بھی ہے جس نے اپنی جوانی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاری۔(18)

یہ فضیلت اس بات کا واضح اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزری ہوئی جوانی دنیا و آخرت کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اسی طرح وقت کی قدر نہ کرنا نوجوانوں کی ناکامی کا ایک اہم سبب ہے۔ بہت سے نوجوان اپنی بہترین صلاحیتیں سستی، غفلت اور فضول مشاغل کی نذر کر دیتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ہر لمحے کو قیمتی سرمایہ قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: بڑھاپے سے پہلے جوانی، بیماری سے پہلے صحت، محتاجی سے پہلے خوش حالی، مصروفیت سے پہلے فراغت اور موت سے پہلے زندگی۔"(19)

جوانی ہمیشہ باقی رہنے والی نعمت نہیں، اس لیے ہر لمحے کو علم، عبادت، خدمت اور تعمیرِ معاشرہ میں صرف کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کے اندر قیادت کی صلاحیت بھی پیدا فرمائی۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نوجوانی ہی میں یمن کا قاضی اور معلم بنا کر بھیجا۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الأقضیہ: ۴۹۷)

اسی طرح حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ہجرت سے قبل مدینہ منورہ بھیج کر تعلیم و دعوت کی عظیم ذمہ داری سونپی گئی۔ ان کی محنت اور حسنِ اخلاق کے نتیجے میں مدینہ کے متعدد خاندان اسلام کے دامن سے وابستہ ہوئے۔(20)

یہ واقعات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اسلام نوجوانوں کو صرف نصیحتیں نہیں دیتا بلکہ ان پر اعتماد بھی کرتا ہے اور انہیں امت کی قیادت کے لیے تیار کرتا ہے۔ آج معاشرے میں انتہا پسندی، برداشت کی کمی، غصہ اور جلد بازی بھی نوجوانوں کے نمایاں مسائل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حلم، بردباری اور نرم مزاجی کو ایمان کی خوبصورتی قرار دیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نصیحت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "غصہ نہ کرو۔" اس نے کئی مرتبہ یہی درخواست کی اور ہر مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا: "غصہ نہ کرو۔"(21)

آج اگر نوجوان اس ایک نبوی تعلیم پر عمل کر لیں تو گھریلو جھگڑے، معاشرتی نفرتیں، تشدد اور بہت سے جرائم میں نمایاں کمی آسکتی ہے۔ اسلام نوجوانوں کو صرف اپنی ذات تک محدود رہنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ انہیں امت

کے درد اور انسانیت کی خدمت کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔" (22)

یہ ارشاد نوجوان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو صرف ذاتی مفادات کے لیے نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح، تعلیم، رفاہِ عامہ، دینی خدمت اور انسانی بھلائی کے لیے استعمال کرے۔ اگر آج کا نوجوان قرآنِ کریم کو اپنا دستور، سنتِ نبوی ﷺ کو اپنی زندگی کا معیار، والدین کی اطاعت کو اپنی سعادت، علم کو اپنا سرمایہ، حسنِ اخلاق کو اپنی شناخت، محنت کو اپنا شعار اور تقویٰ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد بنالے تو وہ نہ صرف اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے بلکہ امتِ مسلمہ کی عظمت کی بحالی میں بھی مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اسلام کی سربلندی میں نوجوانوں نے ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا ہے اور جب بھی امت نے قرآن و سنت سے اپنا تعلق مضبوط کیا، اسے عزت، وقار اور کامیابی نصیب ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ نوجوانوں کے مسائل کا مستقل اور مؤثر حل نہ صرف جدید نظریات میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی صرف مادی ترقی میں، بلکہ اس کا حقیقی سرچشمہ رسولِ اکرم ﷺ کی مبارک تعلیمات، آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور قرآنِ کریم کی ہدایات ہیں۔ یہی وہ روشن راستہ ہے جو نوجوانوں کو فکری انتشار سے یقین، اخلاقی گراوٹ سے پاکیزگی، مایوسی سے امید، بے مقصدیت سے مقصدِ حیات اور کمزوری سے عزت و وقار کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے گھروں، مدارس، اسکولوں، کالجوں، جامعات اور سماجی اداروں میں نوجوانوں کی تربیت خالص نبوی اصولوں کے مطابق کی جائے، تاکہ وہ اپنے دین، اپنے وطن اور پوری انسانیت کے لیے خیر و بھلائی کا ذریعہ بن سکیں۔ یہی کامیاب، باوقار اور صالح معاشرے کی بنیاد ہے۔

مراجع و مصادر

(1) جامع ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، صفحہ ۵۶۷)

(2) الکهف: ۳۰)

(3) جامع ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ: ۵۸۶)

(4) صحیح بخاری، کتاب الادب: ۹۵۸)

(5) صحیح بخاری، کتاب المناقب:۵۰۱)
(6) صحیح بخاری، کتاب الرقاق:۹۶۳)
(7) صحیح بخاری، کتاب النکاح، صفحہ ۷۶۵؛ صحیح مسلم، کتاب النکاح، صفحہ ۵۹۴)
(8)سیرت ابن ہشام، جلد دوم، صفحہ ۶۴۲)
(9)جامع ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ:۵۸۶)
(10)سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ:۲۴)
(11)جامع ترمذی، کتاب العلم ۶۴۱)
(12) صحیح بخاری، کتاب البیوع:۳۴۲)
(13)جامع ترمذی، کتاب الزہد:۶۷۲)
(14)بنی اسرائیل ۲۳)
(15) صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ:۸۳ صحیح مسلم، کتاب الایمان:۴۸)
(16) صحیح بخاری، کتاب الذبائح:۸۷۷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ:۱۹۸۳)
(17)مسند احمد، جلد ۵، ۲۵۶)
(18) صحیح بخاری،:۲۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ:۳۹۱)
(19)مستدرک حاکم، جلد ۴، ۳۴۱)
(20)سیرت ابن ہشام، جلد اول:۴۳۴)
(21) صحیح بخاری، کتاب الأدب:۹۵۶)
(22)المعجم الأوسط للطبرانی، جلد ۶/ ۵۸)

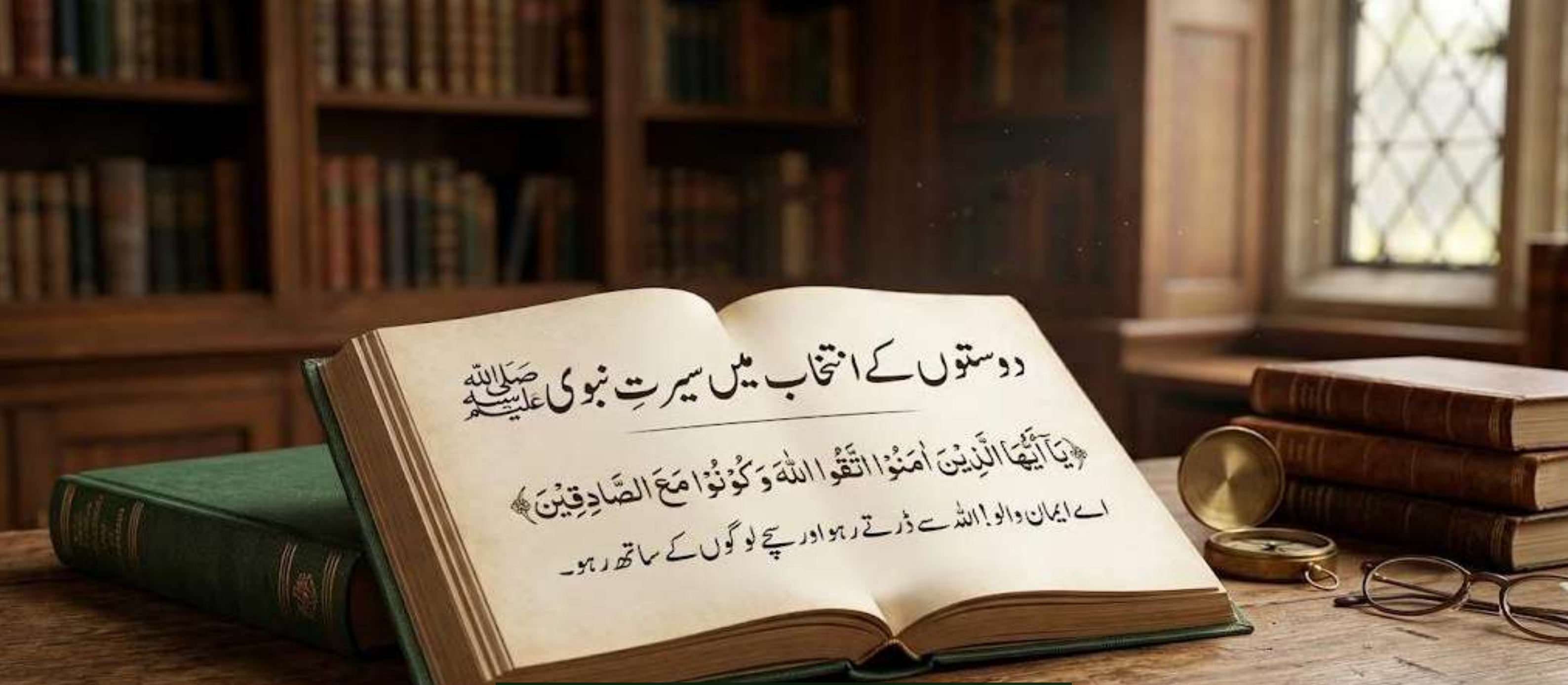

(حافظ) افتخار احمد قادری (پیلی بھیت)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتاً معاشرتی زندگی عطا فرمائی ہے۔ وہ تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ اس کی طبیعت ایسے افراد کی متلاشی رہتی ہے جن کے ساتھ وہ اپنے جذبات، خیالات، معاملات اور زندگی کے نشیب و فراز کو بانٹ سکے۔ یہی رفاقت اور صحبت جب نیکی، تقویٰ، اخلاص اور خوف خدا پر قائم ہوتی ہے تو انسان کی دنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت بھی کامیاب ہو جاتی ہے لیکن اگر یہی دوستی خواہشاتِ نفس، گناہوں، فسق و فجور اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر قائم ہو تو یہی تعلق انسان کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید اور احادیث مبارکہ نے نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا اور نبی کریم ﷺ کی پوری سیرتِ طیبہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ صالح رفیق انسان کے ایمان، کردار اور اخلاق کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ﴾(1)

اس دن گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے متقی لوگوں کے۔

اللہ تعالیٰ نے دوستی کے انجام کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا۔ دنیا میں جو تعلقات محض خواہشاتِ نفس، دنیاوی مفادات یا گناہوں کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں وہ قیامت کے دن دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گے کیونکہ ہر شخص دوسرے کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ البتہ وہ دوستی جو اللہ تعالیٰ کی رضا، تقویٰ اور اطاعتِ رسول

ﷺ کی بنیاد پر ہو گی وہی دائمی سعادت اور کامیابی کا ذریعہ بنے گی۔ اسی مضمون کو مزید وضاحت کے ساتھ قرآنِ مجید میں یوں بیان فرمایا گیا:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ○ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ○ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي﴾(2)

اور اس دن ظالم اپنے ہاتھ چباتا ہوا کہے گا کاش! میں نے رسول (ﷺ) کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے میری بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا اس نے مجھے نصیحت آنے کے بعد اللہ کی یاد سے بہکا دیا۔

بری صحبت صرف دنیا ہی میں نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ آخرت میں بھی دائمی حسرت و ندامت کا سبب بنتی ہے۔ انسان اس وقت یہ اعتراف کرے گا کہ اگر اس نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کی ہوتی تو اس کی زندگی کا رخ ہی بدل جاتا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی دوست کے انتخاب کی اہمیت کو نہایت جامع الفاظ میں بیان فرمایا۔ حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ﴾(3)

آدمی اپنے دوست کے دین اور طریقے پر ہوتا ہے لہٰذا! ہر شخص کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔

انسان غیر محسوس انداز میں اپنے دوست کی عادات، اخلاق، گفتگو، سوچ، عقائد اور طرزِ زندگی سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے دوستی کو محض ذاتی پسند کا معاملہ قرار نہیں دیا بلکہ اسے دینی ذمہ داری سے تعبیر کیا۔ سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ ایسے افراد کو اپنی قربت عطا فرمائی جو صدق، امانت، اخلاص، تقویٰ اور وفاداری کے پیکر تھے۔ بعثت سے قبل بھی آپ ﷺ کی مجلس پاکیزہ کردار رکھنے والے افراد سے آراستہ رہتی تھی۔ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت اس کی روشن مثال ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نہ صرف قریش کے معزز اور صاحب کردار انسان تھے بلکہ اپنی راست گوئی، دیانت اور حسن اخلاق کی وجہ سے پورے مکہ میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو سب سے پہلے مردوں میں حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا تردد ایمان قبول کیا۔ یہ قبول

ایمان اس بات کی دلیل تھی کہ پاکیزہ طبیعت پاکیزہ شخصیت کو فوراً پہچان لیتی ہے۔ حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا غَيْرَ رَبِّي لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا، وَلَكِنْ أُخُوَّةُ الْإِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهُ﴾(4)

اگر میں اپنے رب کے علاوہ کسی کو گہرا دوست بناتا تو ابو بکر کو بناتا لیکن اسلام کی اخوت اور محبت ہی کافی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ مبارکہ میں حضرت سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہر اہم موقع پر اپنے ساتھ رکھا۔ ہجرت کے سفر میں بھی آپ ﷺ نے انہی کو رفیقِ سفر منتخب فرمایا حالانکہ اس سفر میں جان کا شدید خطرہ تھا۔ اگر رفاقت اور دوستی کی بنیاد صرف دنیاوی تعلقات ہوتی تو اس عظیم قربانی کا تصور بھی ممکن نہ تھا مگر یہ تعلق ایمان، اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر قائم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے غارِ ثور کے اس تاریخی واقعہ کو قرآن کریم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا: ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾(5)

جب وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے غم نہ کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ اس آیت میں حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو "صاحب" یعنی رفیق کے عظیم لقب سے یاد کیا گیا۔ مفسرین نے لکھا کہ یہ رفاقت صرف سفر کی نہیں بلکہ ایمان، وفاداری، قربانی اور محبت کی رفاقت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا، وَلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ﴾(6)

مومن کے علاوہ کسی کو اپنا خاص ساتھی نہ بناؤ اور تمہارا کھانا بھی صرف پرہیز گار شخص ہی کھائے۔

نبی کریم ﷺ نے واضح فرمادیا کہ انسان کی خصوصی رفاقت انہی لوگوں سے ہونی چاہیے جن کی زندگی تقویٰ، دیانت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مزین ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر مسلم یا گناہگار کے ساتھ حسنِ سلوک نہ کیا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کی قربت اور اثر قبول کرنے والی دوستی صالح افراد سے ہونی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے اچھی اور بری صحبت کی مثال بھی نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمائی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ وَالسَّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَنَافِخِ الْكِيرِ﴾(7)

نیک ساتھی اور برے ساتھی کی مثال مشک اٹھانے والے اور بھٹی جھونکنے والے کی سی ہے۔ مشک والا یا تو تمہیں خوشبو دے گا یا تم اس سے خرید لو گے یا کم از کم اس کی خوشبو ضرور پاؤ گے جبکہ بھٹی والا یا تمہارے کپڑے جلا دے گا یا تم اس کی بدبو سے متاثر ہو گے۔

یہ تمثیل انسانی معاشرت کا ایسا ابدی اصول ہے جس کی صداقت ہر زمانے میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ صحبت کا اثر لازماً منتقل ہوتا ہے۔ نیک انسان کی مجلس علم، حکمت، حسنِ اخلاق اور ایمان کی خوشبو بکھیرتی ہے جبکہ بدکردار انسان کی رفاقت گناہوں، غفلت اور اخلاقی زوال کا سبب بنتی ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کا یہ بھی امتیاز ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان ایسی اخوت قائم فرمائی جس کی مثال انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا رشتہ اسی حقیقت کا عملی مظہر تھا۔ یہ دوستی نہ نسل کی بنیاد پر تھی، نہ قبیلے کی بنیاد پر، نہ مال و دولت کی بنیاد پر بلکہ صرف ایمان کی بنیاد پر تھی۔ اسی اخوت نے ایک منتشر قوم کو متحد امت میں تبدیل کر دیا اور یہی اسلامی دوستی کا حقیقی تصور ہے جس کی بنیاد محبتِ الٰہی اور اتباعِ رسول ﷺ ہے۔
نبی کریم ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ صالح رفاقت انسان کی شخصیت کو جِلا بخشتی ہے اور بد صحبتی ایمان و کردار کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے صرف زبانی نصیحت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے عملِ مبارک سے بھی امت کو یہ تعلیم دی کہ دوستی کا معیار حسب و نسب، مال و دولت، قوت و اقتدار یا دنیاوی منفعت نہیں بلکہ ایمان، تقویٰ، حسنِ اخلاق اور اخلاص ہونا چاہیے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی معاشرہ استوار ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو صالحین کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾(8)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

اس آیتِ کریمہ میں صرف سچ بولنے کی تلقین نہیں کی گئی بلکہ "صادقین" کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ مفسرین نے لکھا کہ صالحین کی صحبت دلوں کو نورِ ایمان سے منور کرتی ہے، اخلاق کو سنوارتی ہے اور انسان کو

معصیت سے دور رکھتی ہے۔ امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ سچوں کی جماعت میں شامل رہیں تاکہ ان کی سیرت اور کردار سے فیض حاصل کر سکیں۔(9)

نبی کریم ﷺ نے اپنے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رفاقت کو امت کے لیے نمونہ بنایا۔ حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شخصیت اس کی روشن مثال ہے۔ قبولِ اسلام سے قبل ان کا مزاج سخت تھا لیکن جب ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور نبی کریم ﷺ کی صحبت میسر آئی تو وہ عدل، تقویٰ، زہد اور حق گوئی کا ایسا مینار بن گئے کہ خود نبی کریم ﷺ نے ان کی عظمت کا اعتراف فرمایا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ﴾(10)

بے شک اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان اور ان کے دل پر جاری فرمادیا ہے"۔

یہ مقام انہیں محض نسب یا قوت کی بنیاد پر حاصل نہیں ہوا بلکہ نبی کریم ﷺ کی صحبت اور ایمان کی برکت نے ان کی شخصیت کو ایسا انقلاب عطا کیا کہ وہ قیامت تک عدل و انصاف کی علامت بن گئے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم ﷺ کے مقرب ترین اصحاب میں سے تھے۔ ان کی شرم و حیا، سخاوت، حلم اور حسنِ اخلاق نے انہیں امت میں منفرد مقام عطا کیا۔ نبی کریم ﷺ ان سے خصوصی محبت فرماتے تھے۔ حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے اپنے لباس کو درست فرمایا۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! آپ نے ایسا کیوں فرمایا؟ ارشاد ہوا:

﴿أَلَا أَسْتَحْيِي مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحْيِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ﴾(11)

"کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں؟"

صالح رفیق کی اصل پہچان اس کا پاکیزہ کردار ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ ایسے لوگوں کو اپنے قریب رکھا جن کی زندگی تقویٰ اور حسنِ اخلاق سے عبارت تھی۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی رفاقت بھی سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک درخشاں باب ہے۔ بچپن ہی سے آپ ﷺ کی تربیت میں رہے، ہر آزمائش میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھڑے رہے اور ہجرت کی رات اپنی جان خطرے میں ڈال کر نبی کریم ﷺ کے بسترِ مبارک

پر سوئے۔ یہ محض جذباتی تعلق نہ تھا بلکہ ایمان، محبت اور وفاداری کا بے مثال نمونہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے بارے میں فرمایا:

﴿أَنْتَ مِنِّي وَأَنَا مِنْكَ﴾(12)

اے علی! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں"۔ یہ تعلق خلوص، وفاداری اور قربانی کی بنیاد پر قائم تھا جو ہر مسلمان کے لیے دوستی کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے منافقین اور بدباطن لوگوں کے ظاہری دعووں سے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ آپ ﷺ حسنِ سلوک ضرور فرماتے تھے لیکن دل کی قربت صرف مخلص اہلِ ایمان کو عطا فرماتے تھے۔ قرآنِ مجید نے منافقین کے بارے میں واضح تنبیہ فرمائی: ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ﴾(13)

یہی حقیقی دشمن ہیں لہٰذا! ان سے بچتے رہو۔

ظاہری خوش اخلاقی یا میٹھی گفتگو دوستی کا معیار نہیں بلکہ ایمان، اخلاص اور وفاداری ہی اصل بنیاد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿خَيْرُ الْأَصْحَابِ عِنْدَ اللَّهِ خَيْرُهُمْ لِصَاحِبِهِ﴾(14)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے سب سے بہتر ہو۔

اچھا دوست وہ نہیں جو صرف خوشیوں میں شریک ہو بلکہ وہ ہے جو اپنے دوست کو گناہ سے بچائے، نیکی کی دعوت دے، مشکل وقت میں ساتھ دے اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ نبی کریم ﷺ کی مجلسِ مبارک میں آنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے خیر خواہ تھے۔ اگر کسی سے لغزش ہو جاتی تو وہ محبت اور خیر خواہی کے ساتھ اصلاح کرتے۔ قرآنِ کریم نے اسی باہمی تعلق کو یوں بیان فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾(15)

بے شک تمام مومن آپس میں بھائی ہیں۔

اسلامی اخوت کا تقاضا یہی ہے کہ دوستی محض دنیاوی مفاد کے لیے نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو۔ ایسی دوستی انسان کو جنت تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿سَبعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ... وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ﴾(16)

سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا۔ ان میں وہ دو اشخاص بھی ہیں جو صرف اللہ کی رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، اسی پر ملتے ہیں اور اسی پر جدا ہوتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قائم ہونے والی دوستی دنیا ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی باعثِ نجات ہوگی۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے "احیاء علوم الدین" میں لکھا کہ دوست وہ ہونا چاہیے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے، علم و عمل میں اضافہ کرے، دنیا کی محبت سے بچائے اور آخرت کی فکر پیدا کرے۔ اگر کسی کی صحبت اس کے برعکس اثر ڈال رہی ہو تو ایسی دوستی سے علیحدگی اختیار کرنا ہی عقل و ایمان کا تقاضا ہے۔(17)

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی کی دولت، قبیلے یا منصب کی وجہ سے اسے اپنا مقرب نہیں بنایا بلکہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ کو اپنی محبت اور قربت سے نوازا۔ ان حضرات کا امتیاز صرف ایمان، اخلاص اور وفاداری تھا۔ یہی اسلامی معاشرت کا وہ عظیم اصول ہے جس نے رنگ، نسل اور زبان کے تمام امتیازات کو مٹا کر اخوتِ اسلامی کی بنیاد مضبوط کی۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انسان کی ظاہری زندگی کے ساتھ اس کی باطنی اصلاح پر بھی خصوصی توجہ فرمائی۔ دوستی چونکہ دلوں کا تعلق ہے اس لیے آپ ﷺ نے ایسے اصول عطا فرمائے جن پر عمل کرنے سے انسان نہ صرف دنیا میں عزت و وقار حاصل کرتا ہے بلکہ آخرت کی دائمی کامیابی بھی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ سیرتِ طیبہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ ایسے افراد کو اپنی قربت عطا فرمائی جو صدق و صفا، تقویٰ، دیانت، حلم، عفو و درگزر اور اخلاص کے پیکر تھے جبکہ فتنہ پرداز، دھوکے باز، منافق اور بدکردار لوگوں سے محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدۡعُونَ رَبَّهُم بِالۡغَدَاةِ وَالۡعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجۡهَهُۥ﴾(18)

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھیے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اسی کی رضا چاہتے ہیں"۔

ایمان والوں کی صحبت اختیار کرنا خود اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ مفسرین نے لکھا کہ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو بھی یہی ہدایت دی گئی کہ دنیاداروں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہونے کے بجائے اللہ والوں کی مجلس کو اختیار فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ نے دوستی کے حقیقی معیار کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا﴾(19)

مومن، مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔

پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست فرما کر اس کی عملی مثال بھی پیش فرمائی۔ اسلامی دوستی محض رسمی تعلق نہیں بلکہ باہمی تعاون، خیر خواہی، ہمدردی اور استقامت کا نام ہے۔ جو دوست انسان کو نیکی میں مضبوط کرے وہی حقیقی دوست ہے۔ نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی میں حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رفاقت ایک درخشاں مثال ہے۔ حضرت سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے حق کی تلاش میں اپنا وطن، مال اور خاندان سب کچھ چھوڑ دیا۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو نبی کریم ﷺ نے ان کے اخلاص کو دیکھ کر انہیں خصوصی قربت عطا فرمائی۔ غزوہ خندق کے موقع پر خندق کھودنے کی رائے بھی حضرت سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے پیش کی جسے نبی کریم ﷺ نے قبول فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صالح دوست کی رائے کو اہمیت دینا بھی سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ﴾(20)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اسے حقیر سمجھتا ہے۔

سچا دوست وہ ہے جو ظلم نہ کرے، مشکل وقت میں ساتھ چھوڑ کر نہ بھاگے، عزتِ نفس کو مجروح نہ کرے اور خیر خواہی کو اپنا شعار بنائے۔ سیرتِ نبوی ﷺ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی نہایت سبق آموز ہے۔ وہ غلام تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی محبت، حسنِ سلوک اور اخلاقِ کریمانہ نے انہیں ایسا گرویدہ بنایا کہ

جب ان کے والد انہیں واپس لے جانے آئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی رفاقت کو اپنے خاندان پر ترجیح دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسنِ اخلاق ایسی قوت ہے جو دلوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اہلِ ایمان کی باہمی محبت کو یوں بیان فرمایا:

﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (21)

وہ مومنوں کے لیے نہایت نرم دل اور محبت کرنے والے جبکہ باطل کے مقابلے میں مضبوط اور باوقار ہوتے ہیں۔ مومن کی دوستی میں تکبر، خود غرضی اور مفاد پرستی نہیں ہوتی بلکہ محبت، تواضع اور ایثار ہوتا ہے۔ حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ﴾(22)

تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔ دوستی کا یہی معیار سیرتِ نبوی ﷺ کا بنیادی وصف ہے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے لیے وہی چاہتے تھے جو اپنے لیے پسند فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے پر اپنی جان و مال تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا کہ کامل ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی کی دینی و دنیاوی بھلائی کو اپنی بھلائی سمجھے اور اس کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا اور خیر خواہی کرے۔ (شرح صحیح مسلم، امام نووی، ج2، ص17) سیرتِ طیبہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی محبت بھی دوستی کے آداب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

﴿يَا مُعَاذُ، وَاللَّهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ﴾(23)

" اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی: ﴿اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ﴾ سچا دوست وہ ہے جو اپنے دوست کو دنیاوی مفادات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، ذکر اور تقویٰ کی طرف رہنمائی کرے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ﴾(24)

اگرچہ یہ حدیث براہِ راست دوستی سے متعلق نہیں لیکن سلف صالحین نے اس سے استدلال کیا ہے کہ فراغت کے اوقات میں انسان جن لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہے وہی اس کے مستقبل کا رخ متعین کرتے ہیں۔ اگر یہ اوقات صالحین کی مجلس میں گزریں تو علم و عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور اگر اہلِ غفلت کے ساتھ گزریں تو عمر ضائع ہو جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "لوگوں کو ان کے دوستوں سے پہچانو کیونکہ ہر شخص اپنے جیسے لوگوں ہی سے محبت کرتا ہے"۔(25)

یہ قول دراصل حدیثِ نبوی ﷺ «المرء علی دین خلیله» کی بہترین تشریح ہے۔ انسان کے دوست اس کے مزاج، فکر، کردار اور دینی رجحان کا آئینہ ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ مبارکہ میں یہ سبق دیا کہ دوستی انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والی ہونی چاہیے نہ کہ گناہوں، عداوتوں، تعصبات اور دنیا پرستی میں مبتلا کرنے والی۔ یہی وہ رفاقت ہے جو دنیا میں سکونِ قلب، حسنِ اخلاق اور معاشرتی امن پیدا کرتی ہے اور آخرت میں جنت کے بلند درجات کا سبب بنتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کرتا ہے کہ صالح دوستی ایمان کی حفاظت، کردار کی تعمیر اور معاشرے کی اصلاح کا بنیادی ستون ہے۔ اسلام نے دوستی کو محض جذباتی تعلق یا وقتی مفاد کا نام نہیں دیا بلکہ اسے دین، اخلاق اور آخرت سے جوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے بار بار اہلِ ایمان کو نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور بدکردار افراد کی رفاقت سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اور ظالموں کی طرف ذرا بھی مائل نہ ہونا ورنہ تمہیں بھی آگ چھو لے گی"۔(26)

مفسرین نے لکھا کہ اس آیت میں صرف ظلم کرنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ ظالموں کی بے جا قربت اور ایسی رفاقت سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان کو ظلم، گناہ یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جائے۔(27)

نبی کریم ﷺ نے دوستی کے حقوق کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا۔ حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ» پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب مسلمان بھائی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے، جب دعوت دے تو قبول کرے، جب نصیحت طلب کرے تو خیر

خواہی کرے، جب چھینکے اور "الحمد للہ" کہے تو جواب دے، جب فوت ہو جائے تو جنازے میں شریک ہو اور جب ملاقات ہو تو سلام کرے۔(28)

یہ تمام حقوق اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسلام میں دوستی محض خوش گپیوں اور میل جول کا نام نہیں بلکہ باہمی ذمہ داری، ایثار اور خیر خواہی کا عملی مظہر ہے۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے لیے بے مثال وفاداری اور محبت کا نمونہ تھے۔ غزوہ تبوک، غزوہ بدر، غزوہ احد اور دیگر تمام مواقع پر انہوں نے اپنی جانوں، مالوں اور خواہشات کو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور دینِ اسلام پر قربان کر دیا۔ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کر دیا، حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نصف مال لا کر حاضر کیا، حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے لشکرِ اسلام کے لیے بے مثال مالی تعاون کیا اور حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے ہر خطرناک مرحلے پر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ساتھ نبھایا۔ یہ تمام مثالیں اس بات کی دلیل ہیں کہ صالح دوستی انسان کو ایثار، قربانی اور وفاداری کا پیکر بنا دیتی ہے۔ حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں برکت ہو اور اس کی عمر میں خیر و برکت ہو تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔(29)

اگرچہ یہ حدیث صلہ رحمی کے متعلق ہے لیکن اس سے یہ اصول بھی واضح ہوتا ہے کہ مضبوط، خیر خواہ اور پاکیزہ تعلقات اللہ تعالیٰ کی برکتوں کا سبب بنتے ہیں جبکہ نفرت، عداوت اور بری صحبت انسان کو محرومی کی طرف لے جاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو"۔(30)

آج کا دور فتنوں، بے راہ روی، سوشل میڈیا کی غیر محدود وابستگی، مصنوعی تعلقات اور مفاد پرستانہ روابط کا دور ہے۔ بہت سے نوجوان دوستی کے نام پر ایسے افراد کی صحبت اختیار کر لیتے ہیں جو انہیں نماز، قرآن، والدین کی اطاعت، علم، اخلاق اور دینی اقدار سے دور لے جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ تعلقات دلکش محسوس ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ انسان کے عقائد، اخلاق، کردار اور مستقبل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے سورہ فرقان میں اشارہ فرمایا کہ قیامت کے دن انسان افسوس کرے گا کہ کاش! فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے برعکس اگر انسان ایسے دوستوں کا انتخاب کرے جو نماز کی پابندی کریں، سچ بولیں، امانت دار

ہوں، والدین کا احترام کریں، علمِ دین سے محبت رکھتے ہوں، غیبت، جھوٹ، حسد اور بدزبانی سے بچتے ہوں اور ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو مقدم رکھیں تو یہی دوست دنیا میں سکونِ قلب اور آخرت میں کامیابی کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ یہی وہ رفاقت ہے جسے قرآنِ مجید نے قیامت کے دن بھی باقی رہنے والی دوستی قرار دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ دوستی ہمیشہ تقویٰ، اخلاص، دیانت، وفاداری، حسنِ اخلاق، خیر خواہی اور محبتِ الٰہی کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیے۔ ایسی دوستی انسان کو گناہوں سے بچاتی، عبادت کی طرف راغب کرتی، مشکلات میں سہارا بنتی اور ایمان کی حفاظت کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے برعکس بد صحبت انسان کو آہستہ آہستہ دین سے دور، اخلاق سے محروم اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا مستحق بنا دیتی ہے۔ لہٰذا! ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے دوستوں کا انتخاب کرتے وقت نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو معیار بنائے، قرآن و سنت کی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھے، اہلِ تقویٰ، اہلِ علم اور صالحین کی صحبت اختیار کرے اور ایسے تمام تعلقات سے اجتناب کرے جو اسے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل اور آخرت سے بے فکر بنا دیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان دنیا میں عزت، اطمینان اور صالح معاشرہ حاصل کر سکتا ہے اور آخرت میں ان خوش نصیب لوگوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقی لوگوں کے"۔(31)

اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے صالحین کی صحبت اختیار کرنے، نیک دوست بنانے، بد صحبت سے بچنے اور اپنی تمام رفاقتوں کو رضائے الٰہی کے تابع بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

مصادر و مراجع

(1) الزخرف:67

(2) الفرقان:27/29

(3) سنن ابی داؤد، کتاب الآدب، باب من یؤمر أن یجالس، حدیث:4833، ج۲، ص۶۷۵

(4) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، حدیث:466، ج۱، ص۱۷۶

(5) التوبۃ:40

(6)سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، حدیث:4832،ج۲، ص ۶۷۴ / جامع الترمذی، حدیث:2395
(7) صحیح البخاری، حدیث:5534،ج۷، ص ۹۴۔ صحیح مسلم، حدیث:2628،ج۴، ص ۲۰۲۶
(8)التوبۃ:119
(9)تفسیر ابن کثیر، ج4، ص228
(10)جامع الترمذی، کتاب المناقب، حدیث:3682،ج6، ص81
(11) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، حدیث:2401،ج4، ص1866
(12) صحیح البخاری، کتاب الصلح، حدیث:2699،ج3، ص184
(13)المنافقون:4
(14)جامع الترمذی، کتاب البر والصلۃ، حدیث:1944،ج4، ص325
(15)الحجرات:10
(16) صحیح البخاری، کتاب الأذان، حدیث:660،ج1، ص133۔ صحیح مسلم، حدیث:1031
(17)احیاء علوم الدین، ج2، ص182
(18)الکہف:28
(19) صحیح البخاری، حدیث:6026،ج8، ص13۔ صحیح مسلم، حدیث:2585
(20) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، حدیث:2564،ج4، ص1986
(21)المائدۃ:54
(22) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، حدیث:13،ج1، ص12۔ صحیح مسلم، حدیث:45
(23)سنن ابی داؤد، کتاب الوتر، حدیث:1522،ج2، ص86
(24) صحیح البخاری، حدیث:6412،ج8، ص105
(25)حلیۃ الأولیاء، امام ابونعیم، ج1، ص136
(26)ہود:113
(27)تفسیر روح المعان، ج12، ص145
(28) صحیح مسلم کتاب السلام، حدیث:2162،ج4، ص1705
(29) صحیح البخاری، حدیث:5986،ج8، ص6
(30)المعجم الأوسط، امام طبرانی، حدیث:5937
(31)الزخرف:67

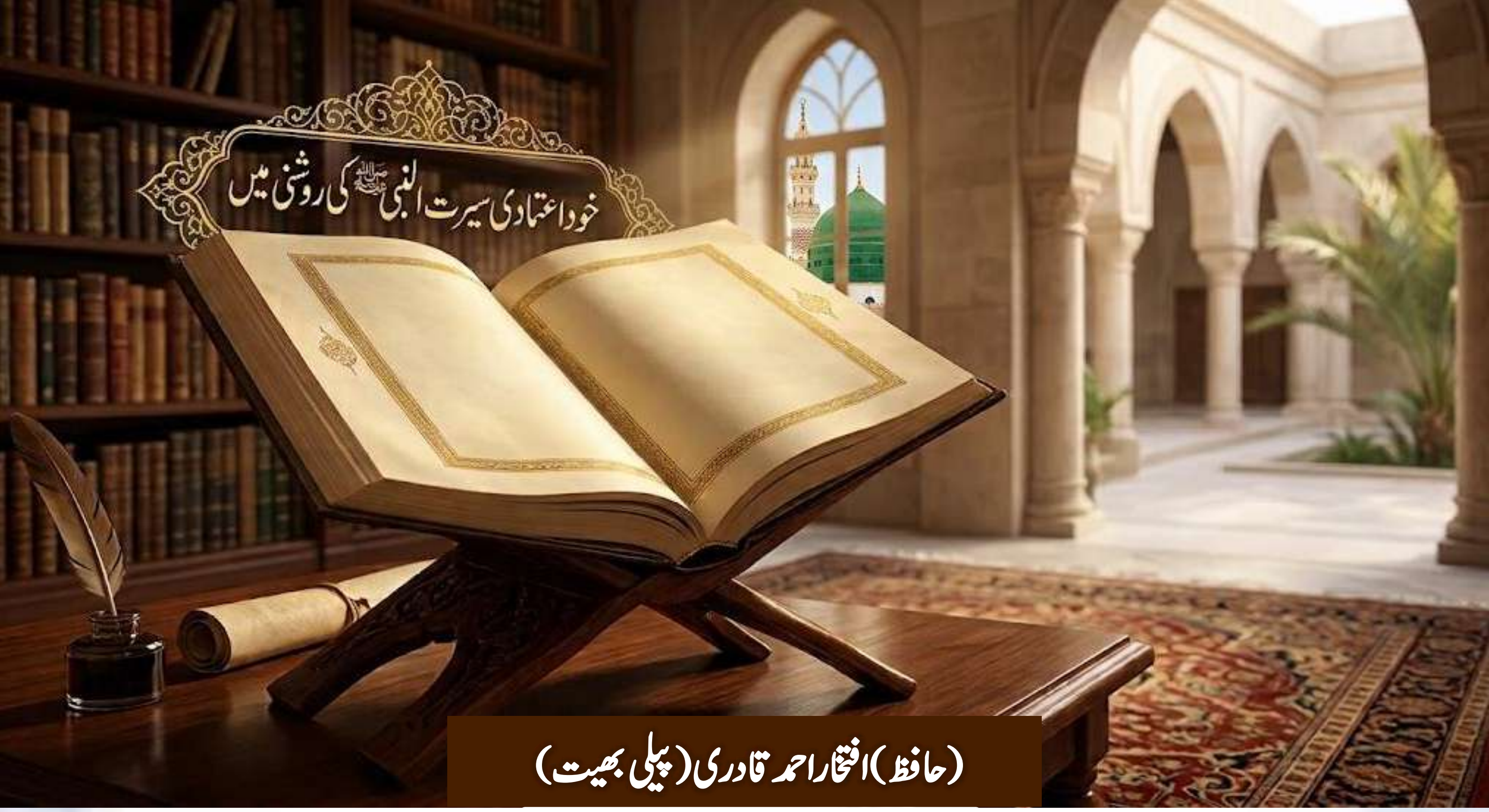

خود اعتمادی سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

(حافظ) افتخار احمد قادری (پیلی بھیت)

خود اعتمادی انسانی شخصیت کی وہ عظیم صفت ہے جو انسان کو حالات کے طوفانوں میں ثابت قدم، مشکلات کے ہجوم میں باہمت، اور مخالفتوں کے طوفان میں استقامت کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اسلام نے خود اعتمادی کو غرور، تکبر اور خود پسندی سے الگ ایک ایسا ایمان افروز وصف قرار دیا ہے جس کی بنیاد اپنی ذات پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت اور اس کے وعدوں پر یقین ہوتی ہے۔ سیرتِ طیبہ کا ہر باب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ ایسی بے مثال خود اعتمادی سے عبارت ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ خود اعتمادی نبوت کے اعلان سے قبل بھی آپ ﷺ کے کردار میں جلوہ گر تھی اور بعثت کے بعد ہر مرحلے پر مزید نمایاں ہوتی گئی۔ نبی کریم ﷺ نے جب اعلانِ نبوت فرمایا تو پورا مکہ مخالفت پر اتر آیا۔ قریش کے سرداروں نے تمسخر اڑایا، الزام تراشیاں کیں، سماجی بائیکاٹ کیا، جان سے مارنے کی سازشیں کیں مگر آپ ﷺ کے قدم متزلزل نہ ہوئے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کا اعتماد اپنی قوت پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر تھا کہ وہ اپنے رسول (ﷺ) کی حفاظت فرمائے گا اور دینِ حق کو غالب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا"۔(1)

سیدی سرکارِ اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی حفاظت کا ایسا ذمہ لیا جس کے بعد دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ (2)

یہ اعلان درحقیقت وہ روحانی بنیاد تھی جس نے نبی کریم ﷺ کی خود اعتمادی کو ناقابلِ شکست بنا دیا۔ دنیا کی کوئی طاقت آپ ﷺ کے عزم کو متزلزل نہ کر سکی کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ رب العالمین کی نصرت آپ کے ساتھ ہے۔

ابتدائے اسلام میں جب مسلمانوں کی تعداد نہایت کم تھی، کفار ہر طرف سے ظلم ڈھا رہے تھے اس وقت بھی نبی کریم ﷺ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ حالات سازگار ہونے کا انتظار کیا جائے بلکہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یقین اور اعتماد کی وہ شمع روشن فرمائی جو بعد میں پوری دنیا کو منور کرنے کا سبب بنی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ابتدائی دور میں بھی کھلے عام قرآن کریم کی تلاوت فرمائی حالانکہ اس وقت کفار کی دشمنی اپنے عروج پر تھی۔ (3)

یہ عمل اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خود اعتمادی کبھی حالات کی غلام نہیں ہوتی بلکہ حالات کو بدلنے کی قوت پیدا کرتی ہے۔ طائف کا سفر سیرتِ نبوی ﷺ کا وہ دردناک باب ہے جس میں انسانی اعتبار سے ہر امید ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اہل طائف نے نہ صرف دعوت کو مسترد کیا بلکہ بچوں اور اوباش لوگوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے پتھر مار مار کر جسمِ اطہر لہولہان کر دیا۔ ایسے نازک موقع پر اگر کوئی عام انسان ہوتا تو مایوسی کا شکار ہو جاتا لیکن نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے امید کا دامن نہ چھوڑا۔ علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ طائف کے اس کٹھن مرحلے میں بھی نبی کریم ﷺ نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا نہیں فرمائی بلکہ ان کی ہدایت کی امید ظاہر فرمائی۔ (4)

یہی وہ ایمان افروز خود اعتمادی تھی جس نے شکست کو بھی کامیابی کی تمہید بنا دیا۔ چند برس بعد یہی طائف اسلام کا مضبوط قلعہ بن گیا۔ سیرتِ طیبہ میں غارِ ثور کا واقعہ خود اعتمادی کی سب سے درخشاں مثال ہے۔ کفار مکہ قتل کے ارادے سے ہر طرف تلاش کر رہے تھے۔ وہ غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ

عنہ کو اندیشہ ہوا کہ اگر کسی نے نیچے دیکھ لیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا جو رہتی دنیا تک اہلِ ایمان کو خود اعتمادی کا درس دیتا رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"(5)

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ کلمات دراصل کامل توکل، مضبوط یقین اور بے مثال اعتماد کا اعلان تھے۔ دنیا کی تمام ظاہری طاقتیں مخالف تھیں لیکن نبی کریم ﷺ کا یقین صرف اللہ تعالیٰ پر تھا۔(6)

علامہ ابن کثیر اس واقعہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اپنے رب کے وعدے پر ایسا کامل یقین تھا کہ غار کے باہر دشمنوں کی موجودگی بھی آپ کے قلبِ مبارک میں کسی اضطراب کا سبب نہ بن سکی۔(7)

حقیقی خود اعتمادی اس شخص کے حصے میں آتی ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو۔ جسے اللہ کی معیت کا یقین حاصل ہو جائے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے حوصلے کو پست نہیں کر سکتی۔ نبی کریم ﷺ کی خود اعتمادی صرف میدانِ دعوت تک محدود نہ تھی بلکہ اجتماعی، سیاسی اور عسکری معاملات میں بھی نمایاں تھی۔ غزوہ بدر سے پہلے مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی جبکہ دشمن ایک ہزار سے زائد مسلح جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ ظاہری اعتبار سے کامیابی کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ یقین پیدا فرمایا کہ اگر اخلاص باقی رہا تو اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا۔ علامہ محمد بن سعد لکھتے ہیں کہ بدر کے موقع پر نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو مسلسل کامیابی کی بشارت دیتے رہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کی شکست کا وعدہ فرمایا ہے۔(8)

یہ یقین ہی تھا جس نے تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کو ایک ہزار مسلح لشکر پر غالب کر دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ ایمان سے پیدا ہونے والی خود اعتمادی ہر ظاہری طاقت سے بڑی قوت ہوتی ہے۔ غزوہ بدر کے بعد بھی نبی کریم ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ ایسے بے شمار واقعات سے مزین ہے جن میں خود اعتمادی، استقامت، حوصلہ، عزمِ صمیم اور اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہ خود اعتمادی کبھی ذاتی قوت، مال و دولت یا سیاسی اقتدار کی مرہونِ منت نہیں رہی بلکہ ہمیشہ اس ایمانِ کامل کا ثمرہ تھی جو اپنے رب کے وعدوں پر غیر

متزلزل یقین سے عبارت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیرتِ نبوی ﷺ کا ہر مرحلہ اہلِ ایمان کو یہ درس دیتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جائے دنیا کی کوئی طاقت اس کے حوصلے کو شکست نہیں دے سکتی۔ صلحِ حدیبیہ بظاہر مسلمانوں کے لیے نہایت دشوار اور ظاہری اعتبار سے یک طرفہ شرائط پر مشتمل معاہدہ تھا۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ان شرائط سے قلبی اذیت محسوس ہوئی لیکن نبی کریم ﷺ نے غیر معمولی بصیرت اور غیر متزلزل اعتماد کے ساتھ اس معاہدے کو قبول فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کو اپنے رب کے وعدے پر کامل یقین تھا۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ یہی معاہدہ اسلام کی عظیم ترین سیاسی اور دعوتی کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی موقع پر ارشاد فرمایا: "بیشک ہم نے آپ کو ایک روشن فتح عطا فرمائی"۔(9)

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں صلحِ حدیبیہ کو "فتحِ مبین" قرار دیا گیا کیونکہ اس کے نتیجے میں اسلام کو وہ استحکام حاصل ہوا جو کسی بڑی جنگ سے بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔(10)

فتحِ مکہ خود اعتمادی کی وہ عظیم الشان مثال ہے جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ وہی مکہ جہاں کبھی نبی کریم ﷺ کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، جہاں آپ ﷺ کے قتل کی سازشیں ہوئیں، جہاں آپ ﷺ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اسی شہر میں آپ ﷺ دس ہزار جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ فاتحانہ شان سے داخل ہوئے۔ اس موقع پر اگر کوئی دنیاوی فاتح ہوتا تو انتقام لیتا مگر نبی کریم ﷺ نے اپنے رب کی رضا کو مقدم رکھتے ہوئے عام معافی کا اعلان فرمایا۔

علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ فتحِ مکہ کے دن نبی کریم ﷺ کا سر مبارک تواضع کے باعث اس قدر جھکا ہوا تھا کہ قریب تھا کہ اونٹ کی کجاوے سے لگ جائے۔ یہ منظر اس حقیقت کا اعلان تھا کہ کامل خود اعتمادی کبھی تکبر پیدا نہیں کرتی بلکہ بندگی کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔(11)

علامہ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ جب اہلِ مکہ آپ ﷺ کے سامنے خوف زدہ کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں تم سب آزاد ہو۔(12)

یہ اعلان اس حقیقت کا مظہر تھا کہ خود اعتمادی انتقام نہیں بلکہ عدل، رحمت اور حلم کو جنم دیتی ہے۔ غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعداد پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تھی لیکن ابتداء میں اچانک حملے کی وجہ سے کچھ وقتی انتشار پیدا ہو گیا۔ اس نازک گھڑی میں نبی کریم ﷺ میدانِ جنگ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے بلکہ بلند آواز سے اپنی شناخت ظاہر کرتے ہوئے مسلمانوں کو واپس بلاتے رہے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ اس وقت نبی کریم ﷺ نے انتہائی ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا اور مسلسل مسلمانوں کو مجتمع کرتے رہے یہاں تک کہ لشکر دوبارہ منظم ہو گیا اور دشمن کو شکستِ فاش ہوئی۔(13)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ غزوہ حنین میں نبی کریم ﷺ کی ثابت قدمی نے مسلمانوں کے منتشر قدموں کو پھر سے جما دیا اور اللہ تعالیٰ نے عظیم فتح عطا فرمائی۔(14)

حقیقی قائد وہی ہوتا ہے جو مشکل ترین حالات میں سب سے آگے کھڑا ہو، نہ کہ سب سے پہلے پیچھے ہٹ جائے۔ نبی کریم ﷺ کی خود اعتمادی کا ایک درخشاں پہلو دعوت و تبلیغ میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ نے قیصر روم، کسریٰ ایران، نجاشی حبشہ اور دیگر حکمرانوں کو اسلام کی دعوت پر مشتمل خطوط ارسال فرمائے۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی حیثیت ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی، لیکن آپ ﷺ نے پوری دنیا کو اسلام کی دعوت دی، کیونکہ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ یہ دین ایک دن پوری دنیا تک پہنچے گا۔

حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائے گا یہاں تک کہ مسافر دور دراز علاقوں میں بھی امن کے ساتھ سفر کرے گا۔(15)

اس ارشادِ مبارک میں مستقبل پر وہ غیر معمولی اعتماد نمایاں ہے جو صرف وحیِ الٰہی پر کامل یقین رکھنے والے رسول ہی کا وصف ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی خود اعتمادی کا ایک اور عظیم مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی مخالفت کی کثرت کو حق کی کمزوری نہیں سمجھا۔ مکہ میں چند افراد ایمان لائے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اسی چھوٹی جماعت کو پوری انسانیت کی اصلاح کا ذریعہ قرار دیا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہی مختصر قافلہ بعد میں دنیا کی عظیم ترین تہذیبی، علمی اور روحانی انقلاب کا سرچشمہ بن گیا۔ سیدی سرکارِ اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان قادری

فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے متعدد مقامات پر واضح فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قوت کا سر چشمہ اللہ تعالیٰ کی عطا، وحی الٰہی اور ربِ کریم کی نصرت تھی اسی لیے آپ ﷺ کی ہر پیش گوئی اور ہر وعدہ سچا ثابت ہوا۔(16)

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ خود اعتمادی کا سب سے مضبوط سرچشمہ ایمان، یقین، توکل اور مقصد کی سچائی ہے۔ جس شخصیت کے دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی نصرت پر یقین راسخ ہو جائے اس کے لیے حالات کی سختیاں، دشمنوں کی سازشیں اور وسائل کی قلت کامیابی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں بلکہ اس کے عزم کو مزید مضبوط کر دیتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا ایک نہایت درخشاں پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صرف اپنی ذات میں خود اعتمادی کا عملی نمونہ پیش نہیں فرمایا بلکہ اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایسی تربیت فرمائی کہ وہ بھی ایمان، یقین، عزیمت اور استقامت کے پیکر بن گئے۔ مکہ کے کمزور، غلام، مفلس، بے سروسامان اور معاشرتی اعتبار سے محروم افراد کو آپ ﷺ نے ایسا اعتماد عطا فرمایا کہ وہی لوگ بعد میں دنیا کی عظیم سلطنتوں کے سامنے حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے والے بنے۔ یہ تربیت کسی نفسیاتی تدبیر یا دنیاوی حکمت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ قرآنِ مجید، تعلیماتِ نبوی ﷺ اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کا ثمرہ تھی۔ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں سے خوف، مایوسی اور احساسِ کمتری کو ختم فرماتے اور انہیں یہ یقین دلاتے کہ عزت، نصرت اور کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے کبھی تعداد کی کمی، وسائل کی قلت یا مخالفین کی کثرت کو ناکامی کی دلیل قرار نہیں دیا۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ ایمان کی قوت کو اصل سرمایہ بتایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے"۔(17)

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مومن کی حقیقی قوت نہ اس کے اسباب ہیں اور نہ اس کے ظاہری وسائل بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس پر کامل اعتماد ہی اس کی اصل طاقت ہے۔(18)

اسی ایمان افروز تعلیم کا نتیجہ تھا کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور دیگر مظلوم صحابہ شدید ترین مظالم کے باوجود اپنے ایمان پر ثابت قدم

رہے۔ انہیں یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کو ضرور غالب فرمائے گا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ مسلسل صبر، استقامت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید دلاتے تھے جس سے ان کے حوصلے بلند رہتے اور وہ ہر آزمائش کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔(19)

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے جھوٹی تسلیاں یا غیر حقیقی وعدے نہیں کیے بلکہ انہیں حقیقت پسندانہ انداز میں مشکلات سے آگاہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ یقین دلایا کہ اگر اللہ تعالیٰ پر اعتماد باقی رہا تو ہر آزمائش آسان ہو جائے گی۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نے ظلم و ستم کی شدت کی شکایت کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں پر اس سے بھی زیادہ سخت آزمائشیں آئیں مگر وہ اپنے دین سے پیچھے نہیں ہٹے اور اللہ تعالیٰ اس دین کو ضرور مکمل فرمائے گا۔(20)

خود اعتمادی کا تعلق آسان حالات سے نہیں بلکہ مضبوط ایمان اور ثابت قدمی سے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کی صلاحیتوں پر اعتماد کر کے بھی خود اعتمادی کی بہترین تعلیم دی۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ابھی نوجوان تھے مگر آپ ﷺ نے انہیں ایک ایسے لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا جس میں جلیل القدر صحابہ کرام موجود تھے۔ یہ فیصلہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اسلام قابلیت، دیانت اور صلاحیت کو اہمیت دیتا ہے نہ کہ صرف عمر یا سماجی حیثیت کو۔

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی اور معلم بنا کر بھیجنا بھی اس بات کا اعلان تھا کہ نبی کریم ﷺ اپنے تربیت یافتہ افراد کی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔(21)

خود اعتمادی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انسان اپنی کامیابی کو اپنی ذات کا کمال نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل جانے۔ نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ فتح پر شکر، آزمائش پر صبر، کامیابی پر انکسار اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، یہی وہ اصول ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کی خود اعتمادی کو غرور سے محفوظ رکھا۔ سیدی سرکارِ اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ مومن کو اپنی ہر

نعمت اور ہر کامیابی کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھنا چاہیے کیونکہ بندہ اپنی ذات سے کچھ نہیں کر سکتا، ہر خیر اسی کی توفیق سے حاصل ہوتی ہے۔(22)

یہی اسلامی تصور خود اعتمادی کو تکبر سے ممتاز کرتا ہے۔ مغربی فکر میں خود اعتمادی اکثر اپنی ذات اور اپنی قوت پر اعتماد کا نام ہے جبکہ اسلامی تعلیمات میں خود اعتمادی اللہ تعالیٰ پر کامل توکل، اپنی ذمہ داری کی ادائیگی اور اس کی عطا پر یقین کا نام ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے اپنے متعدد رسائل میں اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ مومن کی عزت، اس کا وقار، اس کی ہمت اور اس کی جرات سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں۔ لہٰذا! اسے کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی تکبر میں گرفتار ہونا چاہیے۔(23)

نبی کریم ﷺ نے امت کو خود اعتمادی کا ایسا جامع تصور عطا فرمایا جس میں ایمان، توکل، عمل، اخلاص، شجاعت، حکمت، صبر، انکسار اور حسنِ اخلاق سب جمع ہیں۔ یہی وہ خود اعتمادی ہے جو انسان کو دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کی راہ دکھاتی ہے، اور یہی وہ وصف ہے جس کی آج کے مسلمان کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ خود اعتمادی کا اسلامی تصور محض نفسیاتی قوت یا شخصیت سازی کا ایک عنوان نہیں بلکہ ایمان، یقین، توکل، استقامت، اخلاص، حکمت اور حسنِ اخلاق کا ایسا جامع امتزاج ہے جو انسان کو ہر حال میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جس نے ایک فرد کو پوری انسانیت کا معلم، ایک مظلوم جماعت کو دنیا کی عظیم ترین تہذیبی قوت، اور مدینہ کی ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کو عالمی تاریخ کا فیصلہ کن مرکز بنا دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ مبارکہ میں کبھی ناموافق حالات کو اپنی دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ شعبِ ابی طالب کی معاشی ناکہ بندی، مکہ کے تیرہ برس کے مظالم، ہجرت کی صعوبتیں، مسلسل جنگیں، منافقین کی سازشیں، یہودی قبائل کی عہد شکنی اور عرب کے مختلف قبائل کی دشمنیاں ان میں سے کوئی بھی مرحلہ آپ ﷺ کی خود اعتمادی کو متزلزل نہ کر سکا، کیونکہ آپ ﷺ کا یقین اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر تھا کہ حق آخر کار غالب ہو کر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور نہ کمزور پڑو نہ غم کرو اگر تم ایمان والے ہو تو تم ہی غالب رہو گے"۔(24)

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو وقتی ناکامیوں یا ظاہری مشکلات سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایمان کی اصل قوت اللہ تعالیٰ کی نصرت ہے اور انجام کار کامیابی اہلِ ایمان ہی کے لیے ہے۔(25)

یہی قرآنی تعلیم نبی کریم ﷺ کی پوری سیرت میں عملی صورت میں نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی شکست خوردہ ذہنیت کو قبول نہیں کیا بلکہ ہر آزمائش کو آئندہ کامیابی کی تمہید سمجھا۔ غزوہ اُحد کے بعد جب مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا تو آپ ﷺ نے فوراً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حوصلے بلند کیے اور انہیں یہ احساس دلایا کہ وقتی نقصان ایمان والوں کی مستقل ناکامی نہیں ہوتا۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ غزوہ اُحد کے بعد نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کے اندر عزم و حوصلہ دوبارہ پیدا فرمایا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت جلد ہی بحال ہو گئی۔(26)

سیرتِ نبوی ﷺ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خود اعتمادی کبھی علم سے جدا نہیں ہو سکتی۔ نبی کریم ﷺ نے جہالت کو کمزوری اور علم کو قوت قرار دیا۔ وحی کے آغاز ہی میں "پڑھنے" کا حکم اس بات کا اعلان تھا کہ علمی پختگی انسان کی فکری خود اعتمادی کی بنیاد ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے مسجدِ نبوی کو عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ تعلیم گاہ بھی بنایا اور ایسے رجال علم تیار کیے جنہوں نے بعد میں دنیا کی علمی تاریخ بدل دی۔ آج امتِ مسلمہ جن فکری، اخلاقی، سیاسی اور تہذیبی بحرانوں سے دوچار ہے ان کی ایک بڑی وجہ احساسِ کمتری اور اعتماد کی کمی بھی ہے۔ جب مسلمان اپنی تاریخ، دین، تہذیب، اپنے اکابر اور اپنی علمی میراث سے دور ہو جاتا ہے تو اس کے اندر شکست خوردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ایمان، علم، کردار اور اللہ تعالیٰ پر توکل ہے۔ سیدی اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان قادری فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو بارہا اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ دین پر مضبوطی، شریعت کی پابندی، علمِ دین سے وابستگی اور عشقِ رسول ﷺ ہی امت کی حقیقی عزت اور وقار کا سرچشمہ ہیں۔(27)

صدر الشریعہ حضرت علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے جائز تدبیر اختیار کرنی چاہیے کیونکہ اسلام نہ بے عملی کی تعلیم دیتا ہے اور نہ غرور کی، بلکہ توکل کے ساتھ عمل کا حکم دیتا ہے۔(28)

یہی وہ معتدل اور متوازن تعلیم ہے جو اسلامی خود اعتمادی کو دنیا کے تمام مصنوعی نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام انسان کو نہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے دیتا ہے اور نہ خود پسندی میں گرفتار ہونے دیتا ہے بلکہ اسے عبدیت، اخلاص اور ذمہ داری کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ خود اعتمادی کا سب سے بڑا دشمن گناہ، بزدلی، جھوٹ، خیانت اور مایوسی ہے جبکہ اس کا سب سے بڑا سرمایہ سچائی، دیانت، تقویٰ، حسنِ اخلاق، علم، عملِ صالح اور ذکرِ الٰہی ہے۔ جو شخص اپنے رب سے تعلق مضبوط کرلیتا ہے وہ دنیا کی مخالفت سے خوف زدہ نہیں ہوتا اور جو اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتا ہے وہ وسائل کی فراوانی کے باوجود اندر سے کمزور رہتا ہے۔ سیرتِ طیبہ کا یہ روشن پیغام ہر دور کے مسلمان کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ اگر وہ اپنے اندر حقیقی خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنانا ہوگا۔ معاملات میں دیانت، عبادات میں اخلاص، کردار میں پاکیزگی، گفتار میں سچائی، فیصلوں میں عدل، دعوت میں حکمت، مصیبت میں صبر، کامیابی میں شکر اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن سے اسلامی خود اعتمادی پروان چڑھتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خود اعتمادی انسانی غرور کا نام نہیں بلکہ ربِ کریم پر غیر متزلزل ایمان، اس کی نصرت پر کامل یقین، اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں استقامت اور ہر حال میں رضائے الٰہی کی طلب کا حسین امتزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت آج بھی ہر داعی، ہر معلم، ہر قائد، ہر طالبِ علم، ہر نوجوان اور ہر مسلمان کے لیے اعتماد، حوصلے، عزیمت اور کامیابی کا سب سے روشن مینار ہے۔ جو قوم اس مینارِ نور سے وابستہ رہتی ہے، وہ کبھی فکری غلامی، اخلاقی شکست یا تہذیبی زوال کا شکار نہیں ہوتی، اور جو اس سے دور ہو جاتی ہے، وہ وسائل کے باوجود عزت و وقار سے محروم رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اسی کی روشنی میں ایمان افروز خود اعتمادی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مصادر ومراجع

(1) المائدہ:67
(2) کنزالایمان مع خزائن العرفان، سورہ مائدہ، آیت 67، ص236
(3) سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص320
(4) الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ جلد اول، ص193
(5) التوبہ:40
(6) خزائن العرفان، سورہ التوبہ، آیت 40، ص364
(7) البدایہ والنہایہ، جلد سوم، ص223
(8) الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، جلد دوم، ص16
(9) فتح:1
(10) کنزالایمان مع خزائن العرفان، سورہ فتح، آیت 1، ص947
(11) الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ، جلد اول، ص264
(12) سیرت ابن ہشام، جلد دوم، ص412
(13) الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، جلد دوم، ص151
(14) البدایہ والنہایہ، جلد چہارم، ص326
(15) صحیح بخاری، جلد دوم، کتاب المناقب، ص604
(16) فتاویٰ رضویہ، جلد30، ص291
(17) کنزالایمان، سورہ آل عمران، آیت 160، مع خزائن العرفان
(18) خزائن العرفان، سورہ آل عمران، آیت 160، ص171
(19) الکبریٰ، جلد سوم، ص233
(20) صحیح بخاری، جلد اول، کتاب المناقب، ص535
(21) سیرت ابن ہشام، جلد دوم، ص601
(22) فتاویٰ رضویہ، جلد21، ص217
(23) ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول، ص145، رضا اکیڈمی، ممبئی
(24) کنزالایمان، سورہ آل عمران، آیت 139، مع خزائن العرفان، ص168
(25) خزائن العرفان، سورہ آل عمران، آیت 139، ص168
(26) البدایہ والنہایہ، جلد چہارم، ص67
(27) فتاویٰ رضویہ، جلد24، ص623
(28) بہارِ شریعت، حصہ شانزدہم، ص708

دنیوی کامیابی کے نبوی اصول

مولانا سبحان رضا قادری امجدی، مرکز اہل سنت و جماعت، حیدر آباد

الحمد للہ و الصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ ﷺ

مسلمانوں کے لیے اصل کامیابی آخرت کی ہے مگر اخروی کامیابی کا مدار دنیاوی زندگی سے طے پاتا ہے، یہاں جو عمل ہوا اسی کے مطابق جزا بھی طے ہوگی، بارہا آپ نے پڑھا اور سنا ہوگا کما تدین تدان۔ وجزاء سئیۃ سئیۃ۔ وما جزاء الِاحسان الا الِاحسان۔ جیسا بوناہے ویسا ہی کاٹنا ہے معلوم چلا کہ آخرت کی خیر دنیاوی فلاح پر موقوف ہے۔ اس لیے ایک ایسی آئیڈیل تھیوری درکار ہے جس کے پیرایے میں ہم اپنی کامیابی کا راز تلاش کریں اور ایسے اصول اخذ کر سکیں جن پر عمل درآمد کے بعد دین و دنیا کی حقیقی کامیابی و کامرانی ہمارے حصے میں آئے۔

سرورِ انبیا معلم کائنات نبیِ کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں بلا شبہہ کامیاب زندگی گزارنے کا مکمل نظام العمل موجود ہے، اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(1)

تمہارے لیے رسول للہ ﷺ کی زندگی نمونۂ عمل (آئیڈیل) ہے۔

دنیا کتنی ہی ترقی کرلے مگر تمام تر اضطرابی کیفیت اور بے چینیوں سے نکل کر کامیابی کے راستے پر گامزن ہونا جبھی ممکن ہے کہ حضور اکرم رحمت عالم ﷺ کے نقوش زندگی اپنا لیے جائیں، ان ہی کے طرز عمل سے اپنا عمل موافق کرلیا جائے، وہی راستہ اختیار کیا جائے جسے ہم سنت سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک کامیاب دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے کچھ بنیادی اصول جو سیرت طیبہ سے مستفاد و ماخوذ ہیں نذر قارئین ہیں۔

تربیت:

انسانی زندگی کا پہلا مرحلہ جسے ہم بچپن کہتے ہیں اس کی کامیابی کا انحصار سرپرستوں اور گارجین پر منحصر ہوتا ہے، خود کا اس میں کچھ خاص اختیار نہیں ہوتا، اگر آداب و اخلاق عملی و قولی ہر دو طرح سے اوائل عمری سے ہی سکھائے اور بتائے جائیں تو بچپن سنور جاتا ہے اور آگے کی راہیں مثبت انداز پر سہل ہو جاتی ہیں، حضور اکرم ﷺ کی ابتدائی زندگی انتہائی شرافت و نجابت کے ساتھ گزری، گو کہ اللہ عزوجل نے آپ کو معصوم اور منزہ و مبرا بنایا مگر پھر بھی آپ کی خاندانی شرافت آپ کی تربیت میں کارفرما رہی، لہو و لعب اور کھیل تماشوں سے دوری، اوباش بچوں سے کنارہ کشی اور مخرب اخلاق باتوں سے اجتناب بچپن ہی سے رہا۔

تعلیم:

زندگی کی پر پیچ منزلوں میں کثیر مقامات ایسے آتے ہیں جہاں ان گنت سوالات انسان پر اس کی کامیابی کے راستے مشکوک کر دیتے ہیں، ایسی صورت میں ایک عام سادہ لوح انسان نامراد ہو جاتا ہے اور بسا اوقات کامیابی قدم دو قدم پر ہوتی ہے مگر انسان درست فکر اور اچھی سمجھ کی کمی کے باعث ایسے مواقع ہاتھ سے گنوا دیتا ہے، اسی مقام پر تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اگر تعلیم نہ ہو تو کامیابی کا دامن تنگ ہوتا چلا جاتا ہے اور کبھی کامیابی دفعتاً ہاتھ آ کر بھی پھسل جاتی ہے، حضور پر نور علیہ الصلوۃ والسلام اللہ کریم کے پڑھائے ہوئے تھے، جہاں تعلیم اس معیار کی ہو وہاں زندگی کے ہر دشوار گزار مرحلوں کا حل بھی موجود ہوگا یہی وجہ ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کے ارشادات اور عملی پیغامات میں دنیاوی کامیابیوں کا خزانہ موجود ہے، آقائے کریم ﷺ کی مکمل حیات طیبہ میں متعدد واقعات دیکھنے میں آئے جہاں آپ کی عقل، تدبیر اور آپ کے دانشمندانہ فیصلوں نے باد مخالف کی آندھیوں میں درست راہوں کا تعین کیا، صلح حدیبیہ اس کی واضح مثال ہے۔

عبادت:

چڑھتی عمر کے ساتھ ہی اگر انسان کا تعلق اپنے خالق و مالک سے گہرا ہونے لگے تو اس کی روحانی قوت میں اضافہ ہونے لگتا ہے، یہی قوت اس کی تقویم فکر اور مزاج کی پاکیزگی میں مؤثر ہوتی ہے، دل صاف ہوتا ہے تو دماغ بھی روشن ہو جاتا ہے، قوت فیصلہ زبردست ہو جاتی ہے، کہنے اور سوچنے میں صفائی ستھرائی، ہمت و جرأت، حق گوئی و بے باکی اور بلند ہمتی پیدا ہوتی ہے، دھیرے دھیرے دنیاوی کدورتوں سے نفرت اور فکر کی گندگیوں سے دل و دماغ صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال لانا کہ عبادت میں اشتغال سے محض اخروی فائدہ ہوتا ہے خیال خام ہے، دیکھا نہیں کہ مقربین بارگاہ جس طرح روحانی کیفیتوں سے سرشار ہو کر مست و الست رہتے ایسے ہی ان کے دنیاوی مسائل میں کلیر (Clear)، ڈاؤٹ لیس (Doubtless) اور اسٹریٹ فارورڈ (straight forward) ہونے میں ان کا کوئی ہمسر نہ ہوتا، ظاہر ہے ایں و آں (this& that) کے جھمیلوں میں الجھے ہوئے لوگ ایک طرف اور دوسری طرف وہ گروہ محبوباں جن کے دل پر رب کی طرف سے الہامات ہوں تو اصابت رائے، محکم لائحہ عمل اور تدبیر و تدبر میں دونوں میں یکسانیت کا کیا ہی تصور ہو گا۔

اس لیے انسان سن شعور سے ہی عبادت کا عادی ہو اور جوانی کی ابتدا سے عبادت کے لیے مخصوص ایام مثلاً اعتکاف وغیرہ میں خود کو وقف کر دے، یہ اس کے ذہن و قلب کیلیے کیمیا ہے، تعلیم اور تربیت پھر عبادت کی مشغولیت سے جب تقویم فکر ہو جائے اب وہ اپنی ظاہری و باطنی قوت فکری کے ساتھ دنیاوی اغراض کی طرف اقدام کرے گا تو حصول مراد کی راہوں میں کوئی مشکل حائل نہ ہو گی، نبیٔ اکرم ﷺ نے اوائل عمری سے ہی عبادت کے لیے اوقات مختص فرما لیے، معمولی توشہ ساتھ لیتے اور پہاڑیوں میں محو عبادت ہو جاتے، گھنٹوں مراقبہ جاری رہتا، مگر ایسا نہیں تھا کہ عائلی زندگی ترک کر دی تھی، سارے حقوق باحسن وجوہ ادا فرماتے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنھا نکاح میں تھیں، ریاضت و عبادت، مراقبہ و وظائف کے ساتھ معاشرت، تجارت و دیگر عائلی ضروریات کو بھی بخوبی ادا فرماتے۔

تجارت:

کسب معاش دنیاوی ضرورتوں میں سب سے اہم ہے، اس کا تعلق پیسہ کمانے اور خرچ کرنے دونوں سے ہے، اس کا سب سے رذیل درجہ مزدوری ہے، خود مزدور نہیں چاہتا کہ مزدوری کرے، اسی سے مزدوری کی دقتوں کا

اندازہ کرسکتے ہیں، اس لیے عام رجحان تجارت اور سیلس (Sells) کا ہوتا ہے، تجارت کے لیے خود اعتمادی اور صبر و برداشت کی قوت بھرپور ہونی چاہیے، سستی کاہلی، تعفال اور اعذار سے کام آگے نہیں بڑھتا، حضور اکرم ﷺ کا طرز تجارت ملاحظہ کریں کہ کس طرح آپ نے مکہ و مدینہ میں رہ کر کاروبار جاری رکھا اور تجارت کی غرض سے بلاد شام کے اسفار بھی فرمائے۔

تجارت کی کامیابی بھی متذکرہ بالا اصولوں میں تعلیم و تربیت پر منحصر ہے، جب سودے کی صحیح جانکاری اور بازار کے اتار چڑھاؤ کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہو اور پھر انسان کی اپنی بول چال اور معاملات میں صفائی ستھرائی ہو تو کسٹمرز کا اطمینان آپ پر ہو جاتا ہے، اور جب ایک کامیاب تجارت چل پڑتی ہے تو کسی قدر عائلی زندگی پر سکون ہو جاتی ہے جس سے دوسرے معمولات زندگی بھی اپنی معتدل صورت حال پر بآسانی جاری رہتے ہیں، اہل و عیال کی ضرورتیں پوری رہتی ہیں، احباب و متعلقین کی حسب ضرورت مدد ہو جاتی ہے، صلاح و فلاح کے مصارف میں بھی ہاتھ تنگ نہیں ہوتے، حاصل یہ کہ جب دولت دین داری کے ساتھ آتی ہے تو اس کا کل خیر ہی خیر ہوتا ہے .

اقتصاد امر:

حدیث میں آیا: ﴿لو كانَ لابنِ آدَمَ واديانِ مِن مالٍ لابتَغى واديًا ثالِثًا، ولا يَملأُ جَوفَ ابنِ آدَمَ إلَّا التُّرابُ﴾(2)

بنی آدم کے پاس دو وادیاں مال کی ہوں پھر بھی وہ تیسری کی خواہش کرے گا اور بنی آدم کا پیٹ مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

اور ایک جگہ ارشاد ہوا

﴿لا يَزَالُ قلبُ الكبيرِ شابًّا في اثنتينِ في حُبِّ الدنيا وطُولِ الأَمَل﴾

انسان کا دل دو باتوں پر جوان ہوتا ہے، دنیا کی محبت اور لمبی آرزوئیں، مطلب یہ کہ انسان ایک، خواہشات انیک جتنی حیثیت نہیں اس سے مہنگا لائف اسٹائل انسان پر اس کا معاشی دائرہ تنگ کر دیتا ہے، اس لیے لازم ہے کہ معاش میں درمیانی معاملہ اختیار کرے۔ نہ اتنا اسراف (فضول خرچی) ہو کہ بعد کو ضروری وسائل بھی میسر نہ ہوں، نہ ہی اتنی تنگ دلی ہو کہ اپنی مناسب بود و باش اتنی دشوار کر لے جس کے سبب ذہنی و طبعی تناؤ کی کیفیت

رونما ہو جائے اور اس کی ہر خوشی اس پر حرام ہو جائے، راتیں بے آرامی میں اور دن جمع اندوزی میں گزر جائیں، بخل اور اسراف دونوں اگرچہ باہم ضد ہیں مگر دونوں کے نتیجے میں انسان کے اندر طول امل اور حرص جیسی عیب دار بیماری کا لاحقہ ہوتا ہے جو انسان کو ہر شعبے میں ذلت کی جگہوں پر لا کھڑا کرتا ہے ۔

حضور نبیٔ اکرم ﷺ سراپا جود و سخا تھے مگر اسراف ہر گز نہ فرماتے، معاملات میں میانہ روی ہوتی، رہن سہن ایک مناسب انداز پر ہوتا، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کو یہی تلقین بھی فرماتے، حدیث میں آیا:

﴿قال النبی ﷺ الإقتصاد فی النفقة نصف المعیشة﴾

خرچ کرنے میں درمیانی معاملہ اختیار کرنا نصف معیشت ہے۔

یعنی معاش میں کمانا اور خرچ کرنا دونوں ہے، لیکن خرچ کرنے میں جس نے میانہ روی اختیار کر لی بس اتنے سے اس کی فائننشیل پرابلم (Financial Problem) پچاس پرسنٹ (Solved) حل ہو گئی۔

قرآن حکیم میں مومنوں کی کوالیٹی بتائی گئی، ارشاد ہوا

﴿والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا﴾(3)

اور وہ (ایمان والے) جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے اور نہ ہی بخل کرتے ہیں۔

لہٰذا کامیاب شخص کا یہی کام ہوا کہ وہ کھانے پینے پر، پہناوے پر، صلاح و فلاح کے کاموں میں اور خود اپنے تجارتی سودوں میں اقتصاد فی الأمر کا معاملہ رکھے۔

حسن معاشرت:

یہ تھوڑی طویل بات ہے، دیکھیے! آج کل یہ طرز زندگی عام ہو چکا ہے کہ ایک اچھا کاروبار ہو، پر تعیش رہائش ہو، سکون کی لائف ہو، کام پر جانا، گھر آنا، باہر چھٹیاں منانا، نہ کسی سے الجھنا نہ کسی جھمیلے میں پڑنا، سماج میں کیا چل رہا ہے، گھر خاندان کے کیا احوال ہیں، سب سے خود کو کنارہ کش کر لینا، بس اپنی تسکین کا سامان کرنا، یہ کامیابی نہیں ہے، دنیا میں دنیا والوں کیلیے کچھ نہ کر سکے تو آپ کی زندگی بے معنیٰ ہے، اگر حالات کبھی سازگار نہ رہیں تو ایسے شخص کے لیے موافق زمین اور مناسب افراد بر وقت ملنا مشکل ترین ہو جاتا ہے۔ سماج سے کٹ کر رہنا بہت سی خرابیاں لاتا ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿علیکم بالجماعۃ﴾ یعنی جماعت کو لازم پکڑو۔

اس کے کئی فائدے ہیں، اپنے سماج کے ساتھ رہنے میں ہر طریقے کے فتنے سے عافیت ہے، کسی غیر مہذب عمل سے پہلے اپنے بھائی بند ھو کا لحاظ ہوتا ہے، معاشرے کا ڈر ہوتا ہے جو اسے کھلی بے حیائی اور بہت ساری بے راہ روی سے بچاتا ہے، کئی دفعہ ناگہانی حوادثات میں ٹولے، محلے اور گاؤں سماج کے سپورٹ ہونے سے سہولت ہو جاتی ہے، گھر خاندان کے لوگ آس پاس ہوتے ہیں، وداد و محبت کی فضا ہوتی ہے، نسلوں میں دینی و اخلاقی روایات باقی رہتی ہیں، ان ہی وجوہات کی بنا پر انسان کی کامیاب زندگی کے لیے حسن معاشرت بہت ضروری پہلو بن جاتا ہے، آقائے کریم ﷺ اپنے آل و اصحاب سے میل ملاپ رکھتے، ان کے سکھ دکھ میں شریک ہوتے، ان پر سخاوت بھی فرماتے اور ان سے ہدایا بھی قبول فرماتے، سماج کے ہر طبقے سے اس کی قدر کے مطابق پیش آتے، چھوٹے بچوں سے بھی اپنائیت کا اظہار فرماتے، کبھی مجلس طول ہو جاتی تو باوجود گراں گزرنے کے آپ تحمل سے تشریف رکھتے، صحابۂ کرام کو بھی ان ہی باتوں کی تعلیم و تلقین کرتے، فرمایا:

﴿صِلْ من قطعك، وأعط من حرمك، واعف عمن ظلمك﴾

جو تم سے تعلق ختم کرے تم اس سے جوڑو، جو تم سے مال روکے تم اسے عطا کرو، جو تم پر زیادتی سے پیش آئے تم اسے درگزر کرو۔

غرضیکہ حسن معاشرت اور عمدہ اخلاق و عادات، سماج سے انسان کا جڑاؤ، سچے انسانی جذبے کے ساتھ اپنوں کی فکر اور ان کی چارہ جوئی کرنا ایک کامیاب زندگی کا وہ حصّہ ہے جو دنیا سے جانے کے بعد بھی نتیجہ خیز رہتا ہے، خوشحالی مقدر ہوتی ہے، رزق میں برکت ہوتی ہے، حدیث پاک میں ہے:

﴿من احب ان یبسط له فی رزقه و ینسأ له فی اثره فلیصل رحمه﴾ (4)

جو چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

صحت و فراغ:

کامیاب زندگی کے لیے ایک عمدہ روٹین ہونا ضروری ہے، وقت کے صحیح استعمال اور روزمرہ کے کاموں کے لیے ایک معتدل شیڈول ہونا چاہیے اور ان سب ٹاسکس Tasks کو مینٹین کرنے کے لیے ذہنی و جسمانی ہر طرح

سے صحت مند طبعیت کا ہونا بھی لازم ہے، وقت کا ضیاع اور بسا اوقات جسمانی ضعف باصلاحیت اور ذی استعداد شخص کو بھی ناکام بنا دیتے ہیں، انسانی زندگی میں ان دو بڑی مصیبتوں سے ہر کس و ناکس دوچار ہو رہا ہے، نبی پاک ﷺ نے اسی بابت ارشاد فرمایا

﴿نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس الصحة و الفراغ﴾(5)

صحت اور فراغ (ہر کام کے لیے اس کا مناسب وقت نکالنا) دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اکثر لوگ اس میں خسارے میں ہیں۔

آقائے دو جہاں ﷺ وفود سے ملاقات بھی فرماتے، عبادتوں کے لیے بھی وقت نکالتے، کثرت ازواج کے باوجود ان کے مابین عدل کا معاملہ رکھتے، جہاد میں تشریف لے جاتے، بازار سے خرید و فروخت اور گھر کے دیگر امور بھی از خود انجام دیتے، کھانے پینے میں صحت مند غذائیں مناسب مقدار میں پسند فرماتے، غرضیکہ ہر کام ان کے وقتوں میں انجام دیتے۔

حقوق کی ادائیگی:

کامیاب انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی لائف میں Unnecessary disturbance (غیر ضروری پریشانی کا بوجھ) نہ رہے، اور اس کے لیے لازم ہے کہ جو حقوق بھی اس سے متعلق ہیں سب کی پاسداری رکھے اور بروقت ادائیگی کرتا رہے، جسم سے متعلق حقوق، اہل و عیال سے متعلق ضروری ذمہ داریاں، اپنے پیشے اور کاروبار سے دیانت، دوست و احباب سے ان کے مراسم کا بھرپور خیال رکھے، اگر لوگوں کے معاملات حسب موافق درست نہ رکھے تو غلط فہمیاں بڑھتی ہیں پھر غیر ضروری بحثیں اور لایعنی الجھنیں زندگی کو بوکس بنا دیتی ہیں، کام سے فوکس ہٹ جاتا ہے، اچھا بھلا آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے، معمولی معمولی باتیں اہم سے اہم مقاصد کے آڑے آ جاتی ہیں، کبھی کبھی زبان کا بے قابو ہو جانا بھی اس قسم کی اڑچنوں کا سبب بن جاتا ہے، زبان پر کنٹرول نہیں ہوتا، بے ضرورت جہاں جو دل آیا بس بول دیا یا کسی عامی نے کچھ کہہ دیا اس پر بپھر گئے، اپنا وقار بھی گیا، لوگوں میں اعتماد بھی کھویا اور بنی بنائی ہوا ناموافق ہو گئی، اس لیے کامیاب انسان کے لیے سوچ سمجھ کر کلام کرنا اور الفاظ سے

لیکر لہجے کی ادائیگی تک حد درجے کی احتیاط رکھنا از حد ضروری ہے، نبی پاک ﷺ نے حفظ لسان پر بڑی تاکید فرمائی، حدیث میں ہے:

﴿من يضمن لی ما بين لحييه و ما بين رجليه اضمن له الجنة﴾

جو مجھے ہونٹوں کے درمیان (زبان) اور پیروں کے درمیان (پاکدامنی) کی ضمانت دے تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں ۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ﴿ما النجاة؟﴾ نجات کیا ہے فرمایا ﴿امسك عليك لسانك﴾ اپنی زبان پر قابو رکھو ۔

لایعنی اور غیر ضروری باتوں کا نہ کہنا ہی بہتر ہے حدیث میں ہے:

﴿من حسن اسلام المرء ترکه ما لا يعنيه﴾(6)

انسان کے اچھے ایمان کی نشانی یہ ہیکہ وہ غیر ضروری چیزوں کو ترک کردے۔

آقائے کریم علیہ الصلاۃ والسلام قدرے اطمینان کے ساتھ سارے حقوق کی ادائیگی فرماتے، لایعنی چیزوں کو نظر انداز کرتے، کوئی نازیبا بات ہوتی تو صبر و تحمل کا مظاہرہ فرماتے، مختلف حقوق اور گوناگوں مصروفیات اور مسائل کے باوجود چہرۂ مبارک تبسم ریز رہتا۔

صحیح معنوں میں ایک کامیاب دنیاوی زندگی اسلامی زندگی ہے، جس میں شرع نے سارا نظام پہلے سے مقرر رکھا ہے، کب اٹھنا ہے کب سونا ہے، فرائض سے لیکر واجبات و مستحبات اور روز مرہ کے آداب تک شریعت نے بتا دیے ہیں، ان کا پریکٹیکل بھی عہد نبوی سے لیکر اب تک بزرگان دین سے ہم تک پہنچتا آیا ہے۔ مگر صد حیف ہم سیرت طیبہ کے حسین گوشوں کا مطالعہ کرنے اور ان سے اپنی زندگی کی پیچیدہ الجھنوں کو سلجھانے کی بجائے ماڈرن زمانے کے موٹیویشنل پوڈکاسٹ اور ہماری فیڈس میں دکھائے جانے والے بے ڈھنگے کوٹس کو کامیاب زندگی کے رہنما اصول مان بیٹھتے ہیں، کوئی ترک دنیا کا لیکچر دیتا ہے تو ہم آدھے ادھورے صوفی بننے کا وظیفہ شروع کر دیتے ہیں اور کوئی مذہبی شدت پسندی کا حوالہ دے کر دینی اخلاق و تربیت پر تنقید کرتا ہے تو ہم پر ماڈرنٹی کا بھوت سوار ہو جاتا ہے، جبکہ سیرت پاک سے ہمیں دین و دنیا سنوارنے کے وہ سارے سامان مہیا ہوئے

جس پر عمل بندی ہمیں دونوں جہان میں سرخرو اور بامراد کر دے گی، فوز و فلاح کا واحد راستہ حضور پاک صاحب لولاک علیہ الصلوۃ والسلام کی قولی و فعلی تربیت کو اپنانے میں ہے۔

جب عذاب نار کی وعیدیں نازم ہوئیں تو چند صحابہ نے عہد کیا کہ وہ ترک دنیا کر دیں گے، گھر بار، بیوی بچے سب کچھ چھوڑ کر صرف عبادت میں مصروف ہو جائیں گے، جب اس کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو ہوئی آپ نے طلب کیا اور فرمایا کہ "میں نماز بھی پڑھتا ہوں، شادیاں بھی کرتا ہوں، تجارت بھی کرتا ہوں۔

سیرت طیبہ کے ان حسین پہلوؤں سے معلوم ہوا کہ زندگی گزارنے کا ایک بیلنسڈ (Balanced) اور معتدل نظام ہونا چاہیے، دنیا کی حرص میں دین کے واجبی امور کی بجا آوری میں کوئی تساہل نہ ہو اسی طرح اعمال حسنہ کے نام پر اتنا غلو نہ کیا جائے کہ ضروری دنیاوی حقوق کی ادائیگی کما حقہ نہ ہو سکے کہ اس قدر حقوق بھی دین کا ہی حصّہ ہیں۔

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مصادر و مراجع

(الأحزاب

(بخاری شریف

(الفرقان-67

(بخاری

(بخاری

(ترمذی

سیرت اور خاندان

والدین کی خدمت: قرآن و سنت کی روشنی میں

محمد فداء المصطفی قادری، دارالھدیٰ اسلامک یونیورسٹی کیرلا

اسلام وہ کامل اور آفاقی دین ہے جس نے انسانی زندگی کے ہر گوشے کو اعتدال، رحمت، عدل اور حسنِ اخلاق کے ایسے لازوال اصول عطا کیے ہیں جن کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہی پاکیزہ تعلیمات میں والدین کے حقوق اور ان کی خدمت کو ایک ایسا بلند مقام عطا کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم نے حقِ توحید کے فوراً بعد حقِ والدین کا ذکر فرمایا، اور رسولِ اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے والدین کی رضا کو رضائے الٰہی اور ان کی ناراضی کو ناراضیِ الٰہی کا سبب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں والدین کی خدمت محض ایک سماجی ذمہ داری نہیں بلکہ عظیم عبادت، اعلیٰ اخلاق، کامل ایمان اور جنت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

والدین وہ عظیم محسن ہیں جن کی بے لوث محبت، بے مثال قربانی، مسلسل محنت اور شب و روز کی دعاؤں نے اولاد کے وجود کو سنوارا، اس کی شخصیت کو نکھارا اور اس کے مستقبل کو روشن کیا۔ ماں اپنی آغوش میں محبت، ایثار اور شفقت کی ایسی لازوال داستان رقم کرتی ہے جس کا کوئی بدل نہیں، جبکہ باپ اپنی محنت، فکر اور ذمہ داری کے ذریعے اولاد کے لیے زندگی کی آسائشیں فراہم کرتا ہے۔ یہی وہ دو عظیم ہستیاں ہیں جن کے احسانات کا پورا بدلہ ادا کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

قرآنِ مجید، احادیثِ طیبہ، آثارِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اقوالِ تابعین، ائمۂ مجتہدین اور سلفِ صالحین کی تعلیمات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جس معاشرے میں والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت کو فروغ دیا جاتا ہے، وہاں رحمت، محبت، برکت اور سکون کا نزول ہوتا ہے، اور جہاں والدین کی ناقدری عام ہو جائے، وہاں بے برکتی، بے سکونی اور اخلاقی زوال جنم لیتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں قرآنِ حکیم، سنتِ نبوی ﷺ اور اسلافِ امت کی تعلیمات کی روشنی میں والدین کی عظمت، ان کے حقوق، ان کی خدمت کی فضیلت اور والدین و اولاد کی باہمی ذمہ داریوں کا اختصار کے ساتھ جامع جائزہ پیش کیا جائے گا، تاکہ ہمارے دلوں میں والدین کی محبت، احترام اور خدمت کا جذبہ مزید راسخ ہو اور ہمارے گھروں میں اسلامی معاشرت کی حقیقی روح دوبارہ زندہ ہو سکے۔

اسلام نے والدین کے مقام و مرتبہ کو جس انداز سے بیان کیا ہے، اس کی نظیر کسی اور نظامِ حیات میں نہیں ملتی۔ قرآنِ مجید نے مختلف مقامات پر والدین کی عظمت، ان کے حقوق، ان کی خدمت، اطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو نہایت مؤثر انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ والدین کی خدمت صرف ایک اخلاقی ذمہ داری نہیں بلکہ ایک عظیم عبادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

پہلی بات: قرآنِ کریم نے توحید کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾(1)

ترجمہ: "اور تمہارے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بہترین سلوک کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں 'اُف' تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑکو، بلکہ ان سے نہایت احترام کے ساتھ گفتگو کرو، اور شفقت کے ساتھ ان کے سامنے عاجزی کا بازو جھکائے رکھو، اور یوں دعا کرو: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔"

یہ آیت والدین کے مقام و مرتبہ کو واضح کرنے والی جامع ترین آیات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے فوراً بعد والدین کے ساتھ احسان کا حکم دے کر یہ واضح کر دیا کہ بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ مزید یہ کہ صرف خدمت ہی کافی نہیں بلکہ ان کے سامنے آواز، لہجہ، گفتگو، طرزِ عمل اور دل کے جذبات

تک میں ادب واحترام مطلوب ہے۔ یہاں تک کہ "اُف" جیسا معمولی کلمہ کہنے سے بھی منع فرمایا گیا، تاکہ اولاد ہر اس رویے سے بچے جو والدین کی دل آزاری کا سبب بنے۔

دوسری بات: قرآنِ مجید نے والدین کے شکر کو اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ ذکر فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾(2)

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی۔ اس کی ماں نے اسے کمزوری پر کمزوری اٹھا کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔ لہٰذا میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی، آخرکار تمہیں میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر کے ساتھ والدین کے احسانات کا شکر ادا کرنے کا بھی حکم دیا۔ خصوصیت کے ساتھ ماں کی قربانیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ حمل، ولادت اور رضاعت کی مشقتیں وہی برداشت کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کے احسانات کو یاد رکھنا، ان کی قدر کرنا اور زندگی بھر ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنا ایک مومن کی شان ہے۔

تیسری بات: قرآنِ کریم نے ہر حال میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾(3)

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

یہ مختصر مگر نہایت جامع آیت اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کسی خاص وقت یا حالت تک محدود نہیں۔ ان کی خوشی، بیماری، کمزوری، بڑھاپے اور ہر مرحلے میں ان کے ساتھ محبت، نرمی، ادب اور خدمت کا رویہ اختیار کرنا ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ یہی حسنِ سلوک خاندان کی مضبوطی اور معاشرے کی خوش حالی کا سبب بنتا ہے۔

چوتھی بات: قرآنِ مجید نے غیر مسلم والدین کے ساتھ بھی حسنِ معاشرت کا حکم دیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾(4)

ترجمہ: اور اگر وہ تم پر زور دیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، جس کا تمہیں کوئی علم نہیں، تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کرو، البتہ دنیا میں ان کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو۔

اسلام کا حسنِ اخلاق یہی ہے کہ اگر والدین ایمان نہ لائے ہوں، تب بھی ان کے ساتھ ادب، احترام، خدمت اور حسنِ معاشرت کا حکم برقرار رہتا ہے۔ البتہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دیں تو اس میں ان کی اطاعت نہیں ہوگی، لیکن اس اختلاف کی وجہ سے بھی ان کے حقوق میں کوئی کمی نہیں آنے دی جائے گی۔

پانچویں بات: قرآنِ کریم نے عبادتِ الٰہی کے ساتھ والدین کے ساتھ احسان کو لازم قرار دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾(5)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ بہترین سلوک کرو۔

اس آیتِ مبارکہ میں ایک مرتبہ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ والدین کے ساتھ احسان کا ذکر فرمایا۔ اس تکرار سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت، ان کی عزت، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کو بے حد محبوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس گھر میں والدین کی عزت کی جاتی ہے، وہاں سکون، محبت، رحمت اور برکت اپنا ڈیرہ ڈال دیتی ہے۔

قرآنِ مجید کی ان مبارک تعلیمات سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ والدین کی خدمت محض ایک معاشرتی روایت نہیں بلکہ ایک عظیم دینی فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے ساتھ والدین کے حق کو بیان کر کے ان کی عظمت کو ہمیشہ کے لیے واضح فرما دیا۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت و توقیر، خدمت، اطاعت اور دلجوئی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے، کیونکہ انہی کی رضا میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور انہی کی خدمت میں دنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی پوشیدہ ہے۔

قرآنِ مجید نے والدین کے بلند مقام، ان کے عظیم حقوق اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی نہایت جامع تعلیمات عطا فرمائی ہیں۔ اب آیئے، ان قرآنی ہدایات کے بعد ہم رسولِ اکرم ﷺ کی مبارک احادیث کی روشنی میں والدین کی عظمت، ان کی خدمت کی فضیلت اور ان کے حقوق کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم کے احکام کی بہترین تشریح اور عملی تفسیر ذاتِ اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور ارشاداتِ مبارکہ ہی ہیں۔ چنانچہ نبیِ کریم ﷺ نے اپنے فرامین کے ذریعے یہ واضح فرمایا کہ والدین کی خدمت محض ایک اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا، جنت کے حصول اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا عظیم ذریعہ ہے۔

پہلی بات: والدین کی رضا میں اللہ تعالیٰ کی رضا پوشیدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿رِضَا الرَّبِّ فِي رِضَا الْوَالِدِ، وَسَخَطُ الرَّبِّ فِي سَخَطِ الْوَالِدِ﴾(6)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رضا والد کے راضی ہونے میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی والد کے ناراض ہونے میں ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین، خصوصاً والد کی خوشنودی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ جو شخص اپنے والدین کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، جبکہ ان کی دل آزاری انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کے قریب کر دیتی ہے۔

دوسری بات: والدین کی خدمت جنت میں داخلے کا عظیم ذریعہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿رَغِمَ أَنْفُهُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُهُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُهُ. قِيلَ: مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا، ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ﴾(7)

ترجمہ: وہ شخص ذلیل و خوار ہو، پھر ذلیل و خوار ہو، پھر ذلیل و خوار ہو۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کون؟ فرمایا: وہ شخص جس نے اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر بھی ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کر سکا۔

بڑھاپا والدین کی زندگی کا سب سے نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اس وقت انہیں اولاد کی محبت، خدمت اور توجہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص اس سنہری موقع کو ضائع کر دیتا ہے، وہ حقیقت میں بہت بڑی سعادت سے محروم رہ جاتا ہے۔

تیسری بات: والدہ کی خدمت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا:

﴿يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ: أُمُّكَ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أَبُوكَ﴾(8)

ترجمہ: یارسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تمہاری ماں۔ پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تمہاری ماں۔ پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تمہارا باپ۔"

اس حدیث میں تین مرتبہ ماں کا ذکر کر کے اس کی عظیم قربانیوں اور بے مثال احسانات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، جبکہ چوتھے درجے میں باپ کا ذکر کر کے اس کے مقام و مرتبہ کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

چوتھی بات: والدین کی خدمت جہاد سے بھی افضل ہو سکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا:

﴿أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ﴾(9)

ترجمہ: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر انہی کی خدمت میں اپنا جہاد کرو۔

اس سے والدین کی خدمت کی عظمت اور اس کے بے مثال اجر کا اندازہ ہوتا ہے۔

پانچویں بات: والد جنت کے بہترین دروازوں میں سے ایک ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿الْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَإِنْ شِئْتَ فَأَضِعْ ذَلِكَ الْبَابَ، أَوِ احْفَظْهُ﴾(10)

ترجمہ: والد جنت کے درمیانی (بہترین) دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، اب تم چاہو تو اس دروازے کو ضائع کر دو، اور چاہو تو اس کی حفاظت کرو۔

اس حدیثِ مبارکہ میں والد کی رضا اور خدمت کو جنت کے عظیم دروازے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص اپنے والد کا احترام کرتا، اس کی خدمت کرتا اور اسے راضی رکھتا ہے، وہ جنت کے ایک عظیم دروازے کو اپنے لیے کھلا رکھتا ہے۔

احادیثِ نبوی ﷺ کا مطالعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ والدین کی خدمت محض اخلاقی تقاضا نہیں بلکہ ایمان کی علامت، اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ، جنت کے حصول کا بہترین راستہ اور دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ والدین کی عزت، خدمت، اطاعت اور دلجوئی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے، کیونکہ یہی تعلیمِ نبوی ﷺ کا تقاضا اور سعادت مند بندوں کا طریقہ ہے۔

قرآنِ مجید نے والدین کے حقوق کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا اور رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ کے ذریعے ان حقوق کی مزید وضاحت فرمائی۔

اب آیئے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین اور سلفِ صالحین کی مبارک زندگیوں کی روشنی میں والدین کی عظمت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ یہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جنہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی عملی زندگی میں ڈھال کر امت کے لیے بہترین نمونہ پیش فرمایا۔

پہلی بات: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے والدین کی خدمت کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں والدین کی محبت، خدمت اور ادب سے عبارت تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی والدہ کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر بیت اللہ کا طواف کرایا ہے، کیا میں نے ان کا حق ادا کر دیا؟ آپ نے فرمایا: "نہیں، تم ان کے دردِ زہ کی ایک آہ کا بھی بدلہ ادا نہیں کر سکے۔(11)

یہ واقعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ والدین، خصوصاً ماں کے احسانات اتنے عظیم ہیں کہ انسان زندگی بھر خدمت کرتا رہے، تب بھی ان کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا۔

دوسری بات: تابعین نے والدین کی خدمت کو عبادت اور قبولیتِ دعا کا ذریعہ سمجھا۔ تابعین کی زندگیوں میں حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ کا نام نمایاں ہے۔ وہ اپنی والدہ کی خدمت میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ اسی خدمت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی ظاہری زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، لیکن ان کی والدہ کی خدمت نے انہیں ایسا بلند مقام عطا کیا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اگر اویس قرنی سے ملاقات ہو تو ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا۔(12)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلوص کے ساتھ والدین کی خدمت انسان کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی بلند مقام عطا کرتی ہے۔

تیسری بات: ائمۂ مجتہدین نے والدین کے احترام کو علم کی برکت کا راز قرار دیا۔ ائمۂ مجتہدین نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ علم کے ساتھ ادب بھی ضروری ہے، اور سب سے پہلے والدین کا ادب سیکھنا چاہیے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنی والدہ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ اگر کسی مسئلے میں انہیں اطمینان نہ ہوتا تو باوجود خود عظیم فقیہ ہونے کے، انہیں اس عالم کے پاس لے جاتے جس پر ان کی والدہ کو اعتماد تھا۔ اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم انسان کو عاجزی، انکساری اور والدین کی اطاعت سکھاتا ہے، نہ کہ تکبر اور خود پسندی۔

چوتھی بات: سلفِ صالحین والدین کے سامنے انتہائی ادب و انکساری اختیار کرتے تھے۔ مشہور تابعی حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ جب اپنی والدہ سے گفتگو کرتے تو ان کی آواز نہایت دھیمی ہو جاتی اور آپ کا لہجہ اس قدر نرم ہوتا گویا ایک عاجز غلام اپنے آقا سے بات کر رہا ہو۔(13)

ان کا یہ طرزِ عمل اس قرآنی تعلیم کی عملی تفسیر تھا کہ والدین کے سامنے عاجزی کے بازو جھکائے رکھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کا احترام صرف خدمت تک محدود نہیں بلکہ گفتگو، لہجے اور اندازِ معاشرت میں بھی نمایاں ہونا چاہیے۔

پانچویں بات: اولیائے کرام کی عظمت کے پیچھے والدین کی تربیت اور دعاؤں کا بڑا کردار تھا۔ اولیائے کرام کی زندگیاں اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ والدین کی تربیت انسان کی شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ جب حصولِ علم کے لیے بغداد روانہ ہوئے تو ان کی والدہ نے انہیں سچائی کی نصیحت فرمائی۔ آپ نے پوری زندگی اس نصیحت کو مضبوطی سے تھامے رکھا، یہاں تک کہ ایک موقع پر ڈاکوؤں کے سامنے بھی سچ بول دیا، جس کے نتیجے میں ان ڈاکوؤں کی توبہ کا سبب بنے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی مخلصانہ تربیت اور دعائیں اولاد کو عظمت و ولایت کے بلند مقام تک پہنچا سکتی ہیں۔

صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین اور سلفِ صالحین کی مبارک زندگیاں اس حقیقت کا واضح اعلان کرتی ہیں کہ والدین کی خدمت محض ایک اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ انبیاء و صالحین کا مبارک طریقہ ہے۔ انہی مقدس ہستیوں نے اپنے کردار سے امت کو یہ پیغام دیا کہ علم کی برکت، عبادت کی قبولیت، اخلاق کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے والدین کا ادب کرنے والا، ان کا فرمانبردار اور ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھنے والا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ والدین اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت اور ان کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ قرآنِ مجید نے ان کے حقوق کو اپنے حق کے ساتھ بیان فرمایا، رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی خدمت کو جنت کا راستہ قرار دیا، اور صحابۂ کرام، تابعین، ائمۂ مجتہدین اور سلفِ صالحین نے اپنی عملی زندگی سے اس کی بہترین مثال قائم کی۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت، خدمت، اطاعت اور دلجوئی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے، جبکہ والدین بھی اپنی اولاد کی دینی، اخلاقی اور فکری تربیت محبت، حکمت اور اعتدال کے ساتھ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں والدین کے حقوق ادا کرنے، ان کی دعائیں حاصل کرنے اور ان کی رضا کے ذریعے اپنی رضا نصیب فرمانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مصادر و مراجع

(1) سورۃ الإسراء:23-24

(2) سورۃ لقمان:14

(3) سورۃ العنکبوت:8

(4) سورۃ لقمان:15

(5) سورۃ النساء:36

(6) جامع الترمذی، حدیث:1899

(7) صحیح مسلم، حدیث:2551

(8) صحیح البخاری، حدیث:5971، صحیح مسلم، حدیث:2548

(9) صحیح البخاری، حدیث:3004

(10) جامع الترمذی، حدیث:1900، سنن ابن ماجہ، حدیث:3663

(11) الأدب المفرد للإمام البخاری

(12) صحیح مسلم، حدیث:2542

(13) الأدب المفرد للإمام البخاری

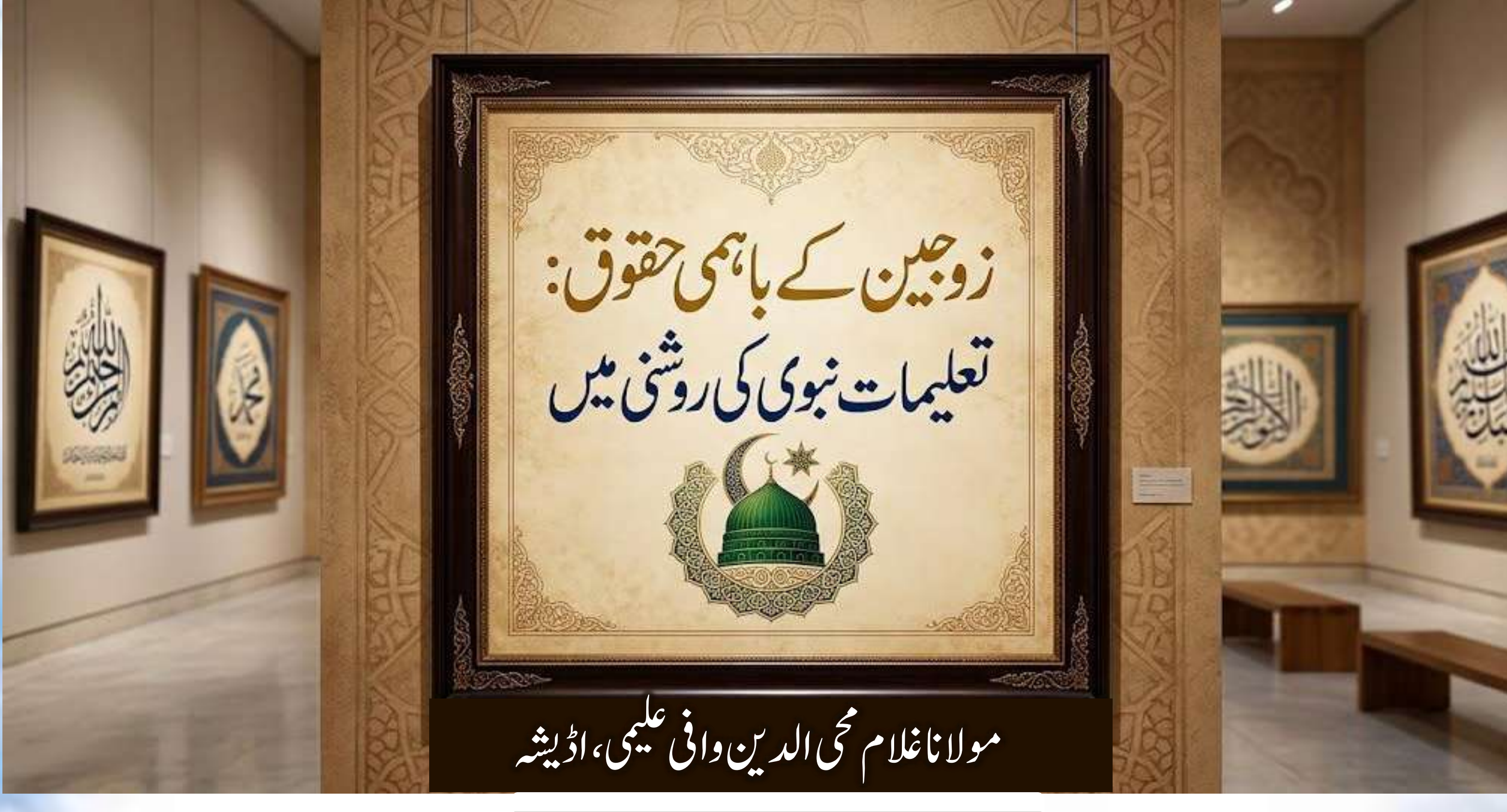

رب کریم کا بے بہا شکر و احسان ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان بنایا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں زندگی گزارنے کے لیے بہترین دستور عمل عطا کیا، زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فرمائی۔ ایک انسان اپنی زندگی کو کس طرح خوشگوار بنا سکتا ہے اس کے لیے بہترین قوانین عطا کیے۔

یہ بات یقینی ہے کہ جس گاڑی کے دو پہیے ہیں تو اس گاڑی کے آگے بڑھنے کے لیے اس کے دونوں پہیوں کا ساتھ چلنا اور ایک ہی جانب چلنا ضروری ہے ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں پہیے برابر ہوں تب ہی منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے اگر ان دونوں پہیوں میں سے کوئی ایک پہیہ رک جائے یا ایک پہیے کی مخالف سمت چلنے لگے تو گاڑی کبھی بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی اسی طرح کسی بھی خاندان کے میاں اور بیوی دو پہیے ہیں اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا مخالف ہو گیا یا دوسرے کے ساتھ چلنا گوارا نہ کیا تو وہ رشتہ منزل مقصود نہیں پا سکتا لہٰذا میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا ضروری ہے تبھی جا کر زندگی کی گاڑی چل سکتی ہے ورنہ کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ اس روئے زمین پر جتنے رشتے پائے جاتے ہیں سب کے سب اس دنیا میں ہی وجود میں آئیں مگر واحد رشتہ زوجین کا ہے جو جنت میں وجود میں آیا اللہ رب العزت نے زوجین کو ایک دوسرے کے لیے سامان راحت و سکون بنایا اور ان دونوں کو ایک دوسرے کا لباس بنایا چنانچہ معاشرے کو خوبصورت بنانے کے لیے

ضروری ہے کہ پہلے عائلی ماحول کو ساز گار بنایا جائے اسی لیے اسلام نے مرد وزن کے درمیان کچھ حقوق رکھے ہیں تا کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور حسن معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ چنانچہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَ عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴾ (1)

اور ان سے اچھا برتاؤ کرو پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالی اس میں بہت بھلائی رکھے۔

نکاح کے ذریعے زوجین کے درمیان ایک دوسرے پر جو حقوق نافذ ہوتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں پہلا شوہر کا حق بیوی پر۔ دوسر بیوی کا حق شوہر پر اور تیسرا ان دونوں کے درمیان مشترک حقوق۔ احقر زوجین کے درمیان مشترکہ حقوق کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کرے گا۔

اطاعت خداوندی میں باہمی تعاون:

کسی بھی بندے پر خاص طور سے میاں بیوی کے درمیان ضروری ہے کہ وہ دونوں اطاعت خداوندی میں ایک دوسرے کا تعاون کریں ان کے بندے پر سب سے پہلا حق اس کے رب کا ہوتا ہے اس لیے زوجین کا ایک دوسرے پر سب سے پہلا حق یہ ہے کہ دونوں حکم خداوندی کی بجا آوری میں ایک دوسرے کا تعاون کریں۔

چنانچہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نبی ﷺ کے پیچھے گدھے پر سوار تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق اپنے بندوں پر کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر کیا ہے؟" میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو اللہ اسے عذاب نہ دے۔" میں نے کہا یا رسول اللہ! کیا میں اس کی لوگوں کو بشارت نہ دے دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ صرف اسی پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں، (اور عمل کرنا چھوڑ دیں)"۔(2)

حدیث پاک میں ہے:

﴿قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا أَيْقَظَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّيَا أَوْ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ جَمِيعًا كُتِبَا فِي الذَّاكِرِينَ وَالذَّاكِرَاتِ"﴾

ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب آدمی اپنی بیوی کو رات میں جگائے اور وہ دونوں نماز پڑھیں تو وہ دونوں ذاکرین اور ذاکرات میں لکھے جاتے ہیں۔

﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّى وَأَيْقَظَ امْرَأَتَهُ، فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فِي وَجْهِهَا الْمَاءَ، رَحِمَ اللَّهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَأَيْقَظَتْ زَوْجَهَا، فَإِنْ أَبَى نَضَحَتْ فِي وَجْهِهِ الْمَاءَ﴾(3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھے اور نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی بیدار کرے، اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر نماز پڑھے اور اپنے شوہر کو بھی جگائے، اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔

سبحان اللہ اطاعت خداوندی میں باہمی تعاون کا یہ خوبصورت طریقہ اور اس کا ثمرہ مذہب اسلام ہی بتا سکتا ہے۔

لہذا زوجین کو چاہیے کہ نیکی میں باہمی تعاون کرے اور کہیں عطاعت خداوندی میں کوئی کمی دیکھے تو ایک دوسرے کو یاد دلائے۔

ایک دوسرے کی خطاؤں پر چشم پوشی:

زوجین کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خطاؤں پر چشم پوشی کریں، اگر کسی بھول سے کوئی خطا ہو جائے تو دوسرے کو چاہیے کہ وہ اسے معاف کردے۔

زوجین اگر حضرت ابو درداء کی یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں تو یقیناً ان کی خوشگوار زندگی کے لیے اتنا کافی ہوگا

حضرت ابو درداء نے اپنی بیوی سے فرمایا:

اگر تو مجھے غصہ میں دیکھنا تو راضی کر لینا اور جب میں تجھے غصہ میں دیکھوں گا تو راضی کرلوں گا۔(4)

اسی طرح حدیث پاک میں ہے

﴿قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : " خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي﴾(5)

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔

صحیح مسلم کی حدیث پاک ہے:

﴿قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ "، أَوْ قَالَ غَيْرَهُ﴾(6)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت سے بغض نہ رکھے۔ اگر اسے اس کی کوئی عادت ناپسند ہے تو دوسری پسند ہو گی۔“ یا آپ نے غیرہ (اس کے سوا کوئی اور) فرمایا۔

زوجین سکھ دکھ کے ساتھی بنیں:

جب بیوی قاضی کو کہے ہے کہ میں اجازت دیتی ہوں اور شوہر کہے کہ میں قبول کرتا ہوں تو یہ بات بھی ذہن میں ہونی چاہیے کہ یہ ایجاب وقبول صرف اس بات کے لیے نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے شوہر یا بیوی ہو گئے بلکہ حقیقتاً یہ اس بات کا ایجاب ہے کہ میرے ہمسفر کی زندگی میں جتنے مشکلات آئیں گی تمام کے تمام مشکلات اور جتنی آسانیاں میسر ہوں گی تمام کی تمام سہولتوں کو ہم ساتھ مل کر جییں گے اسی طرح قبول صرف یہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے ہم سفر ہو گئے بلکہ اس بات کی قبولیت ہے کہ ہم دونوں زندگی کے تمام مصائب و آلام، راحت وسکون کو ساتھ مل کر جییں گے لہذا زوجین کو چاہیے کہ سکھ اور دکھ میں ایک دوسرے کا مکمل خیال رکھیں۔

لہذا تعلیمات نبوی کی روشنی میں ہم اسے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ زوجین سکھ دکھ میں کس طرح اچھا ساتھی بن سکتے ہیں۔

پہلی وحی کے بعد جب رسول اللہ ﷺ پریشان ہو کر گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی دی اور فرمایا:

﴿كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا﴾(7)

ہرگز نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔

یہ زوجین کے ایک دوسرے کے دکھ اور پریشانی میں شریک ہونے کی عظیم مثال ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب وہ بیمار ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت فرماتے، ان پر دم کرتے اور دعا پڑھتے تھے۔

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا " أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَوِّذُ بَعْضَ أَهْلِهِ يَمْسَحُ بِيَدِهِ الْيُمْنَى، وَيَقُولُ: اللَّهُمَّ رَبَّ النَّاسِ، أَذْهِبِ الْبَاسَ اشْفِهِ وَأَنْتَ الشَّافِي، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا﴾(8)

عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر کے بعض (بیماروں) پر یہ دعا پڑھ کر دم کرتے اور اپنا داہنا ہاتھ پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے ﴿اللَّهُمَّ رَبَّ النَّاسِ، أَذْهِبِ الْبَاسَ اشْفِهِ وَأَنْتَ الشَّافِي، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا﴾

اے اللہ! لوگوں کے پالنے والے! تکلیف کو دور کر دے، اسے شفاء دیدے تو ہی شفاء دینے والا ہے۔ تیری شفاء کے سوا کوئی شفاء نہیں، ایسی شفاء (دے) کہ کسی قسم کی بیماری باقی نہ رہ جائے۔

ایک دوسرے کے راز کی حفاظت:

زوجین کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے رازوں کی حفاظت کریں خاص طور سے زوجہ کا معاملہ زیادہ نازک ہوتا ہے لہذا ان کو چاہیے کہ ایک دوسرے کے راز کی حفاظت کرے اور اسے کسی دوسرے کے سامنے ہرگز بیان نہ کرے لہذا اسے بیان کرنے والے کے بارے میں احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

﴿قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ، عِنْدَ اللَّهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلَ يُفْضِي إِلَى امْرَأَتِهِ وَتُفْضِي إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا﴾(9)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن، اللہ کے ہاں لوگوں میں مرتبے کے اعتبار سے بدترین وہ آدمی ہوگا جو اپنی بیوی کے پاس خلوت میں جاتا ہے اور وہ اس کے پاس خلوت میں آتی ہے پھر وہ (آدمی) اس کا راز افشا کر دیتا ہے۔

اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں تھیں اور وہاں بہت سی عورتیں اور مرد بیٹھے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تم میں سے بعض مرد اپنی بیویوں کی خلوت کو دوسروں سے بیان کر دیتے ہیں اور شاید بعض عورتیں بھی اپنے شوہروں کی خلوت کی باتیں بیان کر دیا کرتی ہیں؟ لوگ خاموش رہے۔ اسماء رضی اللہ عنہا بول پڑیں: ہاں، اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول! یقیناً عورتیں بھی ایسا کرتی ہیں اور بے شک مرد بھی ایسا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، اس عمل کی مثال ایسے ہی ہے کہ کوئی شیطان سر راہ (لب سڑک) کسی شیطانہ سے ملاپ کرے، اس سے جماع کرے اور لوگ دیکھتے رہیں۔ (10)

ایک دوسرے کے لیے زیب وزینت:

بیوی کو چاہیے کہ شوہر کے لیے زیب وزینت اختیار کرے اسی طرح شوہر کی ذمہ داری ہے کہ صاف ستھرا رہے سرمہ لگائے اور عمدہ لباس زیب تن کرے۔ آج کل عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بیویاں شوہر کے بجائے دوسروں کے لیے سنورتی ہیں مثلاً ان کو کہیں دعوت میں جانا ہو یا گھر سے باہر جانا ہو تو سج سنور کر نکلتی ہیں مگر افسوس کہ جہاں سجنا اور سنورنا چاہیے وہاں وہ نہیں سنورتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زوجین کے درمیان ناچاقی اور نہ اتفاق پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے زوجہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے سنورے نہ کہ کسی اور کے لیے۔ حدیث پاک میں ہے۔

﴿عَنْ مَيْمُونَةَ بِنْتِ سَعْدٍ وَكَانَتْ خَادِمًا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَثَلُ الرَّافِلَةِ فِي الزِّينَةِ فِي غَيْرِ أَهْلِهَا كَمَثَلِ ظُلْمَةِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا نُورَ لَهَا﴾ (11)

میمونہ بنت سعد رضی اللہ عنہا کہ جو نبی اکرم ﷺ کی خادمہ تھیں، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے شوہر کے علاوہ غیروں کے سامنے بناؤ سنگار کر کے اترا کر چلنے والی عورت کی مثال قیامت کے دن کی تاریکی کی طرح ہے، اس کے پاس کوئی نور نہیں ہوگا۔

﴿عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ، فَلَمَّا ذَهَبْنَا لِنَدْخُلَ قَالَ: "أَمْهِلُوا حَتَّى نَدْخُلَ لَيْلًا لِكَيْ تَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ، وَتَسْتَحِدَّ الْمُغِيبَةُ". قَالَ أَبُو دَاوُد: قَالَ الزُّهْرِيُّ: الطُّرُوقُ بَعْدَ الْعِشَاءِ، قَالَ أَبُو دَاوُد: وَبَعْدَ الْمَغْرِبِ لَا بَأْسَ بِهِ﴾ (12)

. جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے ساتھ سفر میں تھے، جب ہم بستی میں جانے لگے تو آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ”ٹھہرو ہم رات میں جائیں گے، تاکہ پراگندہ بال والی کنگھی کر لے، اور جس عورت کا شوہر غائب تھا وہ زیر ناف کے بالوں کو صاف کر لے۔

معلوم ہوا کہ شوہر جب بھی گھر جائے تو پہلے بیوی کو خبر کر دے تاکہ بیوی بن سنور کر رہے۔ زوجین کو ایک دوسرے کے لیے صاف ستھرا لباس پہننا اور زوجہ کو اپنے شوہر کے لیے زیب وزینت اختیار کرنا یہ تعلیمات نبوی میں سے ہے۔ ہاں یاد رہے کہ عورتیں زیب وزینت میں شریعت کے متعین کردہ حدود کا خیال رکھیں یعنی صرف اپنے شوہر کے لیے زیب وزینت اختیار کریں۔

الحاصل شوہر حق مہر، نان ونفقہ رہائش، کا اہتمام کرے اور بیوی کی عزت وناموس کی حفاظت کرے اسی طرح بیوی اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کرے، اس کی غیر موجودگی میں اس کے مال و اسباب اور اولاد کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ اس کی زندگی خوشگواری کے ساتھ گزرے تو اسے چاہیے کہ تعلیمات نبوی کی روشنی میں زندگی گزارے۔

مصادر ومراجع

(1) سورہ النساء آیت 19
(2) بخاری ومسلم
(3) سنن ابي داود / أبواب قيام الليل / حديث:1308
(4) فقہ السنہ ۲/۲۷۲
(5) سنن ترمذي / كتاب المناقب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم / حديث:3895
(6) صحيح مسلم / كتاب الرضاع / حديث:3645
(7) صحيح البخاري / كتاب بدء الوحي / حديث:3
(8) صحيح البخاري / كتاب الطب / حديث:5743
(9) صحيح مسلم / كتاب النكاح / حديث:3542
(10) مسند احمد ۶/۴۵۶
(11) سنن ترمذي / كتاب الرضاع / حديث:1167
(12) سنن ابي داود / كتاب الجهاد / حديث:2778

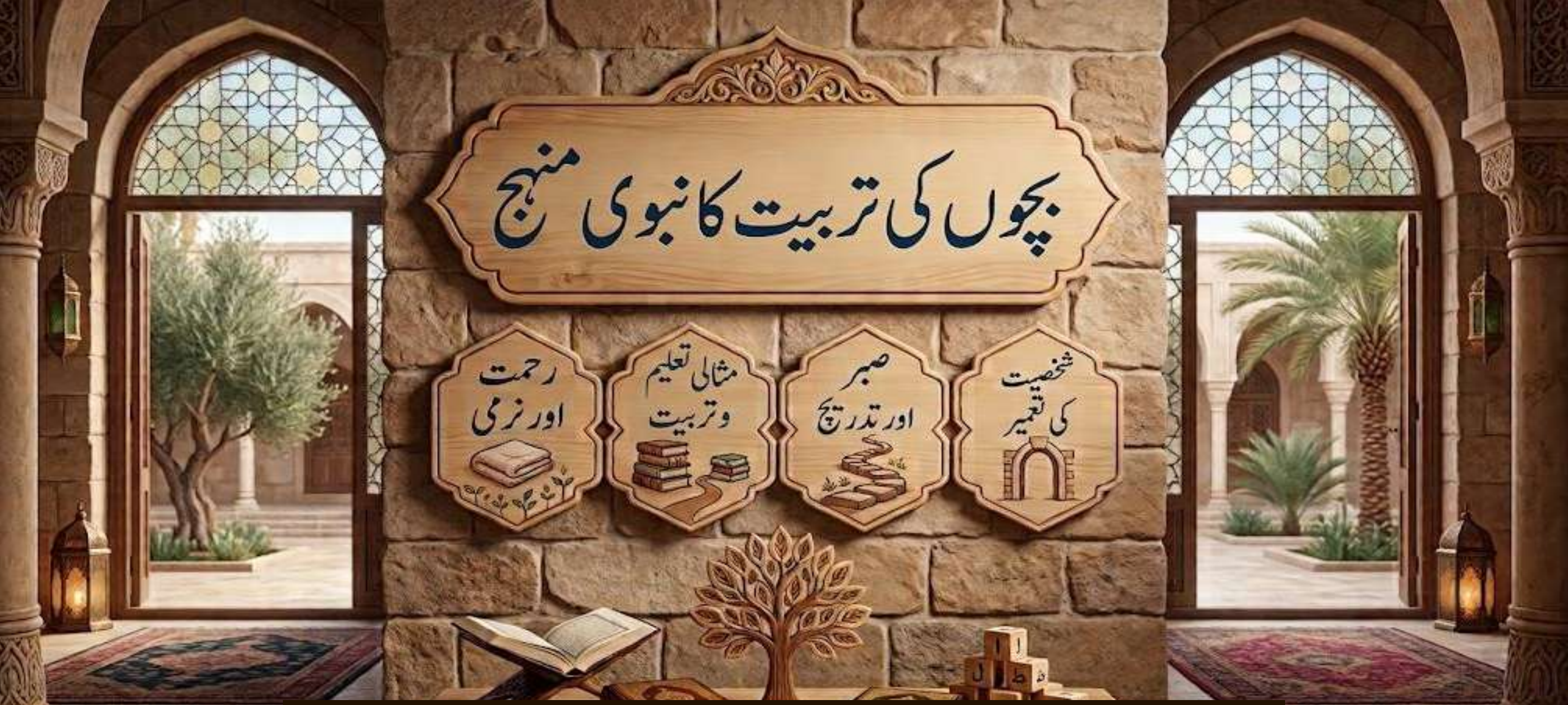

مولانا انیس الرحمن حنفی رضوی، پرنسپل، جامعہ رضویہ زینت العلوم، مرادآباد

مکرمی، انسانی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو نہایت واضح انداز میں ہمارے سامنے رکھتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں اگرچہ بے شمار اسباب کارفرما ہوتے ہیں، لیکن ان تمام اسباب میں ایک سبب ایسا ہے جو ہر دور، ہر تہذیب اور ہر معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور وہ ہے نئی نسل کی صحیح یا غلط تربیت۔ جن اقوام نے اپنی اولاد کی فکری، دینی، اخلاقی اور عملی تربیت کو اپنی اولین ترجیح بنایا، انہوں نے زمانے کی سختیوں کا مقابلہ بھی کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے علمی و تہذیبی سرمایہ کو محفوظ بھی رکھا، لیکن جنہوں نے اپنی نسلوں کی تربیت کو محض وقتی ضرورت سمجھ کر نظر انداز کیا، ان کی ظاہری قوت، معاشی ترقی، سیاسی اقتدار اور علمی برتری بھی زیادہ دیر ان کے وجود کو سہارا نہ دے سکی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی بھی قوم کا اصل سرمایہ اس کی زمین، اس کی دولت یا اس کے وسائل نہیں، بلکہ وہ صالح نسل ہے جو اس کے مستقبل کی امین ہوتی ہے۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لیے اس نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کی طرح تربیتِ اولاد کو بھی غیر معمولی اہمیت عطا کی ہے۔ اسلام کی نظر میں اولاد نہ محض والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، نہ خاندان کی بقا کا ذریعہ، اور نہ ہی صرف معاشرتی ضرورت؛ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک عظیم امانت ہے، جس کے بارے میں بندۂ مومن سے روزِ قیامت سوال کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں اولاد کو اللہ تعالیٰ کی نعمت قرار دیا ہے، وہیں اسے آزمائش بھی فرمایا ہے، تاکہ والدین اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں کہ اولاد کی صحیح پرورش اور

اس کی صالح تربیت ان کی شرعی ذمہ داری ہے، محض طبعی محبت کا تقاضا نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔(1)

امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ﴿اعملوا بطاعة الله، واتقوا معاصي الله، ومروا أهليكم بالذكر ينجيكم الله من النار﴾(2)

یعنی: خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت اختیار کرو، اس کی نافرمانی سے بچو اور اپنے گھر والوں کو بھی اللہ کی یاد اور اس کی اطاعت کی تلقین کرو، اللہ تعالیٰ تم سب کو جہنم سے نجات عطا فرمائے گا۔

یہ آیت اور اس کی یہ تفسیر اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اسلام کی نگاہ میں والدین کی ذمہ داری صرف اولاد کے جسم کو پروان چڑھانا نہیں بلکہ اس کے ایمان، عقیدہ، کردار اور آخرت کی کامیابی کی فکر کرنا بھی ہے۔ اگر اولاد کو بہترین لباس، اعلیٰ تعلیم، کشادہ رہائش اور ہر طرح کی دنیاوی آسائش میسر ہو، لیکن وہ اپنے رب سے غافل، نماز سے بے تعلق، اخلاق سے محروم اور دین سے دور ہو، تو اسلامی نقطۂ نظر سے والدین اپنی بنیادی ذمہ داری پوری نہیں کر سکے۔

افسوس کہ موجودہ زمانے میں تربیت کا مفہوم بڑی حد تک تعلیم، ملازمت اور معاشی خوش حالی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ والدین کی ایک بڑی تعداد اس فکر میں شب و روز مصروف رہتی ہے کہ ان کا بچہ اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخل ہو، نمایاں نمبروں سے کامیاب ہو، بہترین پیشہ اختیار کرے اور دنیا کی آسائشیں حاصل کرے؛ لیکن یہ فکر نسبتاً کم دکھائی دیتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے کس قدر آشنا ہے، رسول اللہ ﷺ کی سنتوں سے اس کا تعلق کتنا مضبوط ہے، قرآنِ کریم اس کی زندگی میں کس درجے کا اثر رکھتا ہے، اور اس کے اخلاق و کردار میں اسلامی تعلیمات کی جھلک کس حد تک موجود ہے۔ یہی وہ خلا ہے جس نے آج کے مسلم معاشرے کو فکری انتشار، اخلاقی کمزوری اور خاندانی بے سکونی سے دوچار کر دیا ہے۔

اسلام کا تصورِ تربیت اس سے کہیں زیادہ وسیع، جامع اور متوازن ہے۔ وہ انسان کو صرف دنیا کا کامیاب فرد نہیں بناتا بلکہ اسے دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں عبادات

کا حکم دیا گیا ہے، وہیں اخلاق کی اصلاح، معاملات کی درستی، والدین کے حقوق، اولاد کی ذمہ داریوں، معاشرتی آداب اور انسانی اقدار کو بھی نہایت اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ گویا اسلام کی نگاہ میں تربیت ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو انسان کی پوری شخصیت کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیتا ہے۔

اس جامع تصور کی کامل ترین عملی تفسیر ہمیں رسول اکرم ﷺ کی مبارک زندگی میں نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ صرف آخری نبی ہی نہیں بلکہ انسانیت کے سب سے عظیم مربی، سب سے کامیاب معلم اور سب سے کامل مصلح بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے جس نسل کی تربیت فرمائی، وہ کسی مخصوص ماحول یا غیر معمولی وسائل کی پیداوار نہیں تھی، بلکہ عام انسانی معاشرے سے تعلق رکھنے والے افراد تھے، جنہیں آپ ﷺ نے ایمان، علم، اخلاق اور عمل کی ایسی دولت عطا کی کہ وہ رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے نمونہ بن گئے۔

نبوی تربیت کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بچوں کے دلوں میں ایمان کی بنیاد مضبوط کی۔ شخصیت سازی کا آغاز ظاہری آداب سے پہلے عقیدے کی درستی سے فرمایا، کیونکہ جس دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت راسخ ہو جائے، اس کے لیے نیکی کا راستہ اختیار کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:﴿كُنْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمًا، فَقَالَ: يَا غُلَامُ، إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: احْفَظِ اللَّهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللَّهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ﴾(3)

ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سواری پر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے لڑکے! میں تمہیں چند اہم باتیں سکھاتا ہوں؛ اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، اللہ کے حقوق کا خیال رکھو، تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔

اس حدیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کم عمر بچے کے سامنے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے تعلق، توکل، یقین اور بندگی کا تصور رکھا۔ آپ ﷺ نے اسے دنیا کی کامیابی کے نسخے نہیں سکھائے بلکہ اس کے دل کو اپنے رب سے جوڑ دیا، کیونکہ جس دل کا تعلق اپنے خالق سے مضبوط ہو جائے، اس کے کردار میں خود بخود پاکیزگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہی نبوی منہج کا وہ بنیادی اصول ہے جسے آج کی تربیت میں سب سے زیادہ فراموش کر دیا گیا ہے۔ آج بچوں کے ذہنوں میں مقابلے، کامیابی، شہرت اور مادّی ترقی کے خواب تو بہت

جلد بٹھا دیے جاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق، آخرت کی جواب دہی اور بندگی کا شعور اسی نسبت سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ جب بنیاد ہی کمزور ہو تو شخصیت کی عمارت زیادہ دیر مضبوط نہیں رہ سکتی، اور یہی وہ مقام ہے جہاں نبوی منہجِ تربیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اس منہج کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچے کی شخصیت کو توڑا نہیں جاتا بلکہ سنوارا جاتا ہے، اس کی فطری صلاحیتوں کو دبایا نہیں جاتا بلکہ صحیح رخ پر پروان چڑھایا جاتا ہے، اور اس کی اصلاح کو سزا کا نام نہیں دیا جاتا بلکہ محبت، حکمت اور خیر خواہی کے سانچے میں ڈھال کر اس کے دل میں اتارا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت پانے والے بچے بڑے ہو کر صرف اچھے انسان ہی نہیں بنے بلکہ امت کے ایسے رہنما ثابت ہوئے جن کی علمی، عملی اور اخلاقی عظمت پر آج بھی دنیا حیران ہے۔

نبوی تربیت کا ایک بنیادی اصول یہ تھا کہ بچوں کی عزتِ نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔ آپ ﷺ بچوں سے محبت فرماتے، ان کے جذبات کا احترام کرتے، ان سے مسکرا کر گفتگو فرماتے، ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے اور ان کی عمر کے تقاضوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو بوسہ دے رہے تھے۔ اس وقت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے عرض کیا: میرے دس بچے ہیں، میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ﴾(4)

جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

اس مختصر مگر عظیم ارشاد میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تربیت کی بنیاد محبت اور شفقت ہے۔ جو دل محبت سے خالی ہو، وہ شخصیت سازی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ افسوس کہ ہمارے معاشرے میں بعض لوگ سختی کو ہی تربیت سمجھتے ہیں، حالانکہ نبوی اسلوب یہ ہے کہ محبت دلوں کو جیتتی ہے اور دل جیتنے کے بعد اصلاح آسان ہو جاتی ہے۔

اسی محبت کے ساتھ آپ ﷺ بچوں میں عبادت کا ذوق بھی پیدا فرماتے تھے۔ عبادت کو ان پر بوجھ بنا کر مسلط نہیں کرتے تھے بلکہ تدریج کے ساتھ اس کی عادت ڈالتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ﴾(5)

اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں (اور پھر بھی کوتاہی کریں) تو انہیں اس پر تادیب کرو، اور ان کے بستر ے الگ کر دو۔

اس حدیث پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بچوں سے بھی وہی مطالبہ نہیں کرتا جو ایک بالغ انسان سے کرتا ہے، بلکہ ان کی عمر، ذہنی استعداد اور نفسیاتی کیفیت کے مطابق تدریج کے ساتھ انہیں عبادت کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ یہی اعتدال نبوی منہج کا حسن ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف عبادات ہی کی تعلیم نہیں دی بلکہ اعلیٰ اخلاق کو بھی تربیت کا بنیادی حصہ قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں:

﴿إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا﴾(6)

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نبوی تربیت میں سچائی، امانت، حیا، عفو، درگزر، تواضع، صلہ رحمی، احترامِ انسانیت اور حسنِ معاشرت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اگر بچے کو اعلیٰ تعلیم تو مل جائے لیکن اس کے کردار میں دیانت، حیا اور اخلاق نہ ہوں تو وہ معاشرے کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا۔

آج کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ والدین نے اپنی اولاد کے لیے وقت نکالنا تقریباً چھوڑ دیا ہے۔ گھر میں ہر فرد کسی نہ کسی مشغلے میں مصروف ہے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے باہمی گفتگو کو محدود کر دیا ہے۔ بچوں کی فکری تشکیل اب والدین سے زیادہ اسکرینیں کر رہی ہیں۔ ایسے حالات میں اگر والدین خود اپنی اولاد کے ساتھ بیٹھ کر قرآن نہ پڑھیں، سیرتِ نبوی نہ سنائیں، ان کے سوالات نہ سنیں، ان کی صحبت کا حق ادا نہ کریں تو محض

نصیحتوں سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ تربیت کا سب سے مؤثر ذریعہ صحبت ہے، اور یہی وہ چیز ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے ثابت فرمایا۔

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بچے صرف والدین کی زبان سے نہیں بلکہ ان کے کردار سے سیکھتے ہیں۔ اگر والدین نماز کی تلقین کریں مگر خود نماز میں غفلت برتیں، سچ بولنے کا درس دیں مگر اپنے معاملات میں جھوٹ سے کام لیں، حسنِ اخلاق کی بات کریں مگر گھر کے ماحول میں بدزبانی، غصہ اور بے اعتدالی عام ہو تو بچے لاشعوری طور پر عمل کو اختیار کرتے ہیں، الفاظ کو نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تربیت کا سب سے مؤثر ذریعہ نصیحت نہیں بلکہ نمونۂ عمل ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اسی حقیقت کی روشن تفسیر تھی۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبوی منہجِ تربیت کسی ایک شعبے تک محدود نہیں بلکہ وہ انسان کی پوری شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ ایمان بھی دیتا ہے، عبادت بھی سکھاتا ہے، علم بھی عطا کرتا ہے، اخلاق بھی سنوارتا ہے، معاشرت بھی درست کرتا ہے، ذمہ داری کا احساس بھی پیدا کرتا ہے اور آخرت کی جوابدہی کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ یہی وہ جامعیت ہے جس نے صحرائے عرب کے عام بچوں کو علم و حکمت کے آفتاب، عدل و انصاف کے علمبردار اور انسانیت کے رہنما بنا دیا۔

آج اگر مسلم معاشرہ اپنی آئندہ نسلوں کو فکری انتشار، اخلاقی انحطاط، الحاد، بے راہ روی اور تہذیبی غلامی سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اسے مصنوعی تربیتی نظریات کے بجائے ایک بار پھر اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس نے تاریخ کی عظیم ترین نسل تیار کی تھی۔ اس کے بغیر نہ گھروں میں حقیقی سکون آ سکتا ہے، نہ معاشرے میں صالح انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور نہ امت اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی تربیت کوئی وقتی مہم، رسمی ذمہ داری یا چند نصیحتوں کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مسلسل عبادت، ایک دائمی جدوجہد اور ایک عظیم امانت ہے، جس کا اثر صرف ایک فرد یا ایک خاندان تک محدود نہیں رہتا بلکہ پوری امت کی آئندہ سمت متعین کرتا ہے۔ اگر آج کا مسلمان اپنے گھر کو نبوی تعلیمات کا گہوارہ بنا لے، اپنی اولاد کو قرآن و سنت کی روشنی میں پروان چڑھائے، اپنے کردار سے ان کے لیے نمونہ بنے اور محبت، حکمت اور اعتدال کے ساتھ ان کی دینی و اخلاقی تعمیر کا اہتمام کرے تو بعید نہیں کہ یہی بچے کل امتِ مسلمہ کے وقار،

عزت اور سربلندی کا سبب بن جائیں۔ یہی نبوی منہج کا پیغام ہے، یہی قرآن و سنت کا تقاضا ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر دنیا و آخرت دونوں کی حقیقی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو آج امتِ مسلمہ کو جن فکری، اخلاقی اور تہذیبی چیلنجز کا سامنا ہے، ان میں سے بیشتر کی جڑیں تربیت کے بحران میں پیوست ہیں۔ جب گھروں سے ایمان کی حرارت، کردار کی پاکیزگی، والدین کی عملی نمونہ سازی اور نبوی تعلیمات کی خوشبو رخصت ہونے لگتی ہے تو پھر تعلیمی ادارے، معاشرتی قوانین اور ظاہری اصلاحی کوششیں بھی اس خلا کو مکمل طور پر پُر نہیں کر سکتیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جس امت نے کبھی دنیا کو علم، اخلاق، عدل، رحم اور انسانیت کا درس دیا تھا، آج وہی امت اپنی نئی نسل کی دینی اور اخلاقی شناخت کے تحفظ کے مسئلے سے دوچار ہے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تربیت کے ان تمام مصنوعی نظریات اور وقتی تجربات کے بجائے ایک بار پھر اس منبعِ ہدایت کی طرف رجوع کریں جس کی کامیابی پر خود ربِ کائنات نے مہرِ تصدیق ثبت فرمائی ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کا منہجِ تربیت محض چند نصیحتوں یا رسمی ہدایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر، متوازن اور فطری نظام ہے جو انسان کے عقیدے کو بھی سنوارتا ہے، اس کے باطن کو بھی پاکیزہ بناتا ہے، اس کے اخلاق کو بھی آراستہ کرتا ہے، اس کی عقل کو بھی صحیح سمت عطا کرتا ہے اور اس کے کردار کو بھی ایسا استحکام بخشتا ہے کہ وہ ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرلیتا ہے۔ یہی وہ منہج ہے جس نے صحراؤں میں پلنے والے بچوں کو علم و عرفان کے آفتاب، عدل و انصاف کے علمبردار اور رشد و ہدایت کے مینار بنا دیا۔

آج ضرورت اس امر کی نہیں کہ ہم اپنی اولاد کو صرف کامیاب ڈاکٹر، انجینئر، تاجر یا افسر بنانے کی فکر کریں، بلکہ اس سے بڑھ کر اس بات کی فکر کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے صالح بندے، رسول اللہ ﷺ کے سچے غلام، والدین کے فرماں بردار، معاشرے کے خیر خواہ اور امت کے باکردار افراد بنیں۔ اس لیے کہ پیشے انسان کو معاشی مقام عطا کرتے ہیں، لیکن کردار انسان کو عزت بخشتا ہے، اور کردار کی یہ دولت صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب تربیت کی بنیاد قرآنِ حکیم اور اسوۂ رسول ﷺ پر رکھی جائے۔

اگر ہمارے گھروں میں پھر سے قرآن کی تلاوت گونجنے لگے، سنتِ نبوی زندگی کا شعار بن جائے، والدین اپنی اولاد کے لیے بہترین عملی نمونہ بن جائیں، اور محبت، حکمت، شفقت اور اعتدال کے ساتھ نئی نسل کی دینی و اخلاقی تعمیر کی جائے تو وہ دن دور نہیں جب یہی بچے امتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کا ذریعہ بنیں گے۔ کیونکہ تاریخ کا یہ ناقابلِ تردید اصول ہے کہ جن قوموں کی گودیں صالح کردار پیدا کرتی ہیں، زمانہ انہی کے قدموں میں اپنی پیشانی جھکاتا ہے، اور جن گھروں سے تربیت رخصت ہو جائے، وہاں سے عزت و وقار بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اولاد کی تربیت قرآن و سنت کے مطابق کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری نسلوں کو ایمان، علم، عملِ صالح اور حسنِ اخلاق کا ایسا پیکر بنائے جو دنیا میں اسلام کی صحیح ترجمانی اور آخرت میں ہماری نجات کا ذریعہ بن سکے۔ آمین۔

مصادر و مراجع

(1) سورۃ التحریم:6
(2) امام طبری، جامع البیان، تفسیر سورۃ التحریم، آیت:6
(3) جامع الترمذی، باب: احفظ اللہ یحفظک، حدیث:2516
(4) صحیح البخاری، حدیث:5997؛ صحیح مسلم، حدیث:2318
(5) سنن أبي داود، حدیث:495؛ مسند أحمد:6756
(6) صحیح البخاری، حدیث:6035

سیرت اور خواتین

سیرتِ مصطفیٰ ﷺ اور ہماری مسلم بچیاں

مولانا محسن رضا ضیائی (استاذ: دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، کیمپ، پونے، مہاراشٹر)

رسول اللہ ﷺ کی ''سیرتِ طیبہ'' اخلاقِ حسنہ کا عظیم مظہر اور ایک انقلابی زندگی کا حسین نمونہ ہے۔ گم گشت گانِ راہ کے لیے ہدایت و رہنمائی کا روشن مینار ہے تو وہیں عقیدت مندانِ توحید و رسالت کے لیے مژدۂ جاں فزا ہے۔ اضطراب و بے چینی کے طوفانِ بلاخیز میں ڈوبتی انسانیت کے کے لیے پروانۂ نجات ہے تو امن و آشتی کے محافظوں اور پاسبانوں کے لیے چشمِ رحمت ہے۔

سیرت رسول ﷺ کا ایک اہم اور خاص پہلو یہ ہے کہ دنیا میں جتنی بھی بااثر اور عظیم شخصیات ہوئیں، ان کی احوال و آثار، عادات و اطوار، اعمال و افعال، افکار و خیالات اور ان کے حوالے سے اس قدر معلومات اتنے مدلل اور مفصل انداز میں صفحۂ قرطاس کی زینت نہیں بنی، جس طرح رسول اللہ ﷺ کی سیرت و سوانح کا مکمل باب تحریری و عملی شکل میں دنیا کے سامنے آیا ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور اُسوۂ حسنہ کا ایک ایک گوشہ اور ہر ہر پہلو مستند سندوں اور روایتوں کے ساتھ کتبِ تاریخ و سیر میں موجود ہے۔

من جملہ یہ کہ سیرتِ رسول ﷺ ہر شخص کے لیے مشعلِ راہ اور نمونہ کامل ہے، جس پر چل کر ہر شخص اپنی دینی، سماجی، معاشی، عائلی اور خانگی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا کر سکتا ہے۔ کیوں کہ سیرت رسول ﷺ میں زندگی گزارنے کے وہ راز کار فرما ہیں، جو ایک انسان کو عظمت و بلندی اور کامیابی و کامرانی عطا کرتے ہیں۔ اِس کے

لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں کا غائرانہ جائزہ لیں گے تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ سیرتِ رسول ﷺ کے مطابق وموافق گزارا۔ سیرتِ رسول ﷺ سے وابستگی کے بعد ان کے اندر وہ تبدیلیاں آئیں کہ ان میں کوئی پیکرِ عشق ووفابنا، کوئی فاتحِ عرب وعجم، کوئی تاجدارِ سخاوت، کوئی فاتحِ خیبر، کوئی محدث، کوئی فقیہ تو کوئی مفسرِ قرآن بنا اور یہ سب رسول اللہ ﷺ کی بااخلاق وکردار اور پاکیزہ سیرت کا کمال وجمال تھا کہ ہر کوئی مختلف رنگوں میں رنگتا چلا گیا۔

اسی طرح صحابیاتِ مقدسہ کا بھی یہی حال تھا کہ انہوں نے بھی اپنی زندگیوں کو سیرتِ رسول ﷺ کے قالب میں ڈھال لیا تھا اور اپنے آپ میں گوناگوں اور مختلف تبدیلیاں پیدا کیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں کوئی فقیہ بنیں تو کوئی محدثہ اور کوئی مفسرہ بنیں۔ گویا سیرتِ رسول ﷺ سے صحابہ وصحابیات کا رشتہ اس قدر مضبوط اور اُستوار تھا کہ انہوں نے سیرتِ رسول ﷺ کو اپنا نصب العین اور مقصد زیست بنالیا تھا اور تادمِ اخیر اسی سے راہ نمائی وروشنائی حاصل کرتے رہیں۔

اگر دورِ حاضر کی مسلمان بچیاں اور عورتیں بھی سیرتِ رسول ﷺ سے اپنا رشتہ مستحکم کرلیں اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کے شب وروز گزاریں تو یقیناً ان کی زندگیوں کی بھی کایا پلٹ سکتی ہے۔ بلکہ یہ ایک زمینی سچائی ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو مختلف حالات کا سامنا ہے، خاص طور سے فتنۂ ارتداد کا، جو مسلم معاشرے میں اپنے بال وپر پھیلا چکا ہے اور اب تک سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسلم بچیوں کو ارتداد وبے دینی کی اور دھکیلتے ہوئے انہیں اسلام سے دور ونفور کر چکا ہے۔

اب ایسے فتنہ خیز اور ایمان سوز حالات میں تو اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سیرتِ رسول ﷺ سے اپنا تعلق گہرا کیا جائے، اپنے اقدار وروایات، تہذیب وثقافت اور تمام معاملات میں سیرت رسول ﷺ کو شامل کیا جائے۔ آج کے ایسے پُرفتن دور میں سیرت رسول ﷺ ہی میں مسلمانوں کے تمام مسائل وحالات کا واحد حل اور ان کے دین وایمان کا تحفظ وبقا ہے۔ لہٰذا اغیار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر اپنا دین ومذہب تبدیل کرنے والی بچیوں اور خواتین کو سیرت رسول ﷺ سے قریب کرکے ان کی بہتر اصلاح وتربیت کی سخت ضرورت ہے۔

اب یہاں رسول کریم ﷺ کے اس کردار و عمل کو ملاحظہ فرمائیں جو آپ نے اپنے گھر کی بچیوں اور خواتین کو اپنی سیرت اور اخلاق کے سانچے میں ڈھالا اور بحیثیتِ معلم و مربی اپنا بنیادی اور مثالی کردار ادا فرمایا:

(۱) چناں چہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹی لختِ جگر نورِ نظر خاتونِ جنت حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس طرح تعلیم و تربیت فرمائی کہ آپ نہایت ہی متقیہ و پارسا، محدثہ و فقیہ، باپردہ و باحیا اور تمام خواتین میں قابلِ صدر شک بنیں۔ آپ علوم و فنون، اخلاق و محامد اور اعمال و عبادات غرض کہ ہر معاملے میں اپنی مثال آپ تھیں۔ آپ اس قدر عفت و پاکدامنی کا نمونہ تھی کہ زندگی بھر کسی غیر محرم کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا اور نہ کسی نے آپ کو دیکھا۔ خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایک روایت ملتی ہے کہ: جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی ندا کرے گا، اے اہلِ مجمع! اپنی نگاہیں جھکالو تاکہ فاطمہ بنتِ محمد ﷺ پل صراط سے گزرے۔(1)

اس روایت سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آغوش تربیت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھا کس قدر باپردہ اور باحیا بنیں کہ قیامت کے دن بھی آپ کو انسانوں کے انبوہ کثیر میں یہ شرف و افتخار حاصل ہوگا کہ وہاں بھی آپ باپردہ ہوگی۔

حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر رسول اللہ ﷺ کے وصالِ ظاہری کا ایسا اثر ہوا کہ آپ کے لبوں کی مسکراہٹ ہی ختم ہوگئی۔ اپنے وِصالِ ظاہری سے پہلے صرف ایک ہی بار مسکراتی دیکھی گئیں۔

اِس کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ تشویش تھی کہ میں نے عُمر بھر تو غیر مردوں کی نظروں سے خود کو بچائے رکھا، اب کہیں بعد وفات میری کفن میں لپٹی لاش پر لوگوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ ایک موقع پر آپ نے کہا: میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ جنازے پر درخت کی شاخیں باندھ کر ایک ڈولی کی سی صورت بنا کر اُس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے کھجور کی شاخیں منگوا کر انہیں جوڑ کر اُس پر کپڑا تان کر سیدہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کو دکھایا۔ آپ رضی اللہ عنہا بہت خوش ہوئیں اور لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ بس یہی ایک مسکراہٹ تھی جو رسول ﷺ کے وصالِ ظاہِری کے بعد دیکھی گئی۔(2)

آپ نے شہزادیِ رسول ﷺ ہونے، زوجۂ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہونے اور والدۂ حسنین کریمین رضی اللہ عنھما ہونے کا حق اس طرح نبھایا کہ آپ دنیا کی تمام خواتین کے لیے ایک رول ماڈل بن گئیں۔

(۲) اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنھیں کم عمری میں رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ بھی حیا و پاک دامنی، شرافت و پاکیزگی اور وسعتِ علمی میں سراپا بے مثال تھیں۔ کیوں کہ آپ کی تعلیم و تربیت بھی بارگاہِ نبوی ﷺ میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے تفقہ فی الدین اور روایت فی الحدیث میں جہاں ممتاز اور اعلیٰ مقام حاصل کیا وہیں شرم و حیا کی پیکرِ جمیل بھی بنیں۔ آپ کو فقہ و حدیث میں اس قدر مہارت و قدرت حاصل تھی کہ کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی بعض لاینحل مسائل اور روایتِ حدیث کے لیے آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہا پردہ کا بہت خیال رکھتی تھی۔

ایک دفعہ حج کے موقع پر چند بیبیوں نے عرض کی کہ اے ام المومنین! چلیے حجر اسود کو بوسہ دے لیں۔ فرمایا تم جا سکتی ہوں، میں مردوں کے ہجوم میں نہیں جا سکتی۔

کبھی دن کو طواف کا موقع پیش آتا تو خانۂ کعبہ مردوں سے خالی کرا لیا جاتا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طواف کی حالت میں بھی چہرہ پر نقاب پڑا رہتا تھا۔ ایک غلام کو مکاتب کیا تھا، اس سے کہا کہ جب تک تمہارا زرِ فدیہ ادا نہیں ہو جاتا، میں تمہارے سامنے نہیں آ سکتی۔

حضرت اسحاق تابعی نابینا تھے، وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے پردہ کیا۔ وہ بولے کہ مجھ سے کیا پردہ، میں تو آپ کو دیکھتا نہیں۔ فرمایا تم مجھے نہیں دیکھتے تو میں تم کو دیکھتی ہوں۔

مردوں سے شریعت میں پردہ نہیں لیکن ان کا کمال احتیاط دیکھیے کہ وہ اپنے حجرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دفن ہونے کے بعد بے پردہ نہیں جاتی تھیں۔(3)

حضور ﷺ اپنے گھر کی خواتین کو کس طرح پردے کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اس کا اس کا اندازہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اِس روایت کردہ حدیث سے لگائیں۔

(۳) حضرت اِم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں اور میمونہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں، اسی دوران کہ ہم دونوں آپ کے پاس بیٹھی تھیں، عبد اللہ بن ام مکتوم آئے اور آپ کے پاس پہنچ

گئے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ہمیں پردے کا حکم دیا جاچکا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم دونوں ان سے پردہ کرو"، میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا وہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ وہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں؟ اور نہ ہمیں پہچان سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم دونوں انہیں دیکھتی نہیں ہو؟"۔
امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔(4)

یہاں ہم نے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا تاہم رسول اللہ ﷺ نے دگر ازواجِ مطہرات اور اپنی بناتِ طیّبات کی بھی اسی طرح تعلیم و تربیت فرمائی، جو اپنے زمانے کی عورتوں میں تمام شعبہائے حیات میں یکتائے روزگار بنیں۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ کے گھرانے کی پاکباز خواتین ہیں، جن کا تذکارِ جمیل قرآن واحادیث کے علاوہ تاریخ وسیر کی کتابوں میں جابجا موجود ہے۔ ان کے علاوہ تاریخ اسلام کے روشن وسنہری اوراق ایسی کئی باکمال ومایہ ناز خواتین کے تذکروں سے مالا مال ہیں، جن کی زندگیوں میں سیرتِ رسول ﷺ کی مکمل جھلکیاں ملتی ہیں۔

اب یہاں چند دگر خواتینِ اسلام کے واقعات و حالات ملاحظہ کریں، جنہوں نے دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے، جن کے پاکیزہ تذکرے تاریخ کے سنہری اوراق میں مرقوم ہیں۔

(ا) حضرت رفیدہ بنت سعد رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں، جو تاریخِ اسلام کی پہلی طبیبہ، نرس اور جراحہ ہیں، جو جراحی، مرہم پٹی اور دواسازی کے میدان کی ایک ماہر خاتون تھیں، جنہوں نے طبی شعبے میں گراں قدر اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

رفیدہ حضرت سعد اسلمی رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی ہیں، جو خود ایک ماہر طبیب تھے اور اپنی بیٹی رفیدہ کو بھی علم طب کی تعلیم دی اور ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ وہ اسلام کی پہلی خاتون ڈاکٹر، نرس اور جراحہ بننے میں کامیاب ہوئیں۔ حضرت رفیدہ نے غزوۂ بدر، احد، خیبر اور خندق جیسے غزوات میں شرکت کیں یہاں تک مروی ہے کہ ایک غزوہ کی تیاری کی جارہی تھی، اس موقع پر حضرت رفیدہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئیں اور جنگ میں شرکت کی اجازت چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی۔

غزوات کے دوران حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا کا ایک طبی خیمہ قائم کیا جاتا تھا، جہاں زخمیوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ زخمی صحابۂ کرام کو آپ کے خیمے میں منتقل کرنے کا حکم دیتے تھے۔ روایت ہے کہ غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تو انہیں بھی علاج کے لیے حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا کے خیمے میں منتقل کیا گیا۔

حضرت رفیدہ نے دیگر خواتینِ اسلام کی بھی طب و جراحت کے شعبے میں تعلیم و تربیت کی، جن میں خاص طور سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت رفیدہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ جنگی میدانوں میں طبی خدمات کی بات ہو یا کسی مریض کی دیکھ بھال، ہر حال میں باپردہ رہا کرتی تھیں، انہوں نے کبھی بھی پردے سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

ایک ایسی خاتون، جس نے کئی ایک غزوات میں بحیثیت طبیبہ، نرس اور جراحہ شرکت کیں، مجاہدینِ اسلام کے زخموں کی مرہم پٹیاں کیں اور مریضوں کے علاج و معالجہ میں شب روز لگی رہیں، لیکن پردے کو اپنے لیے جزوِ لاینفک سمجھا، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ انہیں نہ صرف جنگوں میں شرکت کی اجازت عطا فرماتے، بلکہ زخمیوں کو ان کے خیمے میں منتقل کا حکم دیا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے مالِ غنیمت کا ایک حصہ بھی مختص فرمایا کرتے تھے۔

(۲) حضرت اُم خلاد انصاری رضی اللہ عنہا انصار کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا نکاح سوید بن ثعلبہ (خزرجی) سے ہوا۔ ان کے صلب سے ایک بیٹے خلاد پیدا ہوئے، جو بڑے مخلص صحابی تھے، وہ غزوۂ بنو قریظہ میں سرورِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ ایک یہودی عورت نے اپنے مکان کی چھت سے ان پر بھاری پتھر گرا دیا جس کے صدمہ سے شہید ہو گئے۔

والدہ کو اڑتی اڑتی خبر ملی تو وہ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں عقل و خرد پر بجلی بن کر گرنے والے اس حادثے کے باوجود ان کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بارگاہ نبوت ﷺ میں جو لوگ حاضر تھے ان میں سے کسی نے کہا:

بی بی تمہارا بیٹا قتل ہو گیا ہے تعجب ہے کہ ایسی مصیبت کے وقت بھی تم نے چہرے پر نقاب ڈال رکھی ہے۔ اتنے میں خلاد نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ اگر میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے تو کیا اب میں شرم وحیا بھی کھو دوں؟(5)

(۳) حضرت ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ نے بغیر اجازت سیب کھانے کی پاداش میں دس سالوں تک حضرت عبد اللہ صومعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک باغ کی رکھوالی کی اور جب دس سال مکمل ہو گئے تو باغ کے مالک کے پاس آئے اور معافی چاہی تو انہوں نے کہا کہ ابھی ایک شرط اور باقی ہے، وہ یہ کہ میری ایک لڑکی آنکھوں سے اندھی... کانوں سے بہری... ہاتھوں سے لنجی اور پاؤں سے لنگڑی ہے، اسے نکاح میں قبول کر لو تو بلا اجازت سیب کھانے کی معافی دے دی جائے گی۔ حضرت ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرط کو بھی قبول فرمالیا۔ بعد نکاح جب اپنی بیوی کو ملاحظہ فرمایا تو اسے ان تمام عیبوں سے خالی پایا جن کا ذکر کیا گیا تھا۔ فوراً دل میں خیال گزرا کہ شاید یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ اس پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر نکل آئے۔

باہر حضرت عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے ان کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا کہ بیٹے! یہی تمہاری بیوی ہے اور میں نے اس کی جو صفات تم سے بیان کی تھیں، وہ بھی غلط نہ تھیں۔ اس کو اندھی اس لیے کہا کہ آج تک کسی غیر محرم پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ بہری اس لیے کہا ہے کہ اس نے کبھی خلاف شرع بات نہیں سنی، نیز کبھی خلاف شرع کام نہ کرنے اور گھر سے باہر قدم نہ رکھنے کی وجہ سے لنجی اور لنگڑی بھی قرار دیا۔ یہ سن کر حضرت ابو صالح رحمہ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے اور ایسی پرہیز گار زوجہ کے مل جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔(6)

یہ تمام بناتِ اسلام آج کی تمام عورتوں کے لیے یقیناً نمونۂ عمل ہیں۔ اگر آج کی عورتیں سیرت رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ تاریخ کی باکمال خواتین کی سیرت کو اپنا لیں اور جس طرح انہوں نے سیرت مصطفیٰ ﷺ سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اپنی زندگیوں کو جگمگایا تو اِس وقت جو خواتین ارتداد و بے دینی، بد عقیدگی و بے عملی اور خرافات و بے ہودگی میں گرفتار ہیں، وہ جلد ہی ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی اور اس سے

نہ صرف ان کی عزت وناموس سلامت رہے گی بلکہ ان کا ایمان وعقیدہ بھی محفوظ ہو جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے قوم کی بیٹیوں کے لیے مشعلِ راہ بن جائیں گی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب اولاد بالغ ہو جاتی ہیں تو والدین کی ذمہ داریاں بھی اسی قدر بڑھ جاتی ہیں، کیوں کہ بلوغیت کی عمر کو پہنچنے کے بعد بچے یا بچیاں گناہ کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اعمالِ شر اور افعالِ بد سے دور رکھنا والدین کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ثابت ہوتا ہے، جس سے ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہیں اور وہ طرح طرح کی فکر و پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر بچپن سے ہی اولاد کی بہتر اور اسلامی ماحول میں تربیت کی جائے تو بعد بلوغیت وہ حالات نہیں پیش آتے ہیں، جو فکر و پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ بلکہ ان کے اوپر اسلامی ماحول کے وہ اثرات و نقوش مرتّب ہوتے ہیں، جو مرتے دم تک باقی رہتے ہیں۔

اسی لیے والدین اور سرپرست حضرات سے ادباً گذارش ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو دینی و اسلامی ماحول میں پروان چڑھائیں اور انہیں دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ کریں۔ سیرتِ رسول ﷺ کو خود بھی اپنائیں اور اپنی بچیوں کو بھی اس کے دروس و اسباق پڑھائیں تاکہ ان کی زندگیوں پر سیرت رسول ﷺ کے تابندہ نقوش مرتسم ہوں اور پھر نہ ہی وہ اپنے دین و ایمان سے بغاوت کریں گی اور نہ ہی اپنی عزت و ناموس سے کوئی کھلواڑ کریں گی۔

مصادر و مراجع

(1) المستدرک۔ ۳/۱۵۳
(2) جذب القلوب الی دیار المحبوب، ص ۱۵۹
(3) خواتین اسلام کے ایمان افروز واقعات، ص: ۴۲
(4) جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۷۸
(5) تذکارِ صحابیات، ص: ۳۱۴
(6) قابلِ رشک خواتین، ص: ۱۷۱

دعوت وتبلیغ میں امہاتِ المومنین کا کردار

بنت سید، جامعہ فاطمہ زہراء، ساؤتھ افریقہ

دعوت دین، تبلیغ اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے حوالے سے امہات المؤمنین کا کردار عظیم الشان اور نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والے ادنی طالب علم پر بھی یہ امر واضح ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے اعلان نبوت فرمانے کے بعد جس نے سب سے پہلے پیغام الٰہی قبول کیا، نبوت کی تصدیق اور رسالت کی معاونت کا فریضہ انجام دے کر ابدی سعادت حاصل کی وہ حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شکل میں ایک ام المؤمنین ہی تھیں۔ آپ نے حضور اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت کی شہادت بھی دی نیز مذہب اسلام کے فروغ واشاعت میں جان ومال ہر طرح سے حصہ بھی لیا اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب وآلام کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کیا۔ ”سیرت ابن ہشام“ کا درج ذیل اقتباس حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دینی خدمت کے سلسلے میں ایمان افروز ہے:

”حضرت خدیجہ بنت خویلد نبی اکرم پر ایمان لائیں، اللہ رب العزت کی طرف سے جو دین آپ لائے تھے اس کی تصدیق کی۔ حضور کی تبلیغی مساعی میں معین ومددگار ثابت ہوئیں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور آپ کے ماننے والوں میں پہلی شخصیت ان کی تھی۔ اللہ تعالی نے ان کے ذریعے اپنے نبی کا بوجھ ہلکا کیا۔ رسول اللہ اپنی تردید یا تکذیب یا کوئی بھی تکلیف دہ بات سنتے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے لیکن جب آپ حضرت خدیجہ کے پاس پہنچتے

تو اللہ تعالی ان کے ذریعہ ان تکالیف کو دور فرمادیتا، حضرت خدیجہ آپ کو ثابت قدم رکھتیں، آپ کا غم ہلکا کرتیں۔ آپ کی باتوں کی تصدیق کرتیں اور لوگوں کے رویئے کی تحقیر اور مذمت فرماتیں۔(1)

حضرت سیدہ خدیجہ کی بے مثال و بے نظیر خدمات ہی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ سے بے حد محبت و انسیت تھی اور جس سال آپ کا انتقال ہوا حضور اکرم ﷺ نے اس سال کو "عام الحزن" یعنی غم کا سال قرار دیا تھا۔ ایک موقع پر حضور نے حضرت خدیجہ کی دینی خدمات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے درج ذیل کلمات ارشاد فرمائے جس سے ان کی شان و شوکت بھی ظاہر ہوتی ہے اور ان کی مذہبی و اسلامی خدمات کی عظمت و رفعت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اے عائشہ! اس دنیا میں خدیجہ کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔۔ میرے اعلان نبوت کے بعد جب تمام دنیائے کفر و شرک میری رسالت کا انکار کر رہی تھی خدیجہ ہی وہ واحد ہستی تھی جو مجھ پر ایمان لائی۔ جب میرا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور تجارتی کاروبار نبوت و رسالت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ٹھپ ہو چکا تھا یہ خدیجہ ہی تھی جنھوں نے اپنے مال سے میری مدد کی اور فریضہ نبوت کی بجا آوری میں میری تائید و حمایت کی بھر فرمایا یہ خدیجہ ہی تھیں جنہیں اللہ نے میری اولاد کے لیے منتخب فرمایا"۔(2)

حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت سودہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کے عقد میں آئیں اور انہیں ام المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے بھی دین متین کی تبلیغ و اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ آپ کی تبلیغ کا وصف خاص غربا و مساکین اور بیوہ و یتیم کی خدمت کرنا تھا۔ آپ اپنے مال سے مخلوق خدا کی خدمت کرتیں، اسلام اور مسلمانوں کو جہاں مالی امداد کی ضرورت ہوتی آپ بے دریغ خرچ کرتیں تھیں۔ امام محمد بن سیرین کی درج ذیل روایت خوب ہے:

"ایک مرتبہ حضرت عمر نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے آپ نے پوچھا: اس میں کیا ہے؟ اس نے کہا: اس میں درہم ہے۔ حضرت سودہ نے فرمایا: کھجور کی طرح تھیلی میں درہم بھیجتے ہیں۔ یہ کہہ کر اسی وقت سب درہم تقسیم کردیا"۔(3)

پھر حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ کو ام المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے ذریعہ دین متین کی جو خدمات اللہ رب العزت نے لی وہ جگ ظاہر ہے۔ آپ کی خدمات کا دائرہ تقریبا دین کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ علوم اسلامیہ کی درسگاہ سے لے کر حرب و ضرب کی آماجگاہ تک ہر شعبے میں آپ کی دینی خدمات کا چراغ روشن ہوا۔ علوم اسلامیہ کی خدمات کے سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہی کافی ہے:

﴿خذوا شطر دینکم عن هذه الْحُمَيْرَاءِ﴾(4)

ترجمہ: تم اپنا آدھا دین اس پیکر حسن وجمال یعنی عائشہ سے حاصل کرو۔

غزوات میں بھی آپ نبی اکرم کے ساتھ شریک ہوئیں اور نہ صرف شریک ہوئیں بلکہ دلیری و شجاعت کا مظاہرہ بھی کیا۔ غزوۂ احد میں ان کی شمولیت اور خدمت کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان پڑھ کر فرط عقیدت سے نگاہیں جھک جاتی ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”جب غزوۂ احد میں لوگ حضور اکرم ﷺ سے دور ہوگئے تو میں نے حضرت عائشہ بنت ابو بکر اور حضرت ام سلیم کو دیکھا کہ دونوں نے اپنے دامن سمیٹے ہوئے ہیں۔ دونوں اپنی کمر پر پانی کی مشک لاد کر لاتی ہیں اور پیاسے مسلمانوں کو پلاتی تھیں۔ پھر لوٹ جاتیں اور مشکیزے بھر کر لاتیں اور پیاسے مسلمانوں کو پانی پلاتیں“۔(5)

زینب بنت جحش حضور کی زوجہ اور مومنین کی ماں ہیں ان کے متعلق حضرت سیدہ عائشہ کا یہ ارشاد ان کی دینی ومذہبی خدمات کا غماز ہے: ”بخدا میں نے سیدہ زینب بنت جحش سے بڑھ کر دین دار، پرہیز گار، صداقت پسند، صلہ رحمی کرنے والی اور صدقہ و خیرات کرنے والی کوئی دوسری خاتون نہیں دیکھی۔ وہ جو مال اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کرتی اس کو کمانے کے لیے بہت زیادہ محنت کرتی تھیں“(6)

الغرض امہات المؤمنین کی دینی و مذہبی خدمات کے سلسلے میں یہ چند شواہد بطور نمونہ ہیں ورنہ تمام ازواج مطہرات کی مبارک زندگی کا لمحہ لمحہ دین متین کی سربلندی، قرآن واحادیث کی ترویج واشاعت، اور فروغ مذہب اسلام سے عبارت ہے۔

فقہی خدمات:

فقہ اسلام کا ایک اہم شعبہ ہے اس کی اہمیت و افادیت خود قرآن مجید نے بیان فرمائی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾(7)

ترجمہ: اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ] فقہ[حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں۔

نیز حدیث شریف ہے:

﴿مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ﴾ (8)

ترجمہ: اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں صحیح فقہ عطا فرمادیتا ہے۔

اللہ تعالی نے حضور کی زوجیت کے لیے جن مقدس خواتین کا انتخاب فرمایا تھا انہیں عقل و شعور، فہم و فراست اور اعلی بصیرت و بصارت کی دولت سے بھی مالامال فرمایا تھا۔ چنانچہ ان مقدس خواتین نے حضور کی زوجیت کا شرف حاصل کر کے اسلامی علوم و فنون میں درک حاصل کیا اور احکام و مسائل سے آگاہی حاصل کر کے فقہ میں مہارت حاصل کی اور اسلام کی اولین فقیہ کی حیثیت سے متعارف ہوئیں۔

حضور اکرم کی حیات طیبہ میں امہات المؤمنین امت کی خواتین کو مسائل شرعیہ کی تعلیم فرماتیں، فقہیات کا درس دیتیں، خواتین کے احکام و مسائل کی توضیح و تشریح کا فریضہ انجام دیتی تھیں۔ حضور اکرم کے وصال فرمانے کے بعد بھی امہات المؤمنین تا حین حیات اس کار اہم میں ہمہ تن مصروف نظر آتی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ کی زوجہ ہونے کی حیثیت سے انہیں حضور کا انتہائی قرب حاصل تھا اور ہمہ دم انہیں فہم قرآن و سنت کا موقع میسر رہتا تھا۔ اس سبب سے بہت سارے خانگی امور، عورتوں کے مخفی مسائل اور شرعی احکام کی تشریح و توضیح میں صحابیات کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ بھی امہات المؤمنین کی طرف رجوع کرتے تھے بلکہ بہت سارے مختلف فیہ مسائل مین فقہاء صحابہ امہات المؤمنین کی طرف رجوع لاتے اور امہات المؤمنین قرآن و سنت کی روشنی میں

ان مسائل کا حل بتاتی تھیں۔ ایسی بکثرت مثالیں کتب احادیث و سیر کی زینت ہیں جن سے امہات المؤمنین کی عظمت و رفعت اور بے نظیر و بے مثال فقاہت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صرف ایک مثال ہدیۂ ناظرین ہیں:

دو جلیل القدر فقیہ صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے درمیان افطاری کے وقت کے متعلق فقہی اختلاف ہوا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ افطاری و نماز میں جلدی کے قائل تھے اور ابو موسیٰ اشعری تاخیر کے قائل تھے۔ چنانچہ اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالی اجمعین نے امہات المؤمنین کی متبرک جماعت میں سے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری دی۔ چنانچہ ابو عطیہ کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ کی خدمت میں پیش کیا تو صدیقہ نے دریافت فرمایا کہ:

﴿أَيُّهُمَا الَّذِي يُعَجِّلُ الْإِفْطَارَ وَيُؤَخِّرُ السُّحُورَ؟»، قُلْتُ: عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ، قَالَتْ: «هَكَذَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْنَعُ﴾ (9)

یعنی: افطار و نماز میں کون صاحب تعجیل سے کام لیتے ہیں اور کون تاخیر کے قائل ہیں؟ ابو عطیہ نے عرض کیا عبد اللہ بن مسعود تعجیل کے قائل ہیں۔ اس کے بعد سنت کی روشنی میں اس مسئلہ پر فیصلہ سناتے ہوئے سیدہ عائشہ نے ارشاد فرمایا: ”رسول اللہ کی عادت کریمہ یہی (تعجیل کی) تھی۔

امہات المومنین کی قرآنی خدمات

غار حرا میں حضور اکرم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور سورہ اقرأ کی ابتدائی چند آیات لے کر آپ ﷺ اپنے کاشانۂ انور میں داخل ہوئے۔ کلام الٰہی کی ہیبت و جلال سے آپ پر لرزہ طاری تھا۔ حضور کی یہ کیفیت دیکھ کر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی بخش الفاظ کہے۔ جس سے کچھ سکون ہوا تو حضور اکرم ﷺ نے نزول وحی کا تذکرہ کیا اس موقع پر حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ ایمان افروز الفاظ ادا کیے تھے:

”مبارک ہو! اور آپ کو بشارت ہو! اللہ تعالی آپ کے ساتھ سوائے خیر اور بھلائی کے کچھ نہ کرے گا۔ جو منصب اللہ تعالی کی طرف سے آپ کے پاس آیا ہے اسے قبول کیجیے۔ وہ بلاشبہ حق ہے اور آپ کو خوشخبری ہو کہ آپ اللہ تعالی کے رسول برحق ہیں۔“(10)

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ بہ بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ قرآن و صاحب قرآن کی نصرت و حمایت کا اولین فریضہ تاریخ اسلامی میں سب سے پہلے امہات المؤمنین کی سرخیل سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا ہے۔ اور پھر بعد کی تمام ازواج مطہرات نے اس فریضہ دینی کو بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ حفظ کلام اللہ کے سلسلے میں خود قرآن مجید نے امہات المؤمنین کو حکم دیا تھا ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا﴾(11)

اور یاد کرو جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں اللہ کی آیتیں اور حکمت بے شک اللہ ہر باریکی جانتا خبردار ہے۔

امہات المؤمنین نے اس حکم باری پر بہ تمام و کمال عمل کیا۔ قرآن مجید کو حفظ کیا۔ قرآن کے علوم و معارف اور اس کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی تفاسیر و شان نزول وغیرہ کی تفاصیل بھی معلوم کیا۔ اور پھر دعوت و تبلیغ، درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ ان علوم کو امت تک پہنچانے کا اہم فریضہ انجام دیا۔ لاریب علوم قرآن کا جو ذخیرہ آج ہمارے سامنے موجود ہے اس کا بڑا حصہ امہات المؤمنین کی خدمات کا مرہون منت ہے۔ اس لیے جب جب قرآنی خدمات کے حوالے سے امت کی خدمات کا تذکرہ ہوگا تو امہات المؤمنین کی خدمات جلیلہ کا تذکرہ سرفہرست کیا جائے گا۔ یہاں خدمت قرآن و تفسیر کے حوالے سے تمام امہات المؤمنین کی خدمات کا احاطہ مقصود نہیں ہے اور نہ یہ مختصر مضمون اس امر کا متحمل ہے بس ان کی قرآنی خدمات کے ذکر سے حصول برکت مقصود ہے اس لیے ذیل میں اختصار کے ساتھ صرف ایک مثال درج ہے: سورہ نساء کی آیت نمبر ۳ میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ أَدْنَى أَلَّا تَعُولُوا﴾(12)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں میں انصاف نہ کروگے تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمہیں خوش آئیں دو دو اور تین تین اور چار چار پھر اگر ڈرو کہ دو بیبیوں کو برابر نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی کرو یا کنیزیں جن کے تم مالک ہو یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو۔

اب اس آیت کے معنی و مفہوم کی وضاحت کے لیے جلیل القدر تابعی حضرت عروہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری دی اور اس کی وضاحت طلب کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہانے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”اے میرے بھانجے یہ حکم اس یتیم لڑکی سے متعلق ہے جو اپنے سرپرست کی کفالت میں ہو۔ وہ لڑکی اپنے کفیل کے مال میں اس کی شریک ہوتی ہے لہذا اگر وہ سرپرست اس یتیم بچی کے مال پر ریجھ جائے اور اس لڑکی کی خوبصورتی کی وجہ سے وہ سرپرست چاہے کہ وہ اس لڑکی سے بغیر مہر کے نکاح کرلے اور وہ اسے فقط اتنا نان و نفقہ دینا چاہے جتنا اسے دوسرا مرد دینا چاہے تو اس آیت میں ایسے کفیل و سرپرست کو اس کی زیر کفالت یتیم لڑکی سے بغیر انصاف کے نکاح کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ بلکہ اگر وہ سرپرست اس یتیم سے نکاح کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ اعلیٰ مہر کے ساتھ وہ اس یتیم لڑکی سے نکاح کرے۔(13)

اس سے معلوم ہوا کہ امہات المومنین امت کی وہ عظیم شخصیات ہیں جنہوں نے قرآن اور علوم قرآن کی بیش بہا خدمات انجام دی ہے۔ آج امت کے سامنے علوم قرآن کا جو قیمتی اثاثہ ہے اس میں امہات المومنین کا بڑا حصہ ہے۔

مرویات حدیث اور امہات المؤمنین

حدیث کا تعلق حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال اور تقاریر سے ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ حضرات امہات المؤمنین امت کی وہ خوش بخت خواتین ہیں جنہیں ازواج نبی ﷺ ہونے کی حیثیت سے حضور سے حد درجہ قرب حاصل تھا۔ انہیں سفر و حضر میں حضور اکرم ﷺ کی معیت حاصل ہوتی تھی۔ حضور ﷺ مسند وعظ پر ہوتے تو تمام لوگوں کے ساتھ امہات المؤمنین بھی پردہ کے اوٹ سے سماع حدیث کیا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ گھر میں جلوہ افروز ہوتے تو امہات المؤمنین حضور ﷺ کے اقوال و افعال کا مشاہدہ کر رہی ہوتیں تھیں۔ جن مسائل کو سمجھنے میں دقت پیش آتی اسے براہ راست آپ ﷺ سے معلوم کر لیتی تھیں، اور اس طرح دیگر حضرات صحابہ و صحابیات کے نسبت امہات المؤمنین کو اخذ حدیث کا زیادہ موقع فراہم ہوتا تھا۔ اس حسین موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امہات المؤمنین نے خوب احادیث محفوظ کی اور امت کو حضور ﷺ کی خلوت و جلوت

سے آگاہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ کے خانگی اور معاشرتی طرز عمل کو بیان کر کے خدمت حدیث کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ حضرات امہات المؤمنین سے کثیر روایات منقول ہیں جو کتب حدیث کے افق پر چاند ستاروں کے مانند جگمگا رہی ہیں۔ ذیل میں امہات المؤمنین میں سے ہر ایک کی مرویات کی تعداد کو قلمبند کر رہی ہوں۔

حضرت سیدہ عائشہ کی مرویات کی تعداد دو ہزار دس ہے۔ ایک سو چوہتر مرویات میں بخاری و مسلم متفق ہیں جب کہ امام بخاری چون مرویات میں اور امام مسلم انہتر مرویات میں منفرد ہیں۔

حضرت سیدہ حفصہ سے ساٹھ احادیث مروی ہیں۔ چھ میں امام بخاری و مسلم متفق ہیں جبکہ چھ مسلم میں ہے اور بقیہ احادیث دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں۔

حضرت ام سلمہ سے مروی احادیث کی تعداد تین سو اٹھتر ہے۔ ان میں سے تیرہ احادیث بخاری و مسلم میں ہیں۔ بقیہ دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں۔

حضرت سیدہ ام حبیبہ کی مرویات کی تعداد پینسٹھ ہے۔ دو حدیث بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہیں جبکہ دو حدیث میں امام مسلم منفرد ہیں۔

حضرت ام المومنین سے چوہتر احادیث مروی ہیں۔ سات احادیث بخاری و مسلم میں متفق ہیں۔ ایک میں امام بخاری اور ایک میں امام مسلم منفرد ہیں۔ بقیہ مرویات دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں۔

حضرت سیدہ جویریہ سے کل سات احادیث مروی ہیں۔

حضرت زینب بنت جحش سے گیارہ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو میں امام بخاری و مسلم متفق ہیں۔ بقیہ نو مرویات دیگر کتب احادیث میں ہیں۔

سبحان اللہ! اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امہات المومنین میں سے تقریباً سبھی نے روایت حدیث کا فریضہ انجام دیا ہے اور آج ان کی یہ روایات حضور اکرم ﷺ کی عادات و اطوار، احوال و اخلاق، فضائل و کمالات کے علاوہ کثیر مسائل و احکام کے جاننے کا سرچشمہ ہیں۔

اہل اسلام کی مادران شفیق
بانوان طہارت پہ لاکھوں سلام

مصادر و مراجع

(1) سیرت ابن ہشام ج2 ص77

(2) سبل الھدی، ج9، ص386

(3) الاصابة فی تمیز الصحابة۔ ج7 ص127

(4) البدایہ والنہایہ۔ ج8 ص29

(5) بخاری۔ 4272

(6) مسلم۔ 2442

(7) سورہ توبہ۔ آیت 122

(8) بخاری۔ الحدیث 71

(9) سنن نسائی۔ الحدیث 2158

(10) فتح الباری، ج21 ص315

(11) سورہ احزاب۔ آیت 43

(12) سورہ نساء، آیت 3

(13) صحیح بخاری 2494۔ مسلم 3018

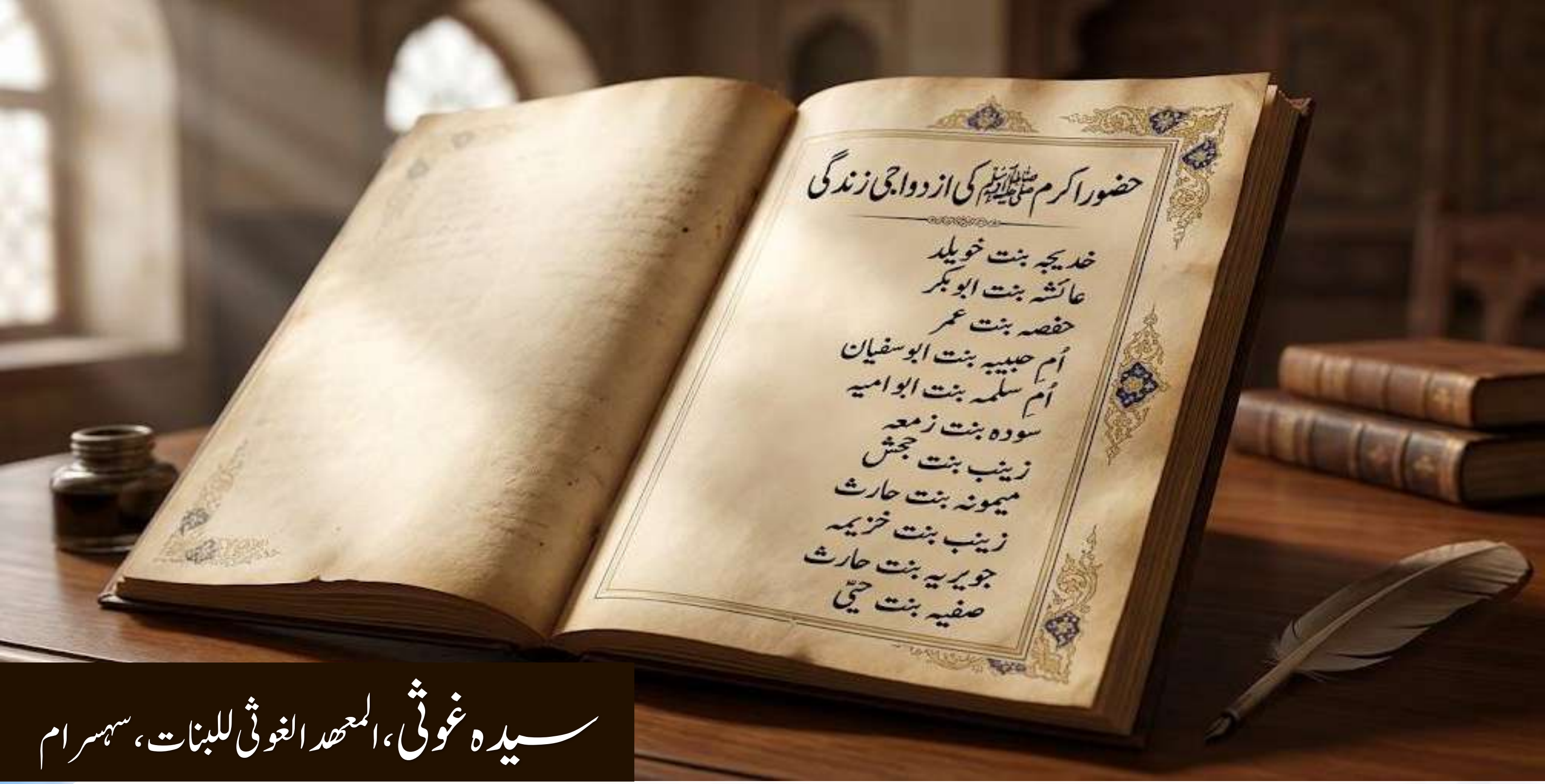

سیدہ غوثی، المعہد الغوثی للبنات، سہسرام

لاریب حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے تمام گوشے اور پہلو اہل ایمان کے لیے نمونہ عمل اور واجب التقلید واتباع ہیں۔ ان گوشوں میں ازدواجی زندگی کے لیے بھی انتہائی مبارک وتابناک ودرخشندہ پہلو ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اس لیے نکاح کو بنظر محبوب دیکھا گیا ہے۔ اسلام کی نظر میں شادی کا مقصد فقط شہوت نفسانی کی تکمیل اور جنس مخالف سے لطف اندوز ہونا نہیں ہے بلکہ اسلام میں نکاح ہمہ گیر مقاصد کے لیے رکھا گیا ہے اس ضمن میں چند احادیث ملاحظہ کیجیے: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّينِ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِي﴾(1)

جب بندہ نے نکاح کر لیا تو اس کا نصف دین مکمل ہو گیا۔ اب اسے چاہیے کہ باقی نصف میں خشیت الٰہی ملحوظ رکھے۔

نیز ارشاد ہے:

﴿مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللَّهُ إِلَّا ذُلًّا، وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللَّهُ إِلَّا فَقْرًا، وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِحَسَبِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللَّهُ إِلَّا دَنَاءَةً، وَمَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لَمْ يَتَزَوَّجْهَا إِلَّا لِيَغُضَّ بَصَرَهُ أَوْ لِيُحْصِنَ فَرْجَهُ، أَوْ يَصِلَ رَحِمَهُ بَارَكَ اللَّهُ لَهُ فِيهَا، وَبَارَكَ لَهَا فِيهِ﴾(2)

جو کسی عورت سے اس کی عزت کی وجہ سے نکاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ذلت ہی بڑھائے گا۔ جو اس کے مال کی وجہ سے نکاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی محتاجی میں ہی اضافہ کرے گا۔ جو اس کے حسب ونسب کی وجہ سے نکاح

کرے گا تو اللہ اس کی کمتری مزید بڑھادے گا اور جو کسی عورت سے صرف اس لیے نکاح کرے گا کہ اپنی نگاہوں یا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے یا صلہ رحمی کرے تو اللہ اس مرد کے لیے اس عورت میں اور عورت کے لیے اس مرد میں برکت دے گا۔

سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے:﴿ النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي، فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي، وَتَزَوَّجُوا، فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ ﴾(3)

یعنی: نکاح میری سنت ہے تو جو میری سنت پر عمل پیرا نہ ہو وہ مجھ سے نہیں۔ نکاح کرو اس لیے کہ میں تمہاری کثرت سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

اسی میں یہ حدیث بھی مروی ہے:

﴿يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ﴾(4)

یعنی: اے گروہ نوجوان: تم میں سے جو کوئی عورت رکھنے کی طاقت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نکاح کرلے۔ اس لیے کہ وہ نگاہوں کو جھکانے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا ہے۔

الغرض اس طرح کی کثیر احادیث سے معلوم ہوتا ہے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کے نزدیک نکاح کا مقصد صرف شہوت رانی نہیں ہے بلکہ نکاح کے ہمہ گیر مقاصد ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی تو بنی نوانسانی کے لیے اسوہ وقدوہ ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ازدواجی زندگی جو کہ ہر فرد بشر کے لیے ضروری ہے اس میں حضور ﷺ کی زندگی سے رہنمائی کا چراغ نہیں روشن ہوتا چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ازدواجی زندگی میں بھی اپنی سیرت و کردار کے چراغ روشن کیے اور ازواج مطہرات کے ساتھ حسن سلوک، اعلی اخلاق، بلند کردار، بے مثال محبت و الفت کے ذریعہ خانۂ نکاح کو رشک جنت بنادیا اور اپنی حسن معاشرت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:﴿ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي﴾(5)

یعنی: تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر ہو اور میں اپنے اہل وعیال کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طویل روایت میں ہے کہ: ابو زرع کی بیوی نے اپنے پہلے شوہر کی بے حد تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میرے دوسرے شوہر نے بھی مجھ پر انعام و اکرام کی بارش کی لیکن اس دوسرے خاوند کی دی ہوئی ساری چیزوں کو بھی جمع کرلوں تو بھی ابو زرع کے ایک برتن کو نہیں پہنچ سکتیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ کہتی ہیں اس پر حضور نے ارشاد فرمایا:

﴿كُنْتُ لَكِ كَأَبِي زَرْعٍ لِأُمِّ زَرْعٍ﴾

میں تمہارے لیے ایسا ہی ہوں جیسا کہ ابو زرع ام زرع کے لیے۔(6)

دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: مگر ابو زرع نے انہیں طلاق دے دی اور میں نے تم کو طلاق نہیں دی۔(7)

حضور اکرم ﷺ کے ارشاد عالی شان کو سن کر حضرت عائشہ صدیقہ جو عرض کیا وہ اہل ایمان کے لیے فرحت و سرور کا ذریعہ اور اقوام عالم کے لیے رشد و ہدایت کا منبع ہے۔ آپ بارگاہ رسالت میں عرض کرتی ہیں:

﴿بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي، بل أَنْت خير لي من أبي زرع﴾(8)

یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان سچ یہ ہے کہ آپ مجھ پر ابو زرع سے بھی بہتر ہیں۔

لاریب حضور اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی مثالی ہے، آپ اپنی ازواج سے لطف و کرم، محبت اور حسن سلوک فرماتے، اظہار ہمدردی کرتے، ان کے حسن سلوک کو یاد رکھتے، ان کی خدمات پر انہیں داد تحسین دیتے، ان کی عزت افزائی فرماتے اور ان کے عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ حضرت سیدہ خدیجہ کبری رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی پہلی زوجہ ہیں جنہیں ۲۵ سالہ رفاقت کی سعادت حاصل رہی ہے۔ اس لمبے عرصہ میں انہوں نے بے لوث خدمت انجام دی اور ہر مقام اور ہر حال میں آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہیں۔ حضور اکرم ﷺ ہمیشہ آپ کا تذکرہ فرماتے، آپ کی خدمات کو یاد رکھتے، آپ سے محبت کا اظہار فرماتے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی درج ذیل روایت خوب ہے: حضرت عائشہ کہتی ہیں:

﴿مَا غِرْتُ عَلَى أَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَا غِرْتُ عَلَى خَدِيجَةَ، وَمَا رَأَيْتُهَا، وَلَكِنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا، وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يُقَطِّعُهَا أَعْضَاءً، ثُمَّ

يَبْعَثُهَا فِي صَدَائِقِ خَدِيجَةَ، فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهُ: كَأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا امْرَأَةٌ إِلَّا خَدِيجَةُ، فَيَقُولُ «إِنَّهَا كَانَتْ، وَكَانَتْ، وَكَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ»(9)

مجھے رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی پر بھی اتنی غیرت نہیں آتی جتنی حضرت خدیجہ الکبری پر آتی۔ میں نے ان کی زیارت نہیں کی تھی لیکن حضور اکرم ﷺ آپ کا سب سے زیادہ ذکر فرمایا کرتے تھے۔ اور بارہا ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ بکری ذبح فرما کر اس کے ٹکڑے کرتے پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کی طرف بھیجتے، کبھی کبھی میں حضور اکرم ﷺ سے عرض کرتی ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں ان کے علاوہ اور کوئی بیوی نہیں۔ تو آپ ارشاد فرماتے: وہی تو تھیں اور انہیں سے میری اولاد ہوئی۔

حسن معاشرت اور اہل خانہ سے اظہار محبت کا یہ انداز بھی ملاحظہ کیجیے:

﴿كُنْتُ أَتَعَرَّقُ الْعَظْمَ وَأَنَا حَائِضٌ، فَأُعْطِيهِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ فَمَهُ فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي فِيهِ وَضَعْتُهُ، وَأَشْرَبُ الشَّرَابَ فَأُنَاوِلُهُ فَيَضَعُ فَمَهُ فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي كُنْتُ أَشْرَبُ مِنْهُ﴾(10)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ مجھے برتن دیتے اور میں اس سے پیتی حالاں کہ میں حالت حیض میں ہوتی۔ پھر میں وہ برتن واپس کرتی تو حضور اکرم ﷺ میرے منہ کی جگہ ڈھونڈتے اور اس جگہ کو اپنے منہ پر رکھتے۔

نرمی، ملاطفت کا حال جاننا ہو تو صحیح بخاری کے اس واقعہ کو بھی پڑھیے کہ: ”ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سیدہ عائشہ کے یہاں ان کی باری میں موجود تھے، چند صحابہ بھی کھانے پر مدعو تھے۔ ابھی صدیقہ کے یہاں کھانا تیار نہیں ہوا تھا کہ حضرت زینب بنت جحش [بعض علمانے کہا کہ یہ کھانا بھیجنے والی سیدہ صفیہ یا سیدہ ام سلمہ تھیں] نے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا کھانا حضور کی خدمت میں بھیجا، اس پر حضرت عائشہ کو غیرت آئی، چنانچہ جس برتن میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کھانا بھیجا تھا وہ برتن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مار گرایا۔ وہ برتن بھی ٹوٹ گیا اور کھانا بھی گر گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس برتن کے ٹکڑوں کو جمع کر کے انہیں جوڑا اور پھر اس میں کھانا بھی اٹھایا اور موجودین سے فرمایا کہ آپ لوگ کھائیں۔ تمہاری ماں نے اس معاملہ میں غیرت کھائی ہے۔ اس کے بعد

حضرت عائشہ نے کھانا پکا کر اپنے برتن میں حضور کو پیش کیا تو آپ ﷺ نے وہ پیالہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر بھیج دیا۔(11)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ سے غیرت ظاہر ہوئی جس کے نتیجے میں وہ پیالہ اور جو کچھ اس میں تھا گر گیا اس پر حضور ﷺ نے خفگی اور ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا بلکہ انتہائی متانت و سنجیدگی اور اظہار ہمدردی کے ساتھ اس پیالے کو خود اٹھایا اور جب حضرت عائشہ کا پیالہ پیش خدمت ہوا تو اظہار ہمدردی کے طور پر وہ پیالہ ام سلمہ کے گھر بھیج دیا۔

ازواج مطہرات کے درمیان عدل و انصاف بھی حضور اکرم ﷺ کا درجہ کمال پر تھا۔عدل و انصاف کے پیش نظر ہی حضور اکرم ﷺ نے ازواج مطہرات کے درمیان باریاں مقرر فرمائیں۔ آپ اس باری کا مکمل خیال فرماتے تھے، یہاں سیرت طیبہ کا یہ پہلو قابل غور ہے کہ ازواج مطہرات کے لیے باری ضرور مقرر تھی اور آپ ﷺ اس دن رات وہیں گزارتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس روز آپ دیگر ازواج مطہرات کی خبر گیری نہ کرتے ہوں بلکہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دن آپ اپنی تمام ازواج کی خبر گیری فرماتے، ان کے پاس تشریف لاتے، ان کے احوال دریافت کرتے،ان کی ضرورتوں کی تکمیل فرماتے پھر اخیر میں ان زوجہ کے گھر تشریف لے آتے جن کی باری ہوتی۔ اور انہیں خدمت کا موقع فراہم کرتے چنانچہ حدیث میں ہے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے فرماتی ہیں کہ اے بھانجے! رسول اللہ ﷺ ہماری باری کے معاملے میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے اور کوئی ایسا دن نہیں ہوتا جس میں رسول اللہ ﷺ ہم سب کے پاس تشریف نہ لاتے یہاں تک کہ اخیر میں آپ ﷺ اپنی اس زوجہ تک پہنچتے جس کی باری کا دن ہوتا اور اسی کے پاس رات گزارتے۔(12)

حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ لطف و مزاح بھی فراماتے اور ان کی دلجوئی و دل بستگی کا سامان بھی مہیا کرتے تھے اور ان کی طبعی فرحت و سرور کا مکمل خیال فرماتے تھے،اس سلسلے میں مسلم کی درج ذیل روایت ملاحظہ کیجیے:

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں عید کے دن حبشی آئے۔ وہ ڈھالوں اور نیزوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ جب میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم دیکھنا چاہتی ہو؟ میں نے عرض کی ہاں! آپ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا، فرمایا بنو ارفدہ شروع کرو۔ جب میں تھک گئی تو فرمایا: کیا کافی ہے؟ میں نے عرض کی: جی۔(13)

حضرت عائشہ صدیقہ سے ہی روایت ہے کہ: آپ ایک سفر میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ: ﴿فَسَابَقْتُهُ فَسَبَقْتُهُ عَلَى رِجْلَيَّ. فَلَمَّا حَمَلْتُ اللَّحْمَ سَابَقْتُهُ فَسَبَقَنِي فَقَالَ: «هَذِهِ بِتِلْكَ السَّبْقَةِ﴾(14)

میں نے نبی اکرم ﷺ سے مقابلہ کیا تو میں آپ پر غالب آگئی پھر جب مجھ پر گوشت چڑھ گیا تو میں نے پھر مقابلہ کیا اور اس بار حضور اکرم ﷺ مجھ پر غالب آگئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس مرتبہ کی جیت تمہاری اس جیت کا بدلہ ہے۔

ہمارے معاشرے میں گھریلو کام کاج گویا عورت ہی کا خاصہ سمجھا جاتا ہے اور عورت کو کام کی مشین تصور کیا جاتا ہے اور خود کو اس سلطنت کا بادشاہ تصور کیا جاتا ہے جہاں اس کے لیے اس کی سلطنت میں ہل کر پانی پینا بھی مزاج شاہی کے خلاف تصور ہوتا ہے لیکن قربان جایئے آقائے کائنات ﷺ کی اعلیٰ سیرت اور بے مثال کردار پر کہ آپ ﷺ ازواج مطہرات پر انتہائی شفیق و رحیم تھے۔ ازواج پر بھی جبر نہیں فرماتے، ان پر کام کا بوجھ نہیں ڈالتے، اپنا کام خود کرتے ساتھ ہی ازواج مطہرات کے خانگی امور میں بھی ان کا ساتھ دیتے اور ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور ان سے تکالیف کو دور کر کے ان کے لیے آسانیاں فراہم کرتے تھے۔ اب اس بات کی شہادت میں درج ذیل حدیث ملاحظہ کیجیے: حضرت عائشہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے کپڑے خود سیتے، خود اپنے نعل مبارک سیتے اور جو عام مرد اپنے اپنے گھروں میں کام کرتے ہیں وہ سب کام حضور اکرم ﷺ بھی خود کیا کرتے تھے"۔(15)

نیز بخاری کی یہ روایت بھی ملاحظہ کیجیے: حضرت اسود بن یزید سے روایت ہے کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ نبی اکرم ﷺ گھر میں کیا کرتے تھے؟ تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَصْنَعُ فِي الْبَيْتِ؟ قَالَتْ: «كَانَ يَكُونُ فِي مِهْنَةِ أَهْلِهِ، فَإِذَا سَمِعَ الأَذَانَ خَرَجَ﴾(16)

آپ ﷺ اپنی ازواج کے کام میں رہتے جب اذان کی آواز سنتے تو باہر نکلتے۔

ازدواجی زندگی میں کبھی ایسا بھی موڑ آجاتا ہے کہ جبکہ کسی کی بات سے کسی کو ٹھیس پہنچ جاتی ہے اور اس کا آبگینۂ دل ٹوٹ جاتا ہے ایسے میں شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی شریک حیات کی دلجوئی کرے اور اس کے قلب نازک کا خیال کرتے ہوئے اس سے دل بستگی کی باتیں کر کے اس کو خوش کر دے۔ اس سلسلے میں بھی حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی عظیم الشان اور بے مثال تھی۔ جب ازواج مطہرات کے درمیان کوئی بات ہو جاتی یا بحث و مباحثہ ہو جاتے جس کی وجہ سے کسی کے دل کو چوٹ پہنچتی اور حضور اکرم ﷺ کو یہ بات معلوم ہوتی تو نبی اکرم ﷺ انہیں محبت بھرے جملے ارشاد فرماتے جس سے ان کے غم دور اور دل میں مسرت کی لہر دوڑ اٹھتی۔ اس کردار کو سمجھنے کے لیے درج ذیل روایت چشم سرور سے پڑھیے۔ حضرت انس سے مروی ہے:

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات پہنچی کہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ: یہودی کی لڑکی تو وہ رونے لگیں۔ نبی اکرم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اس وقت بھی آپ رو ہی رہی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم کو کس نے رلایا؟ انہوں نے عرض کیا کہ حفصہ نے میرے بارے میں کہا ہے کہ میں ایک یہودی کی لڑکی ہوں۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم تو ایک نبی کی بیٹی ہو۔ تمہارے چچا بھی نبی تھے اور ابھی بھی تم ایک نبی کے نکاح میں ہو تو وہ تم پر کس بات کے حوالے سے فخر کرتی ہیں۔ پھر حضور ﷺ نے [حضرت سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے] فرمایا: اے حفصہ اللہ سے ڈرو۔(17)

اس حدیث کے اخیر میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ام المومنین کو اس دل آزاری پر تنبیہ فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ شفقت و محبت، حسن معاشرت و حسن معاملات، نرمی و دل جوئی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ تنبیہ و تعلیم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔

تمام شفقت و محبت کے ساتھ ذکر و فکر، تقوی و پرہیز گاری اور خیر و صلاح کے سلسلے میں بھی حضور اکرم ﷺ اپنی ازواج کو ہمہ دم بیدار رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے گھر کا ماحول جہاں معاشرتی طور پر منور ہوتا تھا وہیں عبادت و یاد الٰہی کے لحاظ سے بھی بقعہ نور بنا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں بے شمار روایتیں کتب احادیث کی زینت ہیں۔

ذیل میں چند احادیث و روایات ملاحظہ کیجیے:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ایک رات نبی اکرم ﷺ بیدار ہوئے اور فرمایا:

﴿سُبْحَانَ اللَّهِ، مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الفِتَنِ، وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الخَزَائِنِ، أَيْقِظُوا صَوَاحِبَاتِ الحُجَرِ، فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الآخِرَةِ﴾ (18)

سبحان اللہ آج رات کتنے فتنے نازل ہوئے اور کتنے خزانے کھول دیے گئے، گھر والیوں کو جگاؤ تو کتنی دنیا میں کپڑے پہنائی جانے والی آخرت میں ننگی ہوں گی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو نبی اکرم ﷺ اپنی ازار کس لیتے یعنی رات میں عبادت کرتے اور اپنے اہل کو بھی جگاتے۔ (19)

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ ایک کھانے کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے آپ پاس گئے اور اسے صاف کیا پھر اسے کھالیا اور فرمایا:

﴿يَا عَائِشَةُ أَكْرِمِي كَرِيمًا، فَإِنَّهَا مَا نَفَرَتْ عَنْ قَوْمٍ قَطُّ، فَعَادَتْ إِلَيْهِمْ﴾ (20)

اے عائشہ! عزت والے کی قدر کرو کیونکہ ایسا نہیں ہوا کہ جب کسی قوم سے یہ ٹکڑا گیا تو دوبارہ ان کے پاس لوٹ کر آیا ہو۔

حضور اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی کے تحت جن احادیث و روایات کا تذکرہ ہوا ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنی تمام ازواج سے محبت و الفت اور احترام و اکرام سے پیش آتے۔ انہیں خوف خدا اور یاد الٰہی سے سرشار رکھتے۔ حضور کی الفت و محبت اور عدل و انصاف کے سبب حضرات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی باہم شیر وشکر رہتی ہیں۔ ایک گھر میں جمع ہوتیں، باہم خوش گوار ماحول میں باتیں کرتیں، ایک دوسرے سے مزہ کرتیں، ایک دوسرے کی مدد کرتیں اور ایک دوسرے کے مقام و مرتبہ اور فضائل و کمالات کا

انشراح صدر کے ساتھ اقرار و اعلان کرتیں تھیں۔ جبکہ دنیوی سطح پر ایسی مثال عنقا ہے۔ در اصل یہ سب حضور اکرم ﷺ کی بے مثال تربیت اور آپ کی نگاہ کرم و بافیض صحبت کا اثر تھا۔

مصادر و مراجع

(مشکاۃ المصابیح ج ۲ ص ۹۳۰)
(المعجم الاوسط۔ ج ۳ ص ۲۱۔ الحدیث ۲۳۴۲)
(سنن ابن ماجہ۔ ج ۱ ص ۵۹۲۔ الحدیث ۱۸۴۶)
(سنن ابن ماجہ۔ ج ۱ ص ۵۹۲۔ الحدیث ۱۸۴۵)
(سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۶۳۶۔ الحدیث ۱۹۷۷)
(صحیح بخاری۔ ج ۷ ص ۲۷ الحدیث ۵۱۸۹)
(عمدۃ القاری۔ ج ۲۰ ص ۱۷۸)
(عمدۃ القاری۔ ج ۲۰ ص ۱۷۸)
(صحیح بخاری۔ ج ۵ ص ۳۸۔ الحدیث ۳۸۱۸)
(سنن النسائی، ج ۱ ص ۶۸۔ الحدیث ۲۵۹)
(بخاری۔ ج ۷ ص ۳۶۔ الحدیث ۵۲۲۵)
(سنن ابی داود ۲۱۳۵)
(مسلم۔ ج ۲ ص ۶۰۹۔ الحدیث ۸۹۲)
(سنن ابی داود۔ ج ۳ ص ۲۹۔ الحدیث ۲۵۷۸)
(صحیح ابن حبان، ۵۶۷۷)
(صحیح بخاری۔ ج ۷ ص ۶۵۔ الحدیث ۵۳۶۳)
(المعجم الکبیر، ۱۸۶)
(صحیح بخاری۔ ج ۱ ص ۳۴۔ الحدیث ۱۱۵)
(صحیح بخاری، ۲۰۲۴)
(سنن ابن ماجہ۔ ج ۲ ص ۱۱۱۲۔ الحدیث ۳۳۵۳)

تاریخ شاہد ہے کہ وہ مبارک و اولعزم شخصیات جنہیں نبوت ورسالت سے سرفراز کیا گیا اور اصلاح ملل کی عظیم ترین ذمہ داری دی گئی انہیں ان کی عظیم الشان ذمہ داریوں کے پیش نظر ان کے لیے بعض احکام و مسائل بھی اقوام عالم سے الگ اور مختلف قرار پائے۔ حضور اکرم ﷺ اللہ رب العزت کے محبوب اور آخری نبی ہیں۔ آپ کی ذمہ داریاں تمام امت سے بہت زیادہ تھیں اس لیے اللہ عزوجل نے کچھ قوانین واحکام ایسے نازل فرمائے جو آپ ﷺ کے لیے خاص قرار پائے اور امت ان قوانین و مسائل سے مستثنیٰ ٹھہری۔ ایسے احکام و مسائل اور فضائل و کمالات کو "خصائص مصطفی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر اکابرین امت نے مفصل کتابیں تحریر فرمائیں ہیں۔ ان خصائص مصطفی علیہ التحیۃ والثناء میں کچھ وہ ہیں جن کا تعلق ان سخت فرائض سے ہیں جو آپ پر لازم تھے اور امت اس حکم سے مستثنیٰ تھی۔ کچھ وہ ہیں جو فضائل و کمالات سے متعلق ہیں جیسے شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کا مسجد حرام سے مسجد اقصی تشریف لے جانا اور وہاں سے ساتوں آسمان کی سیر اور سدرۃ المنتہی اور اللہ رب العزت کو اپنی ماتھے کی آنکھوں سے زیارت کرنا۔ اور کچھ وہ خصائص ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ کو خصوصی مراعات حاصل ہوئی ہے۔ ان خصوصی مراعات میں سے ازدواجی زندگی کے بھی بعض احکام

ہیں۔جس میں حضور اکرم ﷺ کو امت کے بنسبت خصوصی رعایت حاصل ہوئی ہے۔مثلا نکاح سے متعلق امت کو درج ذیل احکام ارشاد ہوئے ہیں:

(۱) امت کے افراد ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار بیویاں اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہیں۔

(۲) جس عورت کے ساتھ امت کے افراد نکاح کریں اس کا مہر ادا کرنا ان پر واجب ہے۔

(۳) ایک شخص کے نکاح میں جتنی بیویاں ہوں ان کے ساتھ برابری کا سلوک واجب ہے۔

(۴) کسی کی بیویوں کی تعداد چار سے کم ہو تو اسے مزید نکاح کرنے سے ممانعت نہیں۔

یہ احکام امت کے لیے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ رب العزت نے امت سے مختلف احکام نازل فرمائے ہیں۔چنانچہ آپ ﷺ کو اجازت تھی کہ:

(۱) آپ ﷺ چار سے زیادہ نکاح فرمائیں اور بیویوں کی تعداد میں کوئی حد مقرر نہیں تھی۔

(۲) یوں ہی مہر ادا کرنا آپ ﷺ پر لازم نہیں تھا چنانچہ ”سورہ احزاب“ کی درج ذیل آیات آپ کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے نازل ہوئیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾(1)

ترجمہ: اے غیب بتانے والے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال فرمائیں تمہاری وہ بیویاں جن کو تم مہر دو اور تمہارے ہاتھ کا مال کنیزیں جو اللہ نے تمہیں غنیمت میں دیں۔اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور پھپیوں اور ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی اور ایمان والی عورت اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کرے اگر نبی اسے نکاح میں لانا چاہے یہ خاص تمہارے لیے ہے۔امت کے لیے نہیں ہمیں معلوم ہے جو ہم نے مسلمانوں

پر مقرر کیا ہے ان کی بیبیوں اور ان کے ہاتھ کی مال کنیزوں میں یہ خصوصیت تمہاری اس لیے کہ تم پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان۔

(۳) اسی طرح حضور اکرم ﷺ کو من جانب اللہ یہ رعایت تھی کہ آپ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم بیویوں کے مابین برابری کا سلوک روا نہ رکھیں گو کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کے مابین برابری کا سلوک قائم رکھا چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَلِكَ أَدْنَى أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا﴾(2)

ترجمہ: پیچھے ہٹاؤ ان میں سے جسے چاہو اور اپنے پاس جگہ دو جسے چاہو اور جسے تم نے کنارے کر دیا تھا اسے تمہارا جی چاہے تو اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں یہ امر اس سے نزدیک تر ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور غم نہ کریں اور تم انہیں جو کچھ عطا فرماؤ اس پر وہ سب کی سب راضی رہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم سب کے دلوں میں ہے اور اللہ علم و حلم والا ہے۔

(۴) عام امتی پر چار بیویوں کی حد کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے کسی بھی مرحلے پر ایک بیوی کو دوسری بیوی سے بدلنے یا کسی اور عورت سے شادی کرنے پر کوئی قانونی پابندی نہیں لیکن نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ جب آپ ﷺ کو مزید نکاح کرنے یا کسی زوجہ کو دوسری زوجہ سے بدلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ارشاد ہوا:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا﴾(3)

ترجمہ: ان کے بعد اور عورتیں تمہیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ ان کے عوض اور بیبیاں بدلو اگرچہ تمہیں ان کا حسن بھائے مگر کنیز تمہارے ہاتھ کا مال اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ زندگی کے مختلف شعبے میں اللہ رب العزت کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے لیے امت کی نسبت مختلف احکام نازل ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کا چار سے زیادہ شادیاں کرنا بھی انہی خصوصی مراعات میں سے ہے جس پر کسی بندۂ خدا کو اعتراض کرنا روا نہیں کہ اللہ رب العزت خالق و مالک ہے وہ جسے چاہے عزت و عظمت سے سرفراز کرے اور جس کے سر پر چاہے خصائص و کمالات کا تاج سجا دے۔ کسی کو اس جناب میں لب کشائی کی جسارت نہیں اور نہ کسی کو اعتراض روا۔

اکثر دشمنان اسلام اور شاتمان رسالت حضور اکرم ﷺ کی بے داغ پاکیزہ زندگی پر تعدد ازدواج کے سلسلے میں اعتراض سادھتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی ناپاک زبان سے ایسی ایسی گستاخانہ باتیں کہی جاتی ہیں جنھیں زبان پر لایا نہیں جاسکتا۔ وہ آپ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے متعدد شادیاں کی ہیں۔ [معاذ اللہ]

علامہ پیر کرم شاہ ازہری صاحب نے اپنی مشہور کتاب "ضیاء النبی" میں دشمنان اسلام کے اس پروپیگنڈہ کا خوب جم کر تعاقب کیا ہے اور ان کے ناپاک اعتراضات کی بخیا ادھیڑ کر رکھ دی ہے جو کسی بھی منصف مزاج قاری کے لیے حضور اکرم ﷺ کے تعدد ازدواج کے حوالے سے برہان ساطع اور دلیل قاطع ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:

"تعدد ازدواج کا دستور ہمیشہ انسانوں میں مروج رہا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بھی انسان کے معاشرتی مقام میں کمی نہیں آئی۔ یہی حال حضور اکرم ﷺ کا بھی ہے۔ لیکن جب ہم حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حضور ﷺ نے تمام شادیاں جنسی جذبے کی تسکین کے پیش نظر کی ہی نہیں تھیں بلکہ شادیوں سے آپ کے مقاصد اتنے بلند تھے کہ مستشرقین ان کے تصور سے بھی قاصر ہیں۔ حضور ﷺ کی شادیوں کے مسئلے پر تفصیلا غور کرنے سے پہلے آپ کی حیات طیبہ کے مندرجہ ذیل حقائق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) حضور ﷺ نے پچیس سال کی عمر تک کوئی شادی نہیں کی۔

(۲) آپ ﷺ کے مردانہ حسن اور نسبی وجاہت کی وجہ سے ان عورتوں کی کمی نہ تھی جو آپ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتی تھیں۔

(۳) آپ ﷺ نے جنسی اباحیت کے ماحول میں اپنا عنفوان شباب تجرد کی حالت میں گزارا لیکن کسی کو آپ کے دامن عفت پر کوئی دھبہ نظر نہیں آیا۔

(۴) آپ ﷺ نے پہلی شادی پچیس سال کی عمر میں کی۔ جس خاتون کو سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنی زوجیت کا شرف بخشا وہ آپ ﷺ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھی، شادی کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ حضور ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے وہ دو خاوندوں کی زوجیت میں رہ چکی تھیں۔

(۵) حضور ﷺ نے اپنی عمر کا پچیس سال کا عرصہ اسی واحد خاتون کے ساتھ گزارا جس کے ساتھ آپ سب سے پہلے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ اپنی عمر کے پچاسویں سال تک اور اپنی زوجہ محترمہ کی عمر کے پینسٹھویں سال تک۔ جب تک آپ کی وہ زوجہ محترمہ زندہ رہیں، آپ ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی۔

(۶) پہلی بیوی کے انتقال کے بعد آپ ﷺ نے جس خاتون سے شادی کی وہ ایک بیوہ اور معمر خاتون تھیں۔

(۷) ایک زوجہ محترمہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا آپ ﷺ کی تمام ازواج مطہرات میں سے کوئی بھی باکرہ نہ تھیں، حالانکہ حضور ﷺ اپنے امتیوں کو باکرہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالی عنہ کے چہرے پر خوش بو اور مسرت کے کچھ آثار دیکھے تو آپ ﷺ نے ان سے یہ گفتگو فرمائی۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: کیا تم نے شادی کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے کسی باکرہ عورت سے شادی کی ہے یا غیر باکرہ سے؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! غیر باکرہ عورت سے شادی کی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کسی باکرہ عورت سے شادی کرنی چاہیئے تھی کہ وہ تمہارے ساتھ دل لگی کرتی اور تم اس کے ساتھ دل لگی کرتے۔ وہ تمہارے ساتھ ہنسی مذاق کرتی اور تم اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے۔

(۸) حضور ﷺ نے متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لینے کے باجود فرمای "مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں ہے۔"

(۹) حضور ﷺ کی اکثر شادیاں پچپن سے لیکر انسٹھ سال تک کی عمر کے درمیان ہوئیں۔ جو شخص حضور کی بیویوں کی تعداد کو گن کر آپ ﷺ کے کردار کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے اور ایسا کرتے وقت مندرجہ

بالا حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے کیا اس شخص کو غیر جانبدار محقق اور انصاف پسند عالم کہا جا سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔
جو شخص پچیس سال کی عمر تک مجرد رہے اور پچیس سے پچاس سال تک کا عرصہ ایک معمر خاتون کی رفاقت میں گزارے اور اس طویل عرصے میں کوئی جذبہ نہ تو اسے کسی غلط کام کی طرف متوجہ کر سکا اور نہ وہ مزید خواتین سے نکاح کا خیال اپنے دل میں لائے کیا یہ بات ممکن ہے کہ جب اس شخص کی عمر پچپن سال ہو جائے تو یکا یک اس کے جنسی جذبات طوفان بن کر امنڈ آئیں اور عورتوں کی کوئی تعداد اسے مطمئن نہ کر سکے۔
ایک شخص جو اپنی خواہشات کا غلام ہو اس کے ہاتھ میں اقتدار بھی ہو، ہزاروں لوگ اس کے اشارۂ ابرو پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار بھی ہوں، قوم کا ہر فرد اس کے ساتھ رشتۂ مصاہرت قائم کرنے کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتا ہو اور حسین سے حسین تر دوشیزاؤں کے ساتھ شادی کرنے کے راستے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو، ایسا شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ اپنی زوجیت کے لیے حسین ترین دوشیزاؤں کو منتخب کرے گا یا اس کی نگاہ انتخاب بیوہ اور معمر خواتین پر پڑے گی؟ یقیناً ایسا شخص اپنی زوجیت کے لیے حسین ترین دوشیزاؤں کو چنے گا اور وہ کسی بیوہ خصوصاً عمر رسیدہ بیوہ سے نکاح کے خیال کو بھی کبھی دل میں نہیں لائے گا۔
حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں، آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی پر بحث کرتے وقت دو چیزوں کو خصوصی طور پر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ آپ ﷺ نے ایک سے زیادہ عورتوں کو زوجیت کا شرف اس وقت بخشا جب آپ ﷺ کی عمر پچپن سال سے متجاوز کر چکی تھی اور پیرانہ سالی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ دوسری چیز یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ حضور ﷺ نے کسی قسم کی مجبوری کے بغیر اپنی زوجیت کے لیے سوائے ایک کے تمام بیوہ خواتین کو منتخب فرمایا۔
ایک تیسری بات بھی اس سلسلے میں ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ جو آدمی خواہش پرست ہوتا ہے وہ صنف نازک کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیویوں کے جائز اور ناجائز مطالبے اور فرمائشیں پوری کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے لیکن حضور ﷺ نے تو مدینہ کا بے تاج بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کاشانۂ اقدس کو فقر کا گہوارہ بنا رکھا تھا، ازواج مطہرات کو آپ نے بیگمات اور رانیوں کی طرح ناز نخرے سے نہیں رکھا بلکہ ایک بار جب انہوں نے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے باذن خداوندی اپنی ازواج مطہرات کو

دوٹوک الفاظ میں بتادیا کہ اگر تم مال و دولت کی خواہش مند ہو تو اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے تمہیں خدا کے رسول سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے گی اور اگر تم خدا کے رسول کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی ہو تو پھر تمہیں قناعت اور صبر و شکر سے گزر بسر کرنی پڑے گی، معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے چاہو تو دنیوی مال و متاع کو اختیار کر لو اور چاہو تو خدا اور خدا کے رسول کو۔ اس پیشکش کے جواب میں تمام ازواج مطہرات نے حضور ہی کو پسند کیا تھا اور کاشانۂ نبوت کی شان فقر و استغناء پر دنیا کی ہر دولت کو قربان کر دیا تھا۔

حضور ﷺ کا اپنی ازواج مطہرات کو یہ اختیار دینا اور اس کے جواب میں تمام ازواج مطہرات کا دنیوی مال و دولت کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر آپ ﷺ کو اختیار کرنا اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کا باہمی رشتہ جنسی خواہشات کی بنیادوں پر قائم نہ تھا بلکہ یہ رشتہ ان عظیم مقاصد کی بنیادوں پر قائم تھا جن کے لیے سب کچھ قربان کیا جاسکتا تھا۔"(4)

پیغمبر اسلام ﷺ کے دامن عصمت کو داغ دار کرنے کی ناپاک کوشش کرنے والے دو طرح کے لوگ ہیں ایک وہ جو غیر الہامی مذہب کے پیروکار ہیں جیسے ہندو وغیرہ۔ دوسرے وہ جو کسی بھی الہامی مذہب کے ماننے والے ہیں جیسے یہود و نصاری۔ دونوں ہی گروپ کے بہت سے افراد اس خباثت کے شکار ہیں۔ وہ رہ رہ کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں اور پیغمبر اسلام کے دامن عصمت کو داغ دار کرنے کی نیت سے جھوٹ اور افترا پردازی کا سہارا لیتے ہیں۔ بالخصوص حضور اکرم ﷺ کے تعدد ازدواج پر ناپاک تبصرہ کرتے ہوئے جنس پرستی کا ناپاک الزام لگاتے ہیں۔ جبکہ خود غیر الہامی مذہب کے اکابرین میں تعدد ازداوج کی رسم عام تھی، اسی طرح اہل کتاب یہود و نصاری جو حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسی اور حضرت داؤد علیہم السلام کی روحانی عظمتوں کے قائل اور ان کی نبوت کے مصدق ہیں۔ ان انبیا کی زندگیوں میں بھی تعدد ازداوج کا ثبوت ملتا ہے۔

غیر الہامی کتب کے مذاہب میں سے ہندو مت کی بات کیجیے تو اس مذہب کے اکابرین کی بھی متعدد بیویاں تھیں۔ مثلا:

(۱) سری رام چندر جی کے والد مہاراجہ دسرت کی تین بیویاں تھیں۔(۲) سری کرشن جی کی جو اوتاروں میں شمار ہوتے ہیں سینکڑوں بیویاں تھیں۔(۳) پانڈوؤں کے جد اعلی راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں۔(۴) بچھتر ایرج کی دو بیویاں اور ایک لونڈی تھی۔ان شواہد کی روشنی میں غیر الہامی مذہب کے ماننے والوں سے الزاماً کہا جاسکتا ہے کہ وہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیں۔اگر ان کے اپنے اکابرین کے یہاں تعدد ازدواج کی رسم عام تھی تو پھر انہیں کسی دوسرے کے تعدد ازدواج پر سوالیہ نشان قائم کرنا ہر گز روا نہیں۔

اسی طرح اہل کتاب یہود و نصاری حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ اور حضرت داود علیہم السلام کو عظیم نبی تسلیم کرتے ہیں۔یہود و نصاری کی الہامی کتابوں سے یہ امر واضح ہے کہ یہ عظیم الشان انبیا بھی تعدد ازدواج پر عمل پیرا تھے۔

(۱) چنانچہ حضرت موسی کی چار بیویاں تھیں اور انہیں اللہ کی طرف سے یہ حکم بھی تھا "اگر تم دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے لیے جاؤ اور تمہارا خدا دشمنوں کو تمہارے قبضے میں دیدے، تم ان کو قیدی بنالو، اور تم ان کے درمیان ایک خوب صورت عورت دیکھو جو تمہیں اچھی لگے اور تم اسے اپنی بیوی بنالو تو تم اسے اپنے گھر میں لاؤ۔ وہ اپنا سر مونڈے اور ناخن تراشے اور غلامی کا لباس اتار کر تمہارے گھر میں رہے اور ایک پورا قمری مہینہ اپنے ماں باپ کا سوگ منائے، اس کے بعد تم اس سے خلوت کرو اور بطور دلہن اسے اپنے قبضے میں لو اور وہ تمہاری بیوی بنے"۔(5)

بائبل کی مذکورہ تعلیمات حضرت موسی علیہ السلام پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کررہی ہیں کہ انہیں اس اجازت پر زندگی میں صرف ایک بار عمل کرنے کا اختیار ہے یا جب کبھی دشمن سے جنگ پیش آئے آپ اس اجازت سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

اسی طرح بائبل میں حضرت داود علیہ السلام کی نو بیویوں اور دس حرموں کا ذکر ملتا ہے۔

یوں ہی بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔

بائبل کے درج بالا شواہد سے یہ منکشف ہوا کہ مذکورہ حضرات انبیا کی بھی متعدد ازواج تھیں اور متعدد عورتوں سے نکاح کرنا منہاج نبوت کے عین مطابق ہے۔لہٰذا اللہ کے رسول آخری نبی حضرت محمد ﷺ کا متعدد عورتوں سے نکاح کرنا طریق انبیا کے مطابق اور منہاج نبوت کے عین موافق ہے۔

مذکورہ گفتگو سے یہ امر منقح ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی مذہب کو مانتے ہیں خواہ وہ مذہب الہامی ہو یا غیر الہامی انہیں حضور اکرم ﷺ کے تعدد ازدواج پر اعتراض کرنے کا بالکل بھی حق نہیں کیونکہ ان کے اپنے اکابر اور ان کی محترم ہستیاں بھی اس کے عامل رہے ہیں۔ اور جو لوگ کسی مذہب کو مانتے ہی نہیں ہیں ان کے لیے اعتراض کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ وہ تو جنسی تعلقات کے لیے نکاح کی قید کو بھی تسلیم کرنے کے درپہ نہیں۔لہٰذا دوسروں پر اعتراض کا انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔(6)

الغرض اللہ رب العزت کی طرف سے رسول اللہ کو نکاح کے سلسلے میں یہ مرعات حاصل تھی کہ آپ جتنی چاہیں شادیاں فرماسکتے تھے۔اور اسی مراعات واجازت کے پیش نظر حضور اکرم ﷺ نے متعدد شادیاں کیں۔

اب رہا یہ معقول سوال کہ اس مراعات واجازت کے پیچھے ربانی حکمت کیا تھی اور کن مقاصد حسنہ کے تحت آپ نے متعدد نکاح فرمائے؟ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات کے لیے حضور اکرم ﷺ کی مدنی زندگی کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو اس تعدد ازدواج کے بے شمار اور ان گنت مقاصد و مصالح اور فوائد سامنے آتے ہیں۔ان بے شمار فوائد و مصالح و مقاصد کو علامہ محمد علی صابونی نے اپنی شہر آفاق کتاب ’’**شبهات و اباطيل حول تعدد زوجات الرسول**‘‘ میں درج ذیل شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱) تعلیمی مقاصد۔(۲) تشریعی مقاصد۔(۳) سماجی مقاصد۔(۴) سیاسی مقاصد۔

حضور کی متعدد شادیوں کے مذکورہ مقاصد وفوائد کے حوالے سے اختصار کے ساتھ ذیل میں روشنی ڈالتے ہیں:

تعلیمی مقاصد:

یہ امر کسی پر مخفی نہیں ہے کہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد اہل ایمان کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔بہت جلد مسلمانوں کی تعداد ہزاروں ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتیں بھی حلقۂ اسلام سے وابستہ ہورہی تھیں مردوں کے ساتھ ساتھ ان خواتین کی دینی تعلیم وتربیت کی

ذمہ داری بھی حضور اکرم ﷺ کے سپرد تھی۔ اور اس امر سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ اللہ تعالی نے انسان کی فطرت و طبیعت میں حیا کا مادہ ودیعت فرمایا ہے۔ عورتوں کے نسوانی زندگی سے متعلق بے شمار مسائل ایسے ہیں کہ جن کے حل و عقد کے لیے کسی مرد کی طرف رجوع کرنے میں عورت کو شرم کا احساس ہوتا ہے پھر عورتوں کے مخفی مسائل پر بات کرنے میں مرد کو بھی حیا آتی ہے۔ اور پھر حضور اکرم ﷺ حد درجہ حیا فرمانے والے تھے جس کی مبارک تفصیل کتب سیر میں موجود ہے۔ ایسے میں خواتین اسلام کی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کے لیے حضور ﷺ کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی کہ جو انتہائی زیرک، داناں، ذہین، فطین، پاکباز، متقی اور دعوت دین میں مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کے کاشانۂ اقدس میں رہنے والی ہوں تاکہ امت کی وہ خواتین جو اپنے مخفی مسائل کو حضور کی بارگاہ میں پیش کرنے میں شرماتی ہیں ان مسائل کو وہ خواتین ان معلمات سے عرض کریں اور وہ معلمات ان مسائل کو حضور کی خدمت میں پیش کر کے جواب حاصل کریں اور اس طرح خواتین میں سے ہر کسی کے لیے احکام و مسائل شرعیہ کی تحصیل آسان ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کار اہم و اعظم انہیں خواتین سے ہو سکتا تھا جو کہ حضور اکرم ﷺ کے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوتیں۔ اور حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہمہ وقت حاضر باش ہوتیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا بعد ہجرت مسلمانوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور ہر دن کثیر تعداد میں مرد و خواتین حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ہزاروں عورتوں کی اصلاح و ہدایت صرف ایک زوجہ سے ہو، یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ امت کی خواتین کو دین اور انہیں اسلامی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے حضور ﷺ نے متعدد نکاح فرمایا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے انہی خواتین کا انتخاب فرمایا جو جہاں دیدہ، بالغ نظر، عقلمند اور مقصد اصلی میں معاون ثابت ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک کے سوا تمام ان خواتین کو اپنے عقد میں لیا جو بیوہ تو تھیں لیکن عقل و خرد اور فہم و فراست میں مکمل، ذہانت و فطانت میں اعلی اور دیانت داری میں بے مثال تھیں۔ اور جس باکرہ کو آپ نے شرف زوجیت بخشا وہ بھی اپنی خداداد فہم و فراست اور عقل و خرد میں ہزارہا مردوں سے بلند و بالا تھیں۔ الغرض امت کی خواتین کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ہدایت کے پیش نظر آپ ﷺ نے متعدد نکاح فرمائے تاکہ وہ خواتین امت کی عورتوں کی مذہبی رہنمائی کریں اور وہ مسائل جو عورتیں براہ راست حضور ﷺ سے پوچھنے میں شرم محسوس کرتی ہوں یا

شرم وحیا کے باعث خود حضور ﷺ تفصیل سے بتانے میں گریز کرتے ہوں ان کی تفصیل ازواج النبی بتائیں اوراس میں شک نہیں حضور ﷺ کی ازواج نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیااور امت کی خواتین کو علم دین سے آراستہ کرنے میں بلند کردار ادا کیا۔کتب احادیث میں ایسی کثیر روایات موجود ہیں جنہیں میرے بیان کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک حدیث ہدیہ ٔقارئین ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:"ایک انصاری عورت نے حضور ﷺ سے غسل حیض کے متعلق سوال کیا۔حضور ﷺ نے اسے غسل حیض کا طریقہ سمجھایا اور پھر فرمایا: ایک خوش بودار روئی کا گالا لو اور اس کے ذریعہ طہارت حاصل کرو۔اس عورت نے عرض کیا: روئی کے گالے کے ذریعے کیسے طہارت حاصل کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔ اس نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں اس کے ذریعے کیسے طہارت حاصل کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ: اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو اس عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اسے بتایا کہ اس روئی کے گالے کو فلاں مقام پر رکھو اور اس کے ذریعے خون کا اثر ختم کرو۔ فرماتی ہیں: میں نے اس عورت کو تفصیل سے سمجھایا کہ روئی کے گالے کو کس مقام پر رکھنا ہے۔(7)

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں طہارت کا مسئلہ کتنا نازک ہے کہ اس سے اکثر عبادات وابستہ ہیں اس اہم مسئلہ سے متعلق ایک خاتون سوال کرتی ہے اور حضور اکرم ﷺ اس کا اختصار کے ساتھ جواب عنایت فرماتے ہیں۔شرم وحیا کے سبب تفصیل بیان کرنے سے گریز فرماتے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ یہاں ایسی خاتون کا ہونا ضروری تھا جو حضور ﷺ کے حبالہ ٔعقد میں ہو تاکہ اس امر کی تفصیل حضور ﷺ سے اچھی طرح معلوم کرکے اس سوال کرنے والی عورت کو سمجھا سکے اور اس مقام پر اسی فریضہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بحسن وخوبی انجام دیا۔یہ تو ایک مثال تھی ورنہ ایسی بکثرت مثالیں دوسری ازواج مطہرات سے متعلق موجود ہیں جن کی رہبری ورہنمائی نے امت کو بے شمار مسائل سے آگاہ کیا۔یہاں یہ خیال رہے کہ ازواج مطہرات کی علمی خدمات کا دائرہ صرف خواتین اسلام تک محدود نہ تھا بلکہ خانگی امور کی روایتیں بھی مرد حضرات کو انہی مقدس خواتین کے ذریعہ پہنچی ہیں۔اس کے علاوہ بے شمار و مسائل واحکامات بھی امت کو امہات المؤمنین کے وجود مسعود کی

برکتوں سے ہی پہونچے ہیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے جن مقاصد خیر کے پیش نظر متعدد عورتوں سے نکاح فرمایا تھا ان میں سے ایک تعلیمی مقصد بھی تھا اور لاریب حضرات امہات المؤمنین تا حین حیات اپنے اس مشن پر اخلاص کے ساتھ عمل پیرا رہیں اور امت کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ہدایت کا بے مثال فریضہ انجام دیتی رہیں۔

تشریعی مقاصد:

تشریعی مقاصد کا معنی ہے وہ حکمتیں کہ جس کے ذریعہ کسی مسئلہ شرعی کا ایضاح و آغاز ہو۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے جس زمانہ میں اعلان نبوت فرمایا اس زمانہ میں جہاں کفر و شرک کا دور دورہ تھا وہیں باطل افکار اور فاسد نظریات کا چلن عام تھا، بے شمار افکار باطلہ اور اوہام فاسدہ کی چکی میں قوم پس رہی تھی چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے دونوں مورچے سنبھالے۔ آپ ﷺ نے جہاں کفر و شرک کے خلاف آواز بلند فرمایا وہیں فاسد افکار اور باطل رسم و رواج کا قلع قمع کیا۔ باطل عقائد و نظریات کی بیخ کنی حضور ﷺ نے عملاً و قولاً دونوں طرح سے فرمائی۔ حضور ﷺ کی بعض شادی اس پس منظر میں بھی ہوئی اور نکاح و نسب کے سلسلے میں اہل مکہ کے جو غلط نظریات تھے حضور ﷺ نے اس کو نہ صرف غلط قرار دیا بلکہ اس پر خود عمل کر کے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرف غلط کی طرح محو کر دیا چنانچہ مکہ مکرمہ میں اعلان نبوت سے قبل ایک انتہائی شنیع رسم قائم تھی کہ ایک شخص کسی اجنبی کو کہہ دیتا کہ تو میرا بیٹا ہے، اس کے اس قول و اقرار سے وہ اس کا بیٹا قرار پاتا اور نسب، میراث، شادی وغیرہ تمام معاملات میں اس کی حیثیت بالکل سگے بیٹے جیسی تصور کی جاتی۔ اس رسم کی وجہ سے معاشرہ میں بہت سی خرافات کا دروازہ کھلتا تھا چنانچہ بہت سے لوگ وراثت سے محروم ہو جاتے اور یہ اکیلا منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا۔ منہ بولے باپ کی محرمات اس کی محرمات ہوتیں جس کے تباہ کن نتائج سامنے آتے۔ اسی طرح کے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ اپنے بیٹے کی مطلقہ کی طرح تصور کی جاتی اور اس طرح منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے ان کے وہم فاسد کے مطابق منہ بولے باپ کا نکاح حرام قرار پاتا، اس رسم کی بیخ کنی کوئی آسان کام نہ تھا کہ پوری قوم اس میں ملوث تھی اور اس کو حق سمجھ کر کرتی تھی۔ ایسی قبیح رسم کو زمین بوس کرنے کے لیے اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کو اس امر کی طرح متوجہ فرمایا چنانچہ اس مسئلہ کی تصحیح کے لیے حضور ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا اور سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح

تشریعی مقصد و حکمت کے پیش نظر ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے عربوں کے دستور کے مطابق حضرت زید رضی اللہ عنہ کو متبنی بنایا، پھر اپنی پھوپھی کی بیٹی حضرت زینب بنت جحش سے ان کا نکاح کر دیا۔ اللہ رب العزت نے منہ بولے بیٹے کے متعلق غلط رسم و رواج کو باطل قرار دینے اور اس کے متعلق صحیح مسئلہ کی وضاحت کے لیے یہ تدبیر فرمائی کہ حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن حارثہ کا نباہ نہ ہو سکا اور پھر حضرت زید نے انہیں طلاق دے کر خود سے الگ کر دیا۔ عدت گزرنے کے بعد اللہ رب العزت نے حکم فرمایا کہ اے محبوب آپ زینب بنت جحش کو اپنے عقد میں لے کر اس باطل روایت کی بیخ کنی کر دیں جو اہل مکہ میں رائج ہے کہ متبنی کی مطلقہ سے منہ بولے باپ کا نکاح درست نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا﴾(8)

ترجمہ: پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا تاکہ]اس عملی سنت کے بعد[ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں۔ اور اللہ تعالی کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔

حضرت زینب بنت جحش نے جب عدت گزار لی تو حضور اکرم ﷺ نے حکم الہی کے پیش نظر ان سے نکاح فرمایا اور اس طرح امت کے سامنے حضور ﷺ کی عملی سنت آگئی اور معلوم ہو گیا کہ متبنی کی مطلقہ سے شادی کی حرمت کا تصور اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ نیز متبنی کا حکم حقیقی بیٹے جیسا نہیں ہے کہ وہ منہ بولے باپ کا وارث بنے یا وہ باپ کی محرمات کے لیے محرم قرار پائے۔ الغرض حضور اکرم ﷺ کے تعدد نکاح کے پیچھے تشریعی حکمت بھی کار فرما تھی۔ اب جسے یہ حکمت نظر نہ آئے تو وہ اپنے دل بے نور کا علاج کرے۔

سماجی حکمت:

اسلام کے ابتدائی مکی دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لیے مشکل ترین ایام تھے۔ ان جاں گسل لمحات میں جن نفوس قدسیہ نے اسلام قبول کر کے حضور ﷺ کی دل و جان سے حمایت کا اعلان کیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا بلکہ انتہائی پر خطر اور ایک طرح سے موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن ان جان نثاروں نے تمام

مظالم کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کیا اور ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کی جو بیان سے باہر ہے، ایسے ہمدردوں اور جانثاروں کو جو صلہ قیامت میں ملنا ہے وہ ملنا ہی ہے دنیا میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اپنے ان غلاموں اور جانثاروں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مختلف طریقوں سے نوازا اور خوب نوازا۔ انہی نوازشات کا اظہار آپ ﷺ نے رشتہ مصاہرت کے ذریعہ بھی کیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جو یار غار اور قافلۂ عشق کے سالار تھے اور پہلے دن سے وہ حضور ﷺ کی ساتھ ساتھ آپ کے مشن کے فروغ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ جن کی خدمات کے اعتراف میں حضور ﷺ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا:

﴿مَا لِأَحَدٍ عِنْدَنَا يَدٌ إِلَّا وَقَدْ كَافَيْنَاهُ مَا خَلَا أَبَا بَكْرٍ فَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا يَدًا يُكَافِئُهُ اللَّهُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (9)

ترجمہ: ہم پر جس کسی نے کوئی احسان کیا ہے ہم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے سوائے ابو بکر کے کیوں کہ ان کے ہم پر وہ احسانات ہیں جن کا بدلہ انہیں قیامت کے دن اللہ تعالی ہی عطا فرمائے گا"

ظاہر ہے کہ ایسے عزیز غلام کو اس دنیا میں نوازنے کا اس سے بڑا اور بہتر صلہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ انہیں اپنے رشتۂ مصاہرت سے نوازا جاتا جس سے ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور ان کا اعزاز بھی ہوتا چنانچہ اسی حکمت کے پیش نظر حضور ﷺ نے اپنے سب سے عزیز صحابی سیدنا ابو بکر کی بیٹی سیدہ عائشہ سے عقد فرما کر صدیقہ بنت صدیق کو شرف زوجیت بخشا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہا کو نسبت مصاہرت سے نواز کر ان کی دل جوئی فرمائی۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے عزیز اور جانثار صحابی ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے تئیں ان کی عقیدت و محبت اور جذبۂ خود فدائیت کسی پر مخفی نہیں ہے۔ حسنات میں پیش رفت اور حضور ﷺ سے نسبت انہیں حد درجہ محبوب و مطلوب تھی۔ حضور اکرم ﷺ کو اپنے اس جانثار اور وفادار صحابی کی خدمات جلیلہ کا مکمل اعتراف تھا اور مختلف مواقع میں حضور ﷺ اس کا برملا اظہار بھی فرماتے تھے۔ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیاری بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے شوہر انتقال کر گئے تھے۔ بیٹی کے بیوہ ہونے کے بعد حضرت عمر غمگین رہنے لگے تھے اور انہیں اپنی بیوہ بیٹی کے مستقبل کی فکر لاحق رہتی تھی جو ایک فطری امر ہے۔ اس موقع پر حضرت عمر کی دل جوئی کے لیے حضور

اکرم ﷺ نے حضرت عمر کی بیوہ بیٹی سیدہ حفصہ کو شرف زوجیت سے سرفراز فرمایا اور اس طرح اپنے عزیز و جاں نثار صحابی کی پریشانیاں دور فرمادیں اور ساتھ ہی انہیں رشتۂ مصاہرت کے ذریعہ وہ اعزاز و شرف بھی عطا فرمایا دیا جو ان کے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز تھا۔

مذکورہ دونوں مثالوں سے اس امر کو بتانا کا مقصود تھا کہ حضور ﷺ کی متعدد ازواج کی کثیر حکمتوں میں سے ایک حکمت سماجی خدمت اور اپنے جانثاروں کی دلجوئی و دل بستگی بھی تھی۔اسی طرح سیدہ ام سلمہ اور سیدہ ام حبیبہ سے حضور کا نکاح فرمانا بھی آپ کے جذبہ ترحم اور صلہ رحمی کے سبب سے تھا۔چناچہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں وفات پائی جس کے بعد ام سلمہ تنہا اپنے چار چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں چنانچہ اپنے جاں نثار صحابی کی بیوہ اور یتیموں کے غم واندوہ کا مدوا کرنے کے لیے حضور ﷺ نے ان کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا اور اس طرح ان دونوں ماں بیٹی کو سکون و چین کی جنت میسر آئی۔یوں ہی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حبشہ ہجرت کر کے بیچارگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ہزار پریشانیوں کے باوجود اپنی بیٹی کے ساتھ اسلام پر قائم رہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے انہیں بھی اپنے عقد میں قبول فرماکر ام حبیبہ کو ان کے استقامت علی الدین کا بہترین صلہ عطا فرمایا اس کے علاوہ سیاسی حکمت بھی شامل تھی جس کی تفصیل ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے سوانحی مضمون میں موجود ہے۔سیاسی و سماجی حکمتیں دیگر کئی شادیوں میں بھی ملحوظ اور پیش نظر تھیں۔

سیاسی حکمت:

کفار مکہ اسلام مخالفت میں حد سے تجاوز کر چکے تھے، ان کی صبح و شام اسلام و پیغمبر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں گزرتی تھی انہوں نے ایک منظم پلانگ کے ذریعہ مختلف قبائل عرب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایسی ایسی زہر افشانی کی تھی کہ جس سے قبائل عرب کے دل اسلام کے تئیں زہر آلود ہو چکے تھے۔وہ مسلمانوں سے ملنا کجا اسلام کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ایسے میں ان سے قریب ہونا، دین کا پیغام ان تک پہنچانا بہت بعید تھا۔اس لیے سیاسی طور پر ضروری ہوا کہ پہلے ان کے دل میں موجود اسلام کے تئیں جو زہر بھرا ہوا ہے اسے کم کیا جائے، ان کے دل کو جیتا جائے، ان کو خود سے قریب کیا جائے تا کہ خدائی پیغام ان تک پہنچانے کی راہ آسان

ہو۔اس مقصد کے پیش نظر حضور اکرم ﷺ نے مختلف عربی قبائل کی خواتین کو اپنے عقد میں قبول فرمایا جس کے ذریعہ بے شمار سیاسی فوائد حاصل ہوئے اور جن جن قبائل میں اسلام مخالفت عروج پر تھی اس میں کمی واقع ہوئی اور اس طرح وہاں دین کی خدمت کا موقع میسر آیا اور تبلیغ حق کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور یہ سب کچھ ان قبائل کی خواتین سے حضور ﷺ کے عقد فرمانے کی برکت کے نتیجے میں ہو سکا۔حضور نے جن خواتین سے شادی کی اور انہیں حرم نبوی میں داخل ہونے کا اعزاز بخشا۔ان کے قبیلوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

سیدہ خدیجہ کبری کا تعلق: قبیلہ بنو غزی سے تھا

سودہ کا تعلق: قبیلہ بنو شمس کی شاخ سے تھا

سیدہ عائشہ کا تعلق قبیلہ: بنو تیم سے تھا

سیدہ حفصہ کا تعلق: قبیلہ بنو عدی سے تھا

سیدہ زینب بنت خزیمہ کا تعلق: قبیلہ بنو ہوازن سے تھا

سیدہ ام سلمہ کا تعلق: قبیلہ بنو مخزوم سے تھا

سیدہ زینب بنت جحش کا تعلق: قبیلہ بنو اسد تھا

سیدہ جویریہ کا تعلق: بنو مصطلق سے تھا

سیدہ ام حبیبہ کا تعلق: بنو امیہ سے تھا

سیدہ صفیہ کا تعلق: یہودی قبیلہ کے بنو نضیر سے تھا

سیدہ میمونہ کا تعلق: قبیلہ بنو ہوزان سے تھا

سیدہ ماریہ قبطیہ کا تعلق: مصر کے قبطیوں سے تھا

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے مختلف قبائل میں شادی کی اور اس کا سیاسی فائدہ حاصل ہوا کہ وہ قبائل جن تک حضور ﷺ کے رشتۂ مصاہرت کی نسبت کا فیض پہنچا وہاں اسلام کے تئیں نرمی محسوس کی گئی اور دعوت و تبلیغ کے کاموں میں آسانی آئی جس کے بعد وہاں اسلام کا بول بالا ہوا۔

ذیل میں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے معلوم ہو گا کہ حضور ﷺ کی شادیوں کے ذریعہ اسلام کو عروج نصیب ہوا اور بے شمار سیاسی فوائد حاصل ہوئے۔

(۱) بنو مصطلق کا قبیلہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ اس قبیلہ کا سردار حارث اسلام کا شدید مخالف تھا۔ غزوہ بنو مصطلق ۵ ہجری میں واقع ہوا۔ اس میں قبیلہ بنو مصطلق کے کفار کو شکست ہوئی۔ کچھ لوگ اسیر بنا کر لائے گئے۔ ان اسیروں میں قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی بھی تھی جن کا نام جویریہ بنت حارث تھا۔ انہوں نے قید سے رہائی کے لیے اپنی جان کا فدیہ دینے چاہا۔ اور حضور ﷺ کی خدمت میں فدیہ کی ادائگی کے لیے حضور ﷺ سے مدد چاہی۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے ان کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر انہیں منظور ہو تو آپ ﷺ ان کا فدیہ ادا کر کے ان کے ساتھ نکاح کر لیں۔ سیدہ جویریہ نے اس پیش کش کو بسر و چشم قبول کیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان کا فدیہ ادا کر کے ان سے نکاح فرمالیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے یہ کہہ کر تمام اسیروں کو رہا کر دیا کہ حضور ﷺ نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا ہے، لہذا یہ لوگ حضور ﷺ کے سسرالی رشتہ دار ہیں اور ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اب ہم انہیں اپنی قید میں رکھیں۔ اس طرح سارے قیدیوں کو آزادی مل گئی اور یہ آزاد ہونے والے چند افراد نہ تھے بلکہ اس آزادی کی برکت تقریباً سو گھرانوں کو حاصل ہوئی۔ بنو مصطلق نے جب حضور ﷺ کی یہ اعلی ظرفی اور صحابہ کی یہ عقیدت و محبت دیکھی تو وہ سارا قبیلہ داخل اسلام ہو گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”ہم نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جو اپنی قوم کے لیے اتنی بابرکت ثابت ہوئی ہو جتنی برکت کا باعث جویریہ اپنی قوم کے لیے ثابت ہوئی۔ (10)

سبحان اللہ! قارئین دیکھیں کہ اس ایک شادی سے کتنے عظیم فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ خود حضرت جویریہ اسلام کی دولت سے مالامال ہوئیں، پھر ان کا پورا قبیلہ بھی داخل اسلام ہو گیا اور پورا قبیلہ بنو مصطلق اسلام کی آغوش میں آ گیا اور وہاں اسلام کے سارے قوانین نافذ ہو گئے۔

(۲) اسی طرح حی بن اخطب بھی خیبر کا سردار تھا اور اسلام و پیغمبر اسلام کا جانی دشمن تھا۔ غزوہ خیبر میں اس کی بیٹی صفیہ بنت اخطب اسیر خیبر بنا کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ حضور ﷺ نے انہیں بلایا اور دو صورتیں ان کے سامنے پیش کیں۔

اول: وہ اسلام قبول کرلیں اور حضور ﷺ ان سے نکاح فرما کر دائمی شرف بخشیں۔ دوم: اگر وہ یہودیت پر قائم رہنا چاہیں تو حضور ﷺ انہیں آزاد کر دیں اور اپنی قوم میں واپس چلی جائیں۔ اس موقع پر انہوں نے حضور ﷺ کے اکرام و عنایات کو محسوس کرتے ہوئے اس بات کو پسند کیا کہ وہ اسلام لا کر حضور ﷺ کی زوجیت کا شرف حاصل کریں، چنانچہ انہوں اسلام قبول کر لیا اور حضور ﷺ نے انہیں اپنی زوجیت میں قبول فرمایا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کا کیا سیاسی فائدہ حاصل ہوا اس سلسلے میں "رحمۃ للعالمین" کے مصنف لکھتے ہیں: "حضرت صفیہ سے حضور کا نکاح اس لحاظ سے انتہائی مفید تھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے حضور کے نکاح سے پہلے یہودی مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں کسی نہ کسی شکل میں شریک نظر آتے ہیں لیکن اس نکاح کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ میں یہودی کسی جنگ میں مسلمانوں کے مدمقابل نظر نہیں آتے۔

الغرض حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی تمام شادیوں کے پیچھے تعلیمی، تشریعی، سماجی، سیاسی جیسے بے شمار مقاصد و مصالح مضمر تھے ان مقاصد حسنہ سے آنکھ بند کر کے حضور اکرم ﷺ کے تعدد ازدواج پر نشانہ سادھنا علمی خیانت اور بدنیتی بلکہ بدباطنی کی انتہا ہے۔

مصادر و مراجع

(1) احزاب۔ آیت ۵۰

(2) احزاب آیت ۵۱

(3) احزاب ۵۲

(4) ضیاء النبی ج ۷ ص ۴۷۵ تا ۴۷۸

(5) بائیبل

(6) ضیاء النبی ملخصا

(7) بخاری، ۳۱۴

(8) سورہ احزاب۔ آیت ۳۷

(9) ترمذی الحدیث ۳۶۶۱

(10) سنن ابی داؤد، ۳۹۳۱

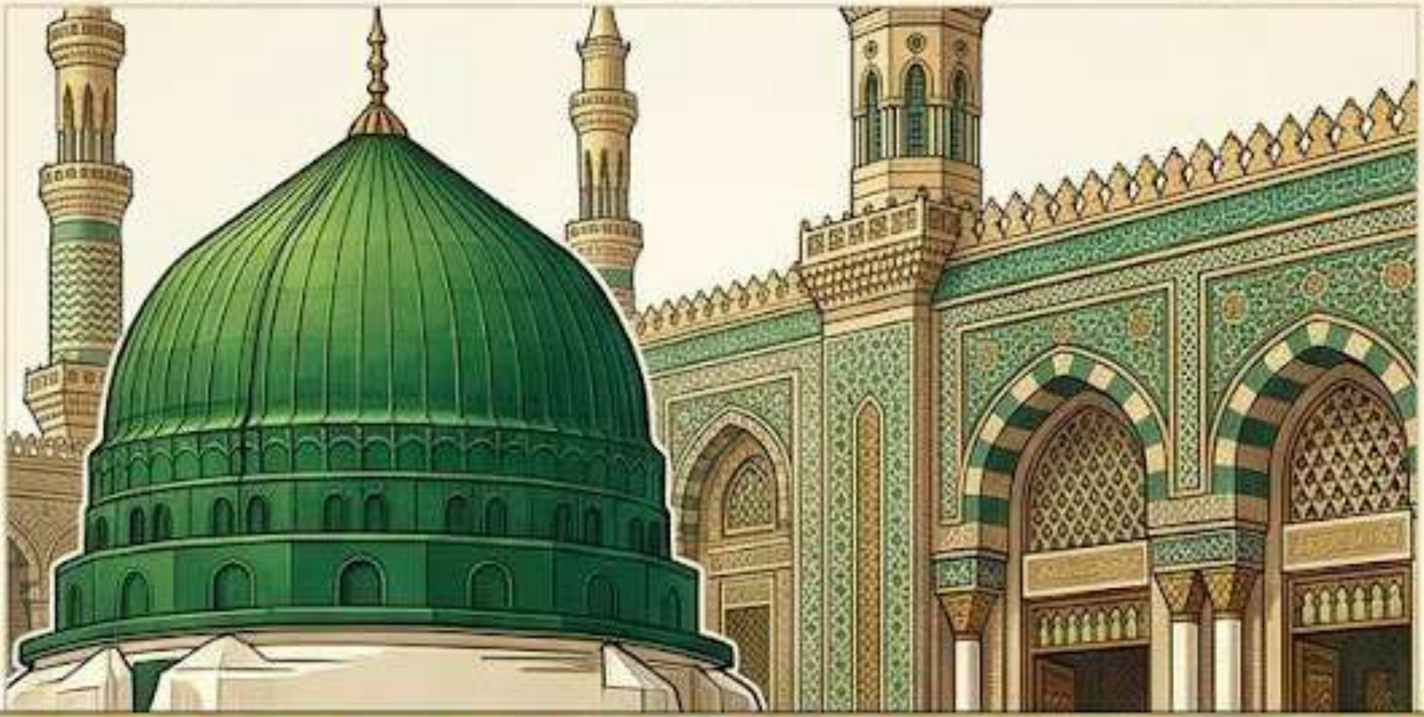

شرف نظر

یہ گلدستۂ سیرت نذر ہے:

ان **معزز اہل قلم** کے حضور، جن کے فکر انگیز مضامین اور بصیرت افروز نگارشات سے اس سیرت نمبر کی اشاعت ممکن ہوئی۔

ان مخلص اہل علم و دانش کے نام، جو اس مجلے کے **مستقل قلم کار** ہیں۔

ان باذوق **قارئین** کے نام، جو ہر ماہ اس رسالے کا باقاعدگی سے مطالعہ فرماتے ہیں اور اس کے علمی سفر کا حصہ ہیں۔

اور بالخصوص **آپ کے نام**، کہ آپ اس مبارک نمبر کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب لبیب ﷺ کی سیرت طیبہ کے انوار سے آپ سب کی زندگیوں کو منور فرمائے، خیر کثیر سے نوازے اور روز جزا آپ سب کو حضور اکرم ﷺ کی شفاعت عظمیٰ سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

اس مقام پر پہنچ کر سرکار دوعالم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں درود و سلام کا ہدیہ پیش کرلیں

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلِّمْ

سید شہباز اصدق غوثی